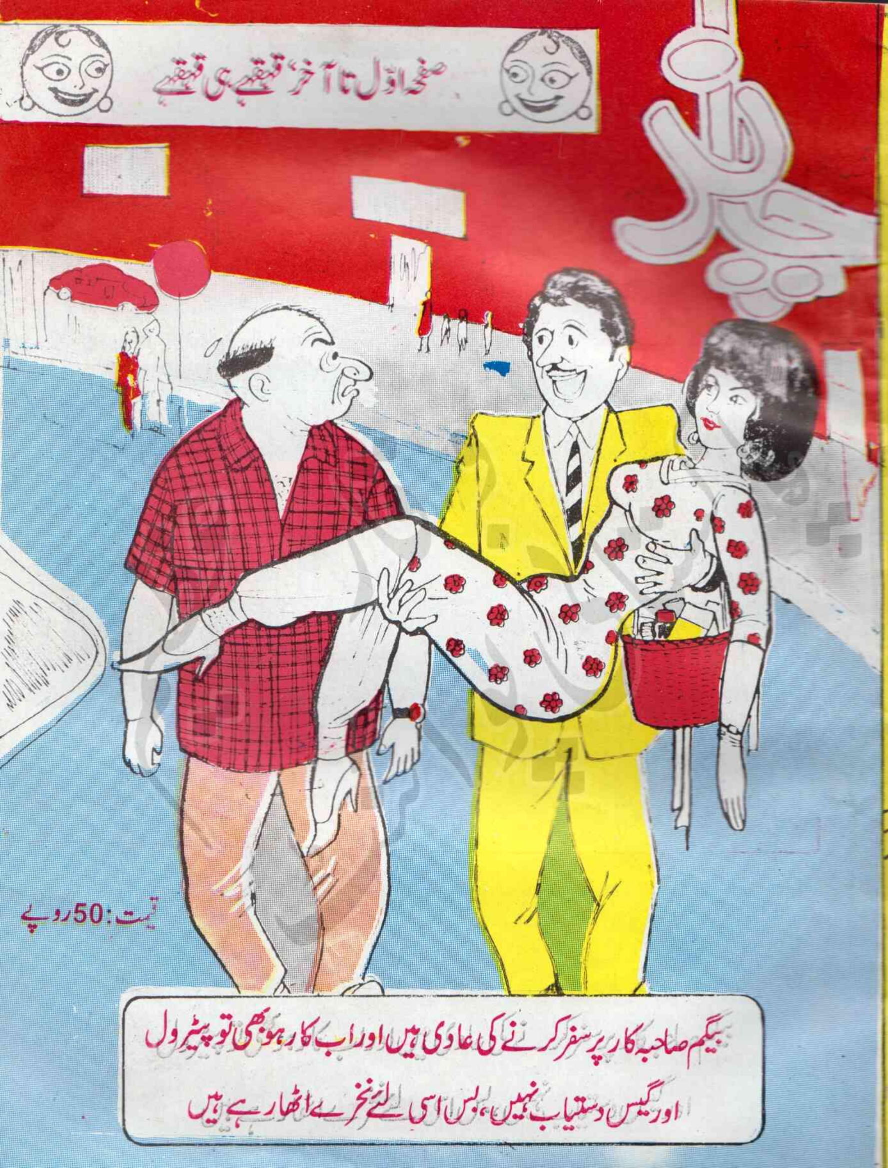
صفحہ اوّل تا آخر قہقہے ہی قہقہے
قیمت: 50 روپے
بیگم صاحبہ کار پر سفر کرنے کی عادی ہیں اور اب کار ہو بھی تو پیٹرول
اور گیس دستیاب نہیں، بس اسی لئے نخرے اٹھا رہے ہیں

CPL-192

بانی وحشی مارہروی

مہینہ بھر کے قہقہوں اور مسکراہٹوں کا راشن

تیس روزہ

چاند

لاہور

اپریل 2012ء

جلد نمبر:64 شمارہ نمبر:11

مہمانِ خصوصی

ناکتخدائے اعظم' صدر الہام کنوارا کلب'
انجمن ریش درازانِ پاکستان' دشمن عقل و
عریانی' تاریک العورات' رقیب زن مریدگان و
مجروح فیشن زدہ دوشیزگان
ابوالمزاح ہستی خوامخواہ

پیر جنگی علیہ ما علیہ (افریقہ پلٹ)

مدیرِ اعلیٰ خالد بن حامد

مدیران صباحت زیاد خالد

ناظم طباعت ○ رانا نذیر احمد ● کمپوزنگ ○ سیف اللہ

برائے رابطہ: 0312/0333-4284875

مستقبل کے پراپرٹی ڈیلر

یہ وہاں ہے

دیوارِ قہقہہ	ادارہ	5
ہنس بیتیاں	مستقل عنوان	10
پرانی کار	نعیم نیازی	12
خواجہ سراؤں کی رجسٹریشن	حافظ مظفر محسن	14
نگاہِ انتخاب	محمد سعید خان	16
کچھ ادھر کی، کچھ ادھر کی	شاہد اطہر	19
ماڈرن مرزا صاحبہ	محمد ارشد سعید	29
تلاشِ گمشدہ	شوکت علی مظفر	34
روزِ حماقت	محمد عباس طوروی	35
کرائے دار بمقابلہ مکان دار	ظفر ندیم دہرہ	47
شوخیاں لکھ سنگھ کی	ممتاز احمد تسنیم	57
ایک اچھی لڑکی	فائزہ شکور	61
قلم قبیلہ	خادم حسین مجاہد	67
ہم شکل	منظور احمد اعوان	73
فضولیات کا انسائیکلو پیڈیا	شیراز علی مسکراہٹ	79
ابراریات	سید ابرار بخاری	85
پہلا مدرسہ	ریاض الحسن	95
ٹکریں	ماہر ٹکریات	101

« چاند نگر »

مرغ ہزار نعمت ہے	ظفر ندیم دہرہ	103
چو---ہا	سید شعبان گیلانی	106
آپ کا خادم	محمد صابر مغل	107
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے	سید محمود گیلانی	109
رشتہ ہم نے ڈھونڈا	ناہید صدیقی	110
یہ عالم ہے شوق کا	ڈاکٹر فیاض احمد مغل	111
مشن امپوسبل	توصیف احمد	112

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تنویر پھول، رفیع یوسفی محرم، نعیم نیازی، آوارہ بلی تنگوی، مرزا عاصی اختر اور ریاض احمد قادری کے خوش رنگ کلام کے علاوہ دیگر چٹخارے آپ کے لئے......!

کاغذی گھوڑے دوڑانے کا پتہ

"چاند" شمع پلازہ، فیروز پور روڈ، لاہور

قیمت: 50 روپے

''چاند'' کی حاتم کی گور پر ''لات مار'' پیشکش

600000000

ساٹھ کروڑ کے نقد انعامات

کوئی دھوکہ نہیں --- حل نہ ہمارے پاس ہے' نہ بینک میں اور نہ کسی کمیٹی کے دماغ میں

پہلا انعام: **تیس کروڑ** اُس شخص کو دیا جائے گا جو پورے رسالہ ''چاند'' کو ایک سانس میں پڑھ دے

دوسرا انعام: **بیس کروڑ** اُس شخص کو دیا جائے گا جو کوئی ایسی بولی بولے گا جسے اِنسان نہ بول سکے

تیسرا انعام: **دس کروڑ** اُس شخص کو دیا جائے گا جو مر جائے اور بولتا رہے

آج کل کروڑوں کی بات کر کے ہی کسی کو متوجہ کیا جا سکتا ہے --- اب آپ بھی کروڑوں کے چکر میں متوجہ ہو ہی گئے ہیں تو جان لیجئے کہ یہ حاتم کی گور پر لات تو ہم نے اِس لئے ماری ہے کہ آپ کو چاند کا سالانہ خریدار بننے کی تاکید کی جا سکے۔ ''چاند'' پاکستان کا واحد تیس روزہ ہے جو گزشتہ 64 برس سے لوگوں کو ہنسنے اور مسکرانے کا موقع فراہم کر رہا ہے۔ اگر آپ بھی ہنسنا مسکرانا چاہتے ہیں تو پھر چاند کی خریداری حاصل کر لیجئے' سالانہ خریداری حاصل کرنے کی صورت میں پرچا آپ کو بذریعہ رجسٹری گھر بیٹھے ملتا رہے گا۔ ہم یہاں پاکستان اور دیگر ممالک کے لئے زرِ سالانہ درج کر رہے ہیں' اِس میں رجسٹری اور ہوائی ڈاک خرچ بھی شامل ہے۔

پاکستان	600 روپے
مسقط' عمان' ابوظہبی' افغانستان' بنگلہ دیش' یمن' بحرین' دوبئی' بھارت' ایران' عراق' کویت' لبنان' نیپال' قطر' دوحہ' سعودی عرب' سری لنکا' ترکی' اُردن' الجیریا' آسٹریا' بلجیم' چین' ڈنمارک' مصر' فن لینڈ' فرانس' جرمنی' انگلینڈ' یونان' ہانگ کانگ' ہنگری' انڈونیشیا' آئر لینڈ' اٹلی' جاپان' کینیا' کوریا' ملائیشیا' ناروے' فلپائن' رومانیہ' روس' سنگاپور' سپین' سوڈان' سویڈن' تائیوان' سوئٹزر لینڈ' تھائی لینڈ اور یوگنڈا	3000 روپے
آسٹریلیا' کینیڈا' فجی' نیوزی لینڈ' امریکہ' ارجنٹائن اور برازیل	3500 روپے

- ڈرافت **KHALID BIN HAMID** کے نام کسی ایسے بینک سے بنوائیں جس کی شاخ لاہور' پاکستان میں ہو۔
- آپ چاہیں تو پاکستان میں موجود اپنے کسی عزیز یا دوست کے ذریعے بھی زرِ سالانہ جمع کرا سکتے ہیں۔
- پتہ کی تبدیلی کی اطلاع ہر ماہ کی 15 تاریخ سے قبل ملنی چاہئے' اپنے خط پر خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔

ڈرافٹ یا منی آرڈر اس پتہ پر ارسال فرمائیے

ماہنامہ تیس روزہ ''چاند'' 31-F شمع پلازہ' فیروز پور روڈ' لاہور (پاکستان)

پبلشر: خالد بن حامد   پرنٹر: ملک عید محمد پرنٹرز' موہنی روڈ لاہور   مقامِ اشاعت: شمع پلازہ فیروز پور روڈ' لاہور

''سر جی! وزیر اطلاعات کو ہدایت دیں کہ وہ لوگوں کو سمجھائیں۔ یہ لفظ نیٹو نہیں، نوٹوں ہے۔ نوٹوں کی سپلائی رکی ہوئی ہے ہماری، نوٹوں کی---!''

''اتنی قیمت---ذرا پوچھو اس دکاندار سے کہ ان جوتوں میں انجن کون سا فٹ ہے؟''

''روکیے ڈیڈی کو، مما! روکیے---مجھے یقین ہے کہ چور بھاگنے کی بجائے میری کھلونا پستول بھی ان سے چھین کر بھاگ جائیں گے۔''

''بڑی منتیں کی تھیں بیرونی ممالک سے آرڈر دینے والوں کی، کہ 2012ء کی بجائے 2022ء تک آرڈر سپلائی کرنے کی اجازت دیدی جائے پر نہیں مانے---ہائے، مر گئے رے---!

''ماما کہہ رہی تھیں کہ گھر کے سودا سلف کے لئے پیسے ہی نہیں بچے، اب پورا مہینہ نانی امی کے گھر چلتے ہیں رہنے کے لئے---''

''یہ لڑکوں کا لمبے بال رکھنا فیشن نہیں ہے، بھائی! ان کے پاس ضروریات کے بعد بال کٹوانے جیسی فضولیات کے لئے پیسے ہی نہیں بچتے---''

''پہلی تاریخ آ گئی ہے --- حکم ہمارے، آقا! کتنی کھال اتاری جائے؟
--- ہماری مانیں تو اس مرتبہ گردن ہی نہ اڑا دیں، بہت احتجاج کرنے لگی ہے یہ عوام ---!''

''لگتا ہے پاکستان کے کسی آدم خور قبیلے کے ہتھے چڑھ گیا ہوں --- کم بختوں نے روشنی کے لئے موم بتی بھی میرے سر پر ہی لگا رکھی ہے ---''

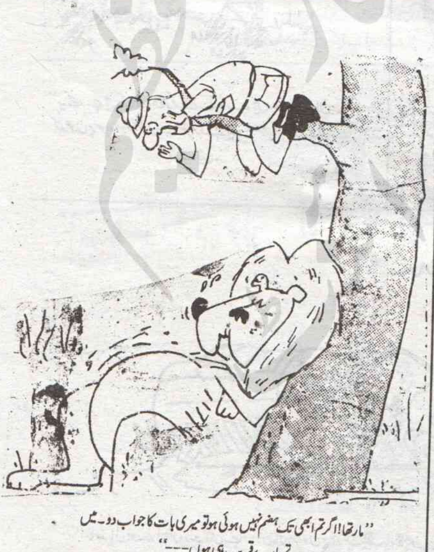

''مارتھا!! اگر تم ابھی تک ہضم نہیں ہوئی ہو تو میری بات کا جواب دو۔ میں تمہارے قریب ہی ہوں ---''

''یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہمارا شکار کر کے لے جا رہے ہیں، حالانکہ ہم ان کے کندھوں پر سوار ہو کر سکون سے سفر کر رہے ہیں۔۔۔ یہ مرد ہوتے ہی بے وقوف ہیں۔''

''میرا مقابلہ اگر ہوگا تو صرف اس سے ہوگا جو میری گرل فرینڈ کو بھگا کر لے گیا ہے۔ اب اسے ڈھونڈ کے لانا میری نہیں، آپ کی ذمہ داری ہے۔۔۔ سمجھے!''

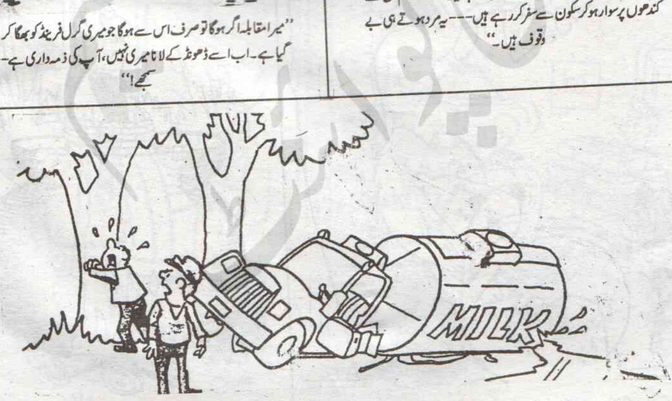

''اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ یہاں سڑکوں پر ٹارگٹ کلنگ یا ہنگاموں کی صورت اتنا خون روز بہہ جاتا ہے۔ یہ تو پھر ملاوٹی دودھ تھا۔''

"بھائی صاحب! میں عجائب گھر دیکھنے نہیں، یہاں اپنے لئے کوئی جگہ حاصل کرنے کی درخواست نے کر آیا ہوں---اس دور میں بارہ بچوں کی پرورش کا بوجھ ہے مجھ پر، لوگ عجوبہ سمجھ کر جوق در جوق دیکھنے آئیں گے اور آپ کی آمدنی بڑھ جائے گی۔"

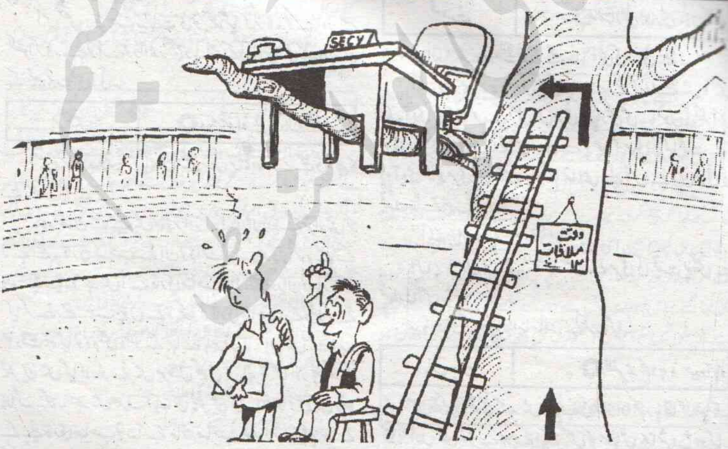

"اتنے وزیروں مشیروں کے بعد افسروں کے بیٹھنے کے لئے جگہ ہی نہیں بچی۔ یہ جگہ بھی لڑ جھگڑ کر بڑی مشکل سے صاحب نے حاصل کی ہے---"

ہنس بیتیاں

کبھی کوئی مکالمہ، کسی کی معصومیت یا بدحواسی پر بے ساختہ قہقہے وارد ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ کو کسی واقعہ پر بے تحاشہ ہنسی آئی ہو تو ایک کاغذ پر ہمیں لکھ بھیجئے۔ ہم اِن صفحات پر اسے آپ کے نام سے جگہ دیں گے اور چاہیں گے کہ آپ کے ساتھ اور لوگ بھی اِس واقعہ سے لُطف اُٹھا سکیں، ہنس سکیں۔ کسی لطیفے کو توڑ مروڑ کر واقعہ بنانے کی کوشش نہ کیجئے۔ واقعہ کاپی سائز کے دو صفحات سے زیادہ نہ ہو، اخلاق سوز نہ ہو۔ سب سے زیادہ قہقہہ آور واقعہ پر سال بھر کے لئے چاند مفت بطور انعام دیا جائے گا۔ واقعہ اِس پتہ پر ارسال فرمائیے۔

انچارج "ہنس بیتیاں" تیس روزہ "چاند" F-32، شمع پلازہ، فیروز پور روڈ، لاہور 54600

ایسے کو تیسا

✿ فضل کریم شگفتہ

یہ واقعہ میرے ایک دوست نے سنایا ہے۔

ایک مرتبہ ایک ضروری کام کی وجہ سے مَیں ایک شادی میں نہ جا سکا اور اپنے بارہ تیرہ سال کے بیٹے نذیر کو بھیج دیا۔ مَیں نے اُسے پچاس روپے کا نوٹ دے کر سمجھایا کہ پہلے "کاپی والے" سے یہ پیسے لکھوانا اور پھر اندر کھانا کھانے جانا۔ جب وہ کاپی والے سے پیسے لکھوا کر اندر جانے لگا تو گیٹ پر کھڑے ہوئے ایک صاحب نے اُسے یہ کہہ کر روک لیا کہ ابھی بڑے آدمی کھائیں گے، بچے لوگ بعد میں کھائیں گے۔ اُس کی یہ بات سن کر نذیر نے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے مَیں نہیں جاتا، آپ کاپی والے کو کہہ کر میرے پچاس روپے واپس دلوا دیں۔"

اُس شخص نے جب یہ بات سنی تو سمجھ گیا کہ لڑکا مدعو ہے اور پیسے لکھوا کر آ رہا ہے تو اُسے فوراً اندر بھیج دیا۔ لڑکے کی ہوشیاری کا یہ واقعہ سن کے مجھے بہت ہنسی آئی۔

مرچیں

✿ وسیم شہزاد، فیروز والہ (شیخوپورہ)

مَیں جو واقعہ پیش کر رہا ہوں، تین سال پرانا ہمارے محلے کی مسجد کا ہے۔

ماہِ رمضان کے مہینے میں نمازِ تراویح کے دوران دو بچے شرارتیں کر رہے تھے۔ قاری صاحب نے اِن کو ڈانٹ دیا۔ چند دِن گزرنے کے بعد بچے دوبارہ مسجد میں آئے قاری صاحب نماز کے دوران دوبارہ وضو کیا کرتے تھے۔ جب بچوں نے دیکھا کہ قاری صاحب کے وضو کرنے کا وقت ہو گیا تو وہ بھی وضو کے بہانے باہر آئے۔ اِن میں سے ایک لیٹرین میں گیا اور لوٹے میں مرچیں گھول کر باہر آ گیا اور پھر گھر کو بھاگ گئے۔ مسجد میں صرف ایک ہی لیٹرین تھی۔ اِتفاقاً اُس دِن وضو کے لیے قاری صاحب تو نہ آئے، حافظ صاحب جو نمازِ تراویح پڑھاتے ہیں اُن کا بیٹا وضو کے لیے آ گیا جس کی عمر اُس وقت تیرہ چودہ سال تھی۔ وضو کرنے کے بعد دوبارہ نماز پڑھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اُس کو جلن محسوس ہوئی تو اُس سے جلن برداشت نہ ہوئی اور وہ نماز میں ہی چیخنے لگا اور نماز چھوڑ کر باہر آ گیا۔ نماز سے فارغ ہو کر جب سب باہر آئے تو حافظ جو بہت سخت طبیعت کے آدمی تھے، آتے ہی اپنے بیٹے کو لاتوں، مکوں سے مارنا شروع کر دیا۔ نمازیوں نے بچے کو چھڑوایا۔ ایک نمازی نے بڑے پیار سے بچے سے پوچھا۔

"تم نماز میں چیخیں کیوں مار رہے تھے؟"

بچہ بولا۔ "اے نوں کی پتا، مینوں مرچاں لگدیاں پیاں نیں، ایویں ماری جان دِیا اے۔"

اُن شرارتی بچوں کا جو بعد میں ہوا سو ہوا لیکن اِس موقع پر سب لوگوں کا ہنسی کے مارے بُرا حال ہو گیا۔

قسمت

✿ ممتاز علی بخاری، آزاد کشمیر

یہ واقعہ میرے دوست نے مجھے سنایا، اُسی کی زبانی سنئے۔

ایک دفعہ میرے ماموں کہیں جا رہے تھے کہ راستے میں اُنہیں ایک آدمی نظر آیا جس نے بغل میں مرغی چھپا رکھی تھی۔ ماموں کی نظر اُس مرغی پر پڑی۔ اُنہوں نے اِس آدمی سے پوچھا کہ مرغی کی کیا قیمت ہے؟ وہ آدمی شاید مرغی دینا نہیں چاہ رہا تھا اِس لیے اُس نے اِس مرغی کی قیمت بتاتے ہوئے کہا۔

"ایک ہزار روپے۔۔۔!"

اِس پر ماموں بولے۔ "بھئی، مَیں نے مرغی کی قیمت پوچھی ہے، تمہاری نہیں۔"

یہ بات سن کر وہ بیچارا اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

وبالِ جان

✿ ظفر ندیم وہرہ، حیدر آباد

مَیں اکبری بکونی مسجد میں مغرب کی نماز ادا کر رہا تھا کہ اچانک عقبی صفوں میں کھڑے ہوئے ایک شخص کا موبائل بجنا شروع ہو گیا۔ اِس وقت چونکہ نماز باجماعت ادا ہو رہی تھی اِس لیے موبائل کی گھنٹی وقفے

پاپڑ کرارے

پرانی کار

نعیم نیازی

خبر ہے کہ ''72 سال پرانی کار 30 لاکھ پونڈ میں نیلام'' --- یہ خبر فرانس کے دارالحکومت پیرس کی ہے۔ خبر کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ 1937ء ماڈل کلاسک بگاٹی کار جسے نصف صدی تک ایک گیراج میں دھول چاٹتی رہی، نیلامی میں تیس لاکھ پونڈ میں فروخت ہوگئی ہے۔ نیلامی والے ادارے نے اس کار کو موٹرنگ کی دُنیا کی ایسی انوکھی کار کے طور پر پیش کیا تھا جس کا انجن گزشتہ پچاس سال سے سٹارٹ نہیں ہوا۔

ہمیں یقین ہے کہ لش پش کرتی، چمچماتی نئی کاروالوں کے سر یہ خبر پڑھ کر مارے شرم کے جھک گئے ہوں گے۔ تیس لاکھ پاؤنڈ معمولی رقم نہیں ہے۔ نئے ڈیزائن اور جدید ترین سہولیات کی حامل کی کسی بھی کار کی قیمت اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ اگر پرانی کاروں کی بولیاں اسی طرح لگنا شروع ہوگئیں تو اِن نودولتیوں کا کیا بنے گا جو آئے روز نئے سے نئے ماڈل کی گاڑی کی نمائش کا کریز رکھتے ہیں۔ یہ اشرافیہ والے تو مشکل میں پھنس جائیں گے۔ اگر کھٹارہ کار ہی سٹیٹس کا معیار بن گئی تو انہیں بھی اپنا رُخ وقت کے بادنما سے ہم آہنگ کرنا پڑے گا اور اپنی ناک اُونچی رکھنے کے لیے زنگ آلود گاڑیاں اپنے گیراجوں میں سجانا پڑیں گی اور اِن کے ساتھ پہلوانی جسامت والے نصف درجن نوکر بھی رکھنے پڑیں گے۔ جو ہر بار دھکا لگا کر انہیں سٹارٹ کرائیں گے۔ مزید برآں انہیں چالو رکھنے اور منزلِ مقصود تک پہنچانے کے لیے ایک عدد مستری معہ اوزار بھی فرنٹ سیٹ پر بٹھانا پڑے گا کہ کیا معلوم، کب کار کی نبض ڈوبنے لگے اور اسے ڈرپ لگانی پڑ جائے۔ ایسی کاروں کو چلانے کے لیے ڈرائیور بھی ضرورت سے زیادہ تگڑے ڈھونڈنا پڑیں گے جو زنگ آلود اور کہنہ سال کل پرزوں کے ساتھ کما حقہ پنجہ آزمائی کر سکیں۔

فلاسفر کا خیال ہے کہ اگر پرانی کاروں کی پذیرائی کا یہی عالم رہا تو پھر کباڑیے حضرات کی تو موجاں ای موجاں ہیں۔ ایسی کوئی نہ کوئی کھٹارہ گاڑی یقیناً ہر کباڑیے کے گودام میں گل سڑ رہی ہوگی۔ اِن ازکاررفتہ گاڑیوں کے زنگ آلود پرزے بھی ایک ایک کباڑ خانے میں موجود ہوں گے جو انہوں نے کوڑیوں کے بھاؤ خرید رکھے ہوں گے بلکہ کئی پیچ قابلے تو بے مول ہی آ گئے ہوں گے خریدے ہوئے بڑے پرزوں کے ساتھ --- اَب جبکہ یہ کاٹھ کباڑ انمول بن رہا ہے تو یہ بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھو سکتے ہیں۔ دو دو چار چار روپے والے پرزے سینکڑوں ہزاروں روپے میں بکیں گے، حاجتمند منہ مانگے دام نذر کریں گے اور حرفِ شکایت زباں پر نہیں لائیں گے۔

ہم نے ایسے کئی کباڑیے دیکھے ہیں جو ابتداً میں انتہائی غریب تھے پھر دیکھتے ہی دیکھتے امیر کبیر بن گئے۔ ممکن ہے اِن میں ایک آدھ قسمت کا دھنی ایسا بھی ہو جسے کچرے کے ڈھیر میں اللہ دین کا چراغ پڑا مل گیا ہو اور جس کے اطاعت گزار جن نے تعمیلِ حکم میں بینک کے سٹرانگ روم کا سارا کیش نذرِ آقا کر دیا ہو لیکن ہر ایرے غیرے (کباڑیے) کو دولتمند بنانے کا سہرا مذکورہ جن کے سر نہیں باندھا جا سکتا کیونکہ وہ جادوئی چراغ بھی صرف ایک عدد تھا اور اس کا جن بھی اکیلا تھا۔ پس ثابت ہوا کہ اِن پر جو مایہ نازل ہوئی ہے وہ ''اولڈ از گولڈ'' کی برکت سے پائی ہے --- ضروری نہیں کہ ہر کھٹیچر کار زرِ خطیر میں نیلامی کی سعادت پائے، تاہم قسمت آزمائی کرنے میں کیا حرج ہے؟

پرانی کاروں کا تذکرہ اُردو شاعری میں بھی ملتا ہے، بالخصوص مزاحیہ شاعروں نے خوب جی کھول کر ان پر طبع آزمائی کی ہے۔ مقامِ حیرت ہے کہ اِن مزاح نگاروں نے اہلِ اقتدار کی بجائے پرانی کار کی ''مدح سرائی'' کیوں کی ہے؟ انہوں نے کاروں کے ایسے ایسے خواص قلمبند کیے ہیں کہ جن کا علم اِن کے مالکان کو ہوگا، نہ اِن مستریوں کو جن کے دستِ ہنرمند کے طفیل وہ سڑکوں پر فراٹے بھرتی پھرتی تھیں۔ مثلاً اسد جعفری کی ایک نظم کا عنوان ہے ''مغل کی کار'' اس کے چند شعر ملاحظہ فرمائیں۔

الگ دُنیا کی کاروں سے مغل کی کار ہے، پیارے!
سنا ہے، پچھلے دس سالوں سے یہ بیمار ہے، پیارے!
کئی فرلانگ تک دھکا لگاتے ہیں تو چلتی ہے
پسینہ چار چھ ساتھی بہاتے ہیں تو چلتی ہے
سحر سے شام تک ہینڈل گھماتے ہیں تو چلتی ہے
سر اُس کے سامنے اپنا جھکاتے ہیں تو چلتی ہے
یہ چلتی ہے تو شوفر کو بھلا کب ہوش رہتا ہے
ہر اِک راہ گیر تاحدِ نظر روپوش رہتا ہے
جہاں بھی اس کا جو پرزہ ہے، وہ پرجوش رہتا ہے
مگر اِک ہارن ہے کم بخت جو خاموش رہتا ہے
کوئی اَب اس کی فطرت کا لگائے خاک اندازہ
گیئر اس کا لگاتے ہیں تو کھل جاتا ہے دروازہ
کریں ریورس تو افسوس یہ آگے کو چلتی ہے
دباتے ہیں کلچ اس کا تو بتی اس کی جلتی ہے
اگر ملتان جانا ہو تو بھکر جا نکلتی ہے
جو پہیوں کے تلے اینٹیں رکھیں تو سنبھلتی ہے

سیّد ضمیر جعفری کی طویل نظم کا عنوان ہے ''پرانی موٹر'' --- اس کے چیدہ چیدہ اشعار نذرِ قارئین ہیں۔

عجب اِک بار سا مردار پہیوں نے اُٹھایا ہے
اسے انسان کی بدبختی نے جانے کب بنایا ہے
نہ ماڈل ہے، نہ باڈل ہے، نہ پایہ ہے، نہ سایہ ہے
پرندہ ہے جسے کوئی شکاری مار لایا ہے

تو تنہائی تخیل اس کی تو بینائی بخیل اس کی
کہ اس کو مدتوں سے کھا چکی عمرِ طویل اس کی
گراریاں چاک انجن یوں پڑا ہے اپنے چھپّر میں
کہ جیسے کوئی کالا مرغ ہو گھی کے کنستر میں
ولایت سے کسی سرجارج امین بی کے ساتھ آئی
جوانی لٹ گئی تو سندھ میں یہ خوش صفات آئی
یہ چلتی ہے تو دو طرفہ ندامت ساتھ چلتی ہے
بھرے بازار میں پوری ملامت ساتھ چلتی ہے
بہت کم اس ''خرابے'' کو خراب انجن چلاتا ہے
عموماً زورِ دستِ دوستاں ہی کام آتا ہے
کبھی بیلوں کے پیچھے جوت کر چلوائی جاتی ہے
کبھی خالی خدا کے نام پر کھنچوائی جاتی ہے
پکڑ کے بیچی جاتی ہے، جکڑ کر لائی جاتی ہے
وہ کہتے ہیں کہ اس میں پھر بھی موٹر پائی جاتی ہے
قدم رکھنے سے پہلے لغزشِ مستانہ رکھتی ہے
کہ ہر فرلانگ پر اپنا مسافر خانہ رکھتی ہے
روانی اس کی اِک طوفانِ وجد و حال ہے گویا
کہ جو پرزہ ہے، اِک بپھرا ہوا قوال ہے گویا
پرانے ماڈلوں میں کوئی اُونچی ذات رکھتی ہے
ابھی پچھلی صدی کے بعض پرزہ جات رکھتی ہے
غمِ دوراں سے اَب تو یہ نوبت آ گئی اکثر
کسی مرغی سے ٹکرائی تو خود چکرا گئی اکثر

ظریف جبلپوری کی ایک نظم کا عنوان ہے۔ ''مکینک شاعر'' یہ بھی دراصل پرانی کار کی مدح سرائی ہے، نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

بیٹھے بیٹھے دل میں اِک شاعر کے یہ آیا خیال
شاعری سے بڑھ کر بھی دُنیا کو دِکھلائے کمال
روشنی میں شمس کی ڈھونڈا تو سانچہ مل گیا
اتفاقاً اس کو اِک موٹر کا ڈھانچہ مل گیا
ٹیوب ٹائر برسٹ اور انجن کی حالت تھی خراب
بجتے تھے مڈگارڈ جیسے بجتے ہیں چنگ و رُباب
لاکھ کہئے کار لیکن کار ہو سکتی نہ تھی
سیلف سے اِس کی خودی بیدار ہو سکتی نہ تھی
راستے سے اِس کو لوگوں کو ہٹانے سے تھا کام
یوں سوائے ہارن کے بجتے تھے کل پرزے تمام
بیٹھنے والوں کا اکثر راہ میں ہوتا تھا کھیل
ایک کہتا تھا کہ ہاں، میں بیٹھتا ہوں تو دھکیل

یہ مشقِ سخن بظاہر تو ہجو گوئی لگتی ہے لیکن ''بدنام جو ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا'' کے مصداق یہ بھی غنیمت ہے۔ آخر کوئی نہ کوئی خوبی تو ایسی ہے کہ جس نے پرانی کھٹارہ کار کو استادانِ شعروسخن کی آنکھ کا تارا بنا دیا ہے--- ویسے بھی اَب جبکہ بین الاقوامی سطح پر ایک پون صدی پرانی کار کی قیمت کا تعین 30 لاکھ پونڈ ہو چکا ہے تو ابہام کی کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔ قیمت والا معاملہ تو طے ہو گیا، اللہ اللہ خیر صلا!--- خیر، شاعروں کی بات چھوڑیئے، یہ لوگ تو رائی کا پہاڑ بنانے کے عادی ہوتے ہیں۔ ہم اس معاملے کا تجزیہ مذکورہ بالا خبر کے تناظر میں کرتے ہیں۔ پرانی کار خاصے کی چیز ہے۔ اس کے فائدے سب پر آشکار ہیں۔ اس کا یہ فائدہ کیا کم ہے کہ دوست احباب گاڑی مانگنے نہیں آتے، اِس ڈر سے کہ کہیں پھٹیچر کار میں بیٹھنے سے اِن کے سٹیٹس کو بٹہ نہ لگ جائے۔ دوسرے یہ از کار رفتہ کار روزانہ آمدنی کا ذریعہ بھی بن سکتی ہے اور اگر آپ چاہیں تو اس کے ذریعے تیل پانی کا سارا خرچ باہر سے نکال سکتے ہیں۔ مثلاً آپ اپنی پھٹیچر کار میں سڑک پر کہیں جا رہے ہیں۔ گاڑی مخدوش حالت کے پیشِ نظر دیکھنے والے لامحالہ اِسے ٹیکسی سمجھیں گے اور رُکنے کا اشارہ کریں گے اور کسی شاپنگ پلازہ، بیوٹی پارلر یا فاسٹ فوڈز سنٹر جانے کا کہیں گے۔ آپ اپنی شناخت ظاہر کیے بغیر چل پڑیں، کرائے کے ساتھ معقول ٹپ بھی مل جائے گی۔ ہر روز ایسی دو چار ''پھیرے'' لگائیں اور پٹرولیم مصنوعات کی مہنگائی سے بے نیاز ہو جائیں--- فلاسفر کا نکتہ نظر ذرا مختلف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پرانی کار تو درکنار، اگر کسی قدیم کار کی کیمرہ فوٹو بھی مل جائے تو سٹیٹس کو چار چاند لگائے جا سکتے ہیں۔ اس تصویر کے ساتھ اپنے کسی مرحوم و مغفور بابے شابے کی تصویر کی ''ری میکنگ'' کرالیں اور اس کے نیچے دادا، پردادا یا لکڑ دادا مرحوم کا کیپشن لگا کر ڈرائنگ روم میں لٹکا دیں۔ لیجئے صاحب، خاندانی امارت و شان و شوکت کا منہ بولتا ثبوت آپ کی دسترس میں ہے۔ آنے جانے والے جس جس آدم زاد کی نظر اِس تصویر پر پڑے گی، بے ساختہ آپ کی خاندانی جاہ و حشمت کے رُعب میں آ جائے گا اور دل ہی دل میں تسلیم کرلے گا کہ یہ تو جدی پشتی امیر کبیر خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ رئیس ابن رئیس ابن رئیس ہیں، دولت کئی پشتوں سے اِن کے گھر کی لونڈی ہے۔

شاید اسی خبر کا اثر ہے کہ کئی مڈل کلاسیئے اِن دنوں قدیم ماڈل کی گاڑیوں کی تلاش میں جوتے گھساتے پھرتے ہیں۔ فلاسفر بھلا کب کسی سے پیچھے رہنے والا کب ہے۔ وہ بھی کوئی ایسی پھٹیچر کار ڈھونڈتے پھرتے ہیں جو سٹارٹ ہوتے وقت ''اَڑی'' کر جاتی ہو اسے ایک ایسی پرانی کار کی سن گن مل چکی ہے جو قصبے کے چوہدری صاحب کی حویلی میں اینٹوں کے سہارے کھڑے ہے لیکن مالک گاڑی سے معاملات طے نہیں پا رہے موصوف (یعنی مالکِ کار) چونکہ ایک روایتی وڈیرہ ہے لہٰذا اپنی اس پھٹیچر کار کو اپنے شاندار ماضی کا قیمتی ورثہ سمجھتا ہے اور کسی طور اِسے بیچنے پر آمادہ نہیں ہو رہا۔ فلاسفر اُسے رام کرنے کے لیے کسی تگڑی سفارش کی تلاش میں ہے۔ اگر بات بن گئی اور فلاسفر بین الاقوامی سطح پر اِس ''ستری بہتری'' (72/70 سالہ پرانی) کار کا نیلامِ عام منعقد کرانے میں کامیاب ہو گیا تو اس کے پوبارہ ہو جائیں گے، نہ صرف اس کے اپنے دِن پھر جائیں گے بلکہ قومی خزانے میں بھی ڈھیروں ڈالر یکمشت آ جائیں گے جس کا چنیدہ آئی ایم ایف سے بوند بوند ملنے والے قرضہ کے باوجود ہمیشہ خالی خالی نظر آتا ہے۔ منافع بخش ''ٹریڈ'' کا یہ گولڈن چانس میسر آ رہا ہو تو ہمارے حکمران ''ایڈ'' کے لیے ہاتھ پھیلانے کی سبکی سے تو بچ جائیں گے کم از کم---!

☆☆

کچھ شعبے ہمیشہ سے سرکار اور اس کی وفادار عوام کی نظروں سے ہمیشہ اوجھل رہتے ہیں۔ پٹرول عوام کو نظر آتا ہے' عوام نے شور مچایا۔ پٹرول پمپ مالکان نے ادھر ادھر دیکھا' اپنے لمبے منافع میں تھوڑی بہت کمی دیکھی اور چپکے سے مان گئے۔ عوام کو تھوڑی بہت سہولت ہوئی' بوجھ کم ہوا مگر موبل آئل وغیرہ کی قیمتیں نہ کم ہوئیں اور اگر غور کریں تو پہلے سے بھی زیادہ ہو گئیں نہ عوام نے دیکھا' نہ حکومت نے غور کیا اور موٹر سائیکل گاڑیوں وغیرہ میں ڈالنے والے موبل آئل' بریک آئل وغیرہ کی قیمتیں کہیں سے کہیں پہنچ گئیں۔

ہم نے مکھی کو ہمیشہ پیار سے دیکھا ہے کیونکہ مکھی کو عام لوگ نفرت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ہمارے اندر نرم دل ہے اور دماغ شاید ہے یا نہیں۔ یا ہے تو شاید اخروٹ جتنا ہے یا اس سے کچھ کم یا زیادہ ہو جو کبھی کام کرتا ہے' کبھی نہیں۔ اس لئے عام طور پر ہمیں نفرت سے نفرت ہے۔ مکھی ہو یا مچھر' ہم نے ان مخلوقات کو کبھی حقارت کی نگاہ سے نہیں کیونکہ ہمارے اپنے بارے میں یہی خیال ہے کہ اس بہت بڑی دنیا میں شاید ہماری حیثیت بھی اک مکھی یا مچھر سے زیادہ نہیں۔ نہ مکھی' مچھر سے کوئی مشورہ کرتا ہے اور نہ ہم کو اس قابل سمجھا جاتا ہے۔ آپ کہیں گے کہ مچھ یا مکھی سے بھلا بجٹ تقریر سے پہلے کیا مشورہ ہو سکتا ہے حالانکہ بجٹ تقریر کے بعد وزیر محترم پریس کانفرنس میں چپ بیٹھی تھیں اور محترم شوکت ترین صاحب ہر بات کی وضاحت بھی کر رہے تھے' تفصیل بھی بتا رہے تھے--- ویسے ہمیشہ سے سنتے آئے ہیں کہ یورپ' امریکہ میں شاید انسان کی قدر ہمارے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ دوسرے جانداروں کا ہر طرح سے ہر وقت خیال بھی رکھا جاتا ہے اور انہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچنے دی جاتی۔ جبھی تو پہلے پہلے اکثر پاکستانی جب یورپ امریکہ جاتے تو وہ بخوشی کتے نہلانے کی ڈیوٹی ادا کرتے کہ شاید اسی بہانے کتے کے مالک کی ان پر نظر پڑ جائے اور ان کی ترقی کے دروازے کھل جائیں' گویا کتا ترقی کا زینہ بن جاتا تھا۔

انسان کے علاوہ دوسری مخلوقات سے محبت کا تو ہم نے سن رکھا تھا لیکن ابھی ابھی خبر آئی ہے کہ صدر اوباما نے ایک انٹرویو کے دوران ایک مکھی کو آتا دیکھا اور ہنستے ہنستے اسے ویلکم کیا۔ مکھی بے چاری سمجھی کہ صدر ہمیں خوش آمدید کہہ رہے ہیں اور پیار سے اپنے پاس بلا رہے ہیں۔ وہ بے چاری پاس آئی تو تو تکار شروع ہو گئی۔ اب مکھی نے موقع کی نزاکت کو سمجھا اور رفو چکر ہونا چاہا مگر صدر محترم نے انٹرویو والی خاتون سے معذرت کی یا کہہ لیں کہ ''ٹائم آؤٹ'' لیا اور مکھی کو ہنستے ہنستے ڈانٹ دیا۔ مکھی شکریہ ادا کرنے کے لئے آگے بڑھی اور ''ٹھاہ''--- مکھی کو کیا معلوم کہ صدر اوباما کا پہلا فائر ہی ٹھیک نشانے پر بیٹھے گا اور صدر امریکہ کو اب کوئی بھی نہ کہہ پائے گا کہ موصوف نے اپنے دورِ حکومت میں مکھی تک نہیں ماری۔ کیمرہ مین جو اس منظر کی نہایت دل جمعی سے ریکارڈنگ کر رہا تھا' اس نے یہ سارا منظر فلمایا اور صدر کو ''بک اپ'' بھی کیا یعنی اور مارو' اور مارو حضور!--- چہروں پر مسکراہٹ تھی کہ صدر امریکہ ہر کام کر سکتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ نادان مکھی کو بھی پچھاڑ سکتا ہے۔ اس کی کیا اوقات ہے' یہ بتا سکتا ہے۔ کیمرہ مین اور دیگر عملہ نے تحسین کی نگاہ سے صدر اوباما کو دیکھا۔ اگر صدر اوباما کو پنجابی زبان آتی ہوتی (حالانکہ وہ کئی سال پہلے ہمارے لاہور میں رہ چکے ہیں اپنی امی کے ساتھ اور ایک مہینہ تک ویگن کے ذریعے لاہور سے گوجرانوالہ جاتے رہے ہیں) تو وہ کہتے۔

''اوئے جیہڑا ساڈے نال متھا لائے گا' اوہنوں انج سبق سکھاواں گے جیویں اسی ۱۶ جون والے دن اک نادان مکھی نوں سکھایا سی---''

اس کے بعد کیمرہ مین نے مردہ مکھی کی فلم بنائی۔ پورے انہماک کے ساتھ' یہ ہوئی نہ پیشہ وارانہ مصروفیات--- یہ بلاشبہ جذباتی منظر تھا۔ اک طرف تڑپتی' جان دیتی معصوم مکھی تھی اور اک طرف صدر امریکہ کا مسکراتا چہرہ اور خوش آمدی فوٹو گرافر اور انٹرویو کرنے والی خاتون کے تروتازہ فقرے۔ یہ بے چاری مکھی ہی جانتی ہو گی کہ یہ ظالم سماج کیسے طاقتور کے ساتھ مل جاتا ہے---کل ہم نے مکھیوں کو غور سے دیکھا۔ آم کی پوری طرح استعمال شدہ گٹھلی پر تین چار سو مکھیاں بیٹھی تھیں مگر ''غوں غوں غوں'' نہیں کر رہی تھیں' چپ بیٹھی آم سے رزق تلاش کرتی چلی جا رہی تھیں۔ شاید اداس تھیں یا اپنی مرحومہ مکھی بہن کا سوگ منا رہی تھیں اور جگ ہنسائی پر شرمندہ تھیں۔

مکھیاں مجھے ہمیشہ سے معصوم' کنجوس اور نہایت مکھی چوس لگتی ہیں لیکن یہ جو مکھی ''سیکورٹی رسک'' بن کر صدر بارک اوباما تک پہنچ گئی اس کا بہرحال ڈی این اے ٹیسٹ لازمی ہونا چاہئے

صبح سویرے سچ

خواجہ سراؤں کی رجسٹریشن' مکھیوں پر مظالم اور عوامی فیصلے

حافظ مظفر محسن
0300-9449527

کہ طالبان نے شاید پہلے مکھی کو صدر اوباما تک بھیج کر چیک کیا ہو کہ صدر امریکہ کی سیکورٹی کیسی ہے؟--- دوسری اہم ترین بات ملک منظور حسین آف راج گڑھ نے بتائی کہ بہتر ہے اس مکھی کو پورے اعزاز کے ساتھ شیشے کے بکس میں بند کر کے واشنگٹن ڈی سی کے کسی چوراہے میں نیلامی کے لئے رکھا جائے اور یقین سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس مکھی کی نیلامی میں بہت سے امیر کبیر امریکی شریک ہوں گے اور بہت بھاری قسم کی بولی لگائی جائے گی۔ اس ''مجبور و بے کس'' مرحومہ مکھی کی یقیناً دو چار کروڑ ڈالر میں یہ مکھی نیلام ہو گی اور وہ دولت جو اس مکھی کی نیلامی سے ملے گی اس کو صرف اور صرف مکھیوں کی فلاح کے لئے استعمال کیا جائے گا۔ افزائش نسل کا انتظام ہو (ویسے یہ انتظام کرنے کی ضرورت نہیں) اور ایک بورڈ بنایا جائے جو مکھیوں کی تاریخ مرتب کرے اور جیوگرفیکل چینل پر مکھیوں کے بارے میں ڈیڑھ گھنٹے کا پروگرام چلایا جائے جہاں اگر ہو سکے تو مرحومہ مکھی کے رشتے دار مزید کالا لباس پہن کر شریک ہوں کہ اسی میں مکھیوں کی فلاح ہے۔ ویسے میں اخبارات میں آج مکھی کے حوالے سے خبریں تلاش کرتا رہا ہوں کیونکہ ممکن ہے کسی خفیہ مقام سے طالبان کے کسی نمائندے کے حوالے سے یہ خبر لگی ہو کہ ''ہم افسوس کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ طالبان کے خلاف جاری اپریشن راہ راست میں آج پچاس نہیں انچاس طالبان مارے گئے اور ایک مکھی بھی کام آئی جو حکومت امریکہ کی تحویل میں ہے۔ اگر وہ ہمارے قریب ہوتی تو ہم اسے پورے اعزاز کے ساتھ دفن کرتے تاہم طالبان تحریک امریکی حکومت سے مطالبہ کرتی ہے کہ لڑائی جھگڑا اپنی جگہ ہماری مکھی چارٹرڈ طیارے کے ذریعے افغانستان بھیج دی جائے اور اگر اس پر خرچہ زیادہ آتا ہے جو کہ امریکی حکومت اس جنگی صورت میں برداشت کرنے سے قاصر ہے تو وہ مکھی سمندر کے کنارے کسی پر فضا مقام پر جہاں مکھیوں کی بہتات ہو نہایت خاموشی سے دفن کر دی جائے تاکہ اس کی مزید بے حرمتی نہ ہو۔''

بات شروع ہوئی تھی کچھ چیزیں نظروں سے اوجھل ہو جانے سے کہ کچھ چیزیں کچھ برائیاں نظر آتی ہیں اور کچھ چھپی رہتی ہیں۔ آپ کر حیرت کے ساتھ ساتھ خوشی ہو گی کہ حکومت وقت نے ساٹھ سال بعد اپنی اک غلطی تسلیم کر لی۔ بلاشبہ یہ غریب غوام کی فتح ہے۔ وہ یہ کہ ہمارے ملک میں خواجہ سراؤں کی رجسٹریشن نہیں ہو رہی تھی۔ یہ اہم ترین شعبہ نہ جانے کیوں ارباب اختیار کی آنکھوں سے اوجھل رہا۔ اب تیزی دیکھیے بقول نورم خان کہ اس سلسلہ میں چار ہفتوں کے اندر اندر رپورٹ بھی طلب کر لی گئی ہے۔ ہائے ہماری پھرتیاں!

اس مخلوق میرا مطلب ہے کہ خواجہ سراؤں کے بارے میں طرح طرح ابہام موجود ہیں۔ ان کی پیدائش سے موت تک کہ معاملات عام آدمی کی نظروں سے اوجل ہیں--- یہ شاید مذاق کی بات ہے یا سنجیدہ بات ہے کہ خواجہ سراء کا جنازہ پڑھایا جاتا ہے یا نہیں؟ میرے دوستوں میں اس بارے میں ''شدید'' اختلافات پیدا ہو چکے ہیں اور رات دو بجے تک اس بات پر بحث کرتے ہوئے الجھ پڑے لیکن کوئی ثبوت سامنے نہ آیا کہ ان کا جنازہ باقاعدہ پڑھا جاتا ہے کہ نہیں کیونکہ بڑے بڑے قبرستانوں میں لوگوں نے اپنے اپنے احاطہ (زمین کے ٹکڑے) بنا رکھے ہیں جہاں صرف اس احاطے کے مالک یا اس کے لواحقین متعلقین کے ہی جنازے پڑھائے جاتے ہیں مردے دفنائے جاتے ہیں اور یہ بے چارے خواجہ سرا جو ناچ ناچ کر تھک چکے ہیں ان کا کوئی پرسان حال نہیں۔ شکر ہے ساٹھ سال بعد کم از کم وہ رجسٹرڈ قسم کے پاکستانی تو ہو جائیں گے اور ہنستے ہنستے رجسٹرڈ ہوں گے اور سینہ تان کر چلیں گے شہر شہر گاؤں گاؤں گلی گلی---ویسے پہلے نادرہ کے دفاتر کے باہر دو قطاریں رجسٹریشن کروانے والوں کی ہوتی تھیں گویا اب ایک تیسری لائن خواجہ سراؤں کی بھی لگا کرے گی۔ شاید دائیں طرف مرد بائیں طرف عورتیں اور درمیان میں خواجہ سراؤں کی لائن اور ماحول خاصہ خوشگوار ہو گا۔ عوام کا دل بھی لگا رہے گا اور نادرہ کے خلاف شکایات بھی کم ہوا کریں گی البتہ عوام سے حکومتی سطح پر التماس ہے کہ ان کی لائین میں جہاں وہ کھڑے ہیں ان کی عزت نفس مجروح نہ کی جائے ورنہ جرمانہ ہو گا اور اگر کوئی مردان پر فقرہ کسے گا تو اسے بھی خواجہ سراؤں کی ہی لائین میں لگ کر اپنا کام کروانا ہو گا۔ اتفاقی طور پر ہونے والے معاملات پر سزا نہیں دی جائے گی اور امید ہے خواجہ سراء خواتین و حضرات بھی خاصی فراخ دلی کا مظاہرہ کریں گے اور چھوٹی چھوٹی بات پر عوام سے نہیں الجھیں گے اور زندہ دل پاکستانی رجسٹرڈ انسان ہونے کا ثبوت دیں گے۔ امید ہے جلد کسی گرو کی زیر سایہ خواجہ سراء ایک محفل منعقد کریں گے اور خوب ہلا گلا کریں گے کہ اب وہ ایک رجسٹرڈ پاکستانی شہری ہیں اور یقیناً یہ اعزاز کی بات ہے اور جمہوری دور میں ہونے والا نہایت عوامی قسم کا فیصلہ ہے اور خواجہ سراؤں کے ساتھ ساتھ حکومت وقت بھی اس اہم فیصلے پر فخر کر سکتی ہیں۔ رحمان فارس کا اک شعر ملاحظہ ہو---

کوئی نہیں ہے یہاں جیسا خوبرو تو ہے
حسیں بہت ہیں مگر میرے یار تو تو ہے

☆☆

نگاہِ انتخاب

☆ محمد سعید خان

بلیک مارکیٹنگ ہمارے معاشرے کا ایک ایسا المیہ ہے کہ جس سے ہر خاص و عام متاثر ہوتا ہے۔ اس تلخ حقیقت کو نذیر احمد شیخ کس خوبصورتی سے آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں، ملاحظہ کیجئے---

بلیک مارکیٹ

جہاں تک ان دکانوں پر نظر دوڑائی جاتی ہے
ضرورت کی ہر اک شے ان میں غائب پائی جاتی ہے
دساور سے یہاں تک جنس کو آتے تو دیکھا ہے
مگر آگے خدا جانے کہاں دفنا دی جاتی ہے
دوا آب بقا ہے چشمہ ظلمات میں پنہاں
جناب خضر آئیں تو بہم پہنچائی جاتی ہے
دکانداروں کے گھر پہ اب صدائیں دینی پڑتی ہیں
ہزاروں مرتبہ زنجیر در کھڑکائی جاتی ہے
بڑی مشکل سے پہلے جنس گاہک کو دکھاتے ہیں
بتا کر نرخ بالا پھر قیامت ڈھائی جاتی ہے
ادھر لالچ کے پلڑے میں نکلتا مال تلتا ہے
ادھر گاہک کے رخ پر مردنی سی چھائی جاتی ہے
منافع خور راہ نیک و بد کب دیکھ سکتا ہے
ملے دولت تو عقل خرد کی بینائی جاتی ہے
اسی بازار کی ایک اور بھی تصویر ملتی ہے
جہاں ہر جنس کی خالی شباہت پائی جاتی ہے
یہ مرچیں ہیں جنہیں گیرو نے اپنا رنگ بخشا ہے
یہ ہلدی زرد مٹی ہے، فقط پسوائی جاتی ہے
کہیں چاول کی کنکی پر چڑھا ہے قند کا شیرہ
یہ چینی ہے جو دُنیا کے گلے چپکائی جاتی ہے
نہ چکنائی، نہ بالائی، یہ خالص دودھ ہے، بھائی
کہ جس کو دیکھ کر اب بھینس بھی شرمائی جاتی ہے
براوے سے کرتا ہے نان بائی استفادہ جب
تو کتوں پر نظر قصاب کی للچائی جاتی ہے
کہیں آلو میں چربی کو رگڑ کر گھی بناتے ہیں
عجب حکمت سے روح کیمیاگر پائی جاتی ہے
یہ آٹے کا وٹامن ہے، اسے بھوسی نہیں کہتے
کبھی یہ پھینکی جاتی تھی مگر اب کھائی جاتی ہے
خس و خاشاک کی عطار پڑیا باندھ دیتا ہے
سڑک کی خاک بھی جس میں عطا فرمائی جاتی ہے
بھنے تیتر سر بازار بکتے ہوں تو یہ سمجھو
پس پردہ کہیں کوؤں کی شامت لائی جاتی ہے
غذا میں مل رہا ہے بے محابہ تیل مٹی کا
ہماری خشک آنتوں میں یہی چکنائی جاتی ہے
مشینوں کو یہی روح رواں حرکت میں لاتی ہے
بشر پی لے تو آخر کیا قیامت آئی جاتی ہے
اسی سے حضرت حجام ریزر تیز کرتے ہیں
اسی سے گاہکوں کی کھوپڑی سہلائی جاتی ہے
اطباء کا یہ کہنا ہے کہ ایسا تیل پینے سے
توانائی تو آتی ہے مگر دانائی جاتی ہے

رومانس

کشمیر کی برف پوش ایک وادی میں جھیل کنارے بیٹھی ایک لڑکی نے اپنے بوائے فرینڈ سے کہا۔

''ہیرو نہ بن، احمق! سوئیٹر پہن، سوئیٹر---!''

تکڑم

ٹیچر: کیا تم نے کبھی ہاتھی کو چائے پیتے ہوئے دیکھا ہے؟

سٹوڈنٹ: دیکھا ہے، سر! میں چڑیا گھر میں بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ سامنے سے ہاتھی گزر گیا۔ یوں میں نے چائے پیتے ہوئے ہاتھی کو دیکھا۔

سوال وجواب

س: شاعر ہونے کا کیا فائدہ ہوتا ہے؟

ج: گھر مہمانوں اور ڈاکوؤں سے محفوظ رہتا ہے۔

س: آج کل کے لڑکوں اور لڑکیوں میں کیا فرق ہے؟

ج: کچھ نہیں، دونوں ہی شور مچاتے ہیں۔

س: قلم اور تلوار میں سے کس کی اہمیت زیادہ ہے؟

ج: قلم کی---تلوار سے آپ شلوار میں ازار بند نہیں ڈال سکتے۔

جستہ جستہ

O کراچی کی سڑکوں پر ٹریفک جام کا یہ عالم ہے کہ اگر کوئی شخص ماہوار قسطوں پر کار خرید کر گھر کی جانب روانہ ہو تو گھر پہنچتے پہنچتے دوسری قسط کا وقت آ چکا ہوتا ہے۔

O وہ دانتوں کے علاج کے لئے ہمیشہ خاتون دندان ساز کے پاس ہی جاتا ہے۔ دراصل اسے اس امر سے بے حد سکون ملتا ہے کہ خاتون خانہ کے برعکس یہ خاتون اسے منہ کھولنے کے لئے کہتی ہے۔

غلطی

سردار بازو پر بلیڈ سے اپنی گرل فرینڈ کا نام لکھ رہا تھا۔ اسی اثنا میں وہ رونے لگا تو اُس کے دوست نے پوچھا۔

''کیا ہوا---؟''

''یار! اسپیلنگ غلط ہو گئے۔'' سردار نے روہانسو ہو کر کہا۔

مشکل

بڑا مشکل ہے سکول کی مس سے پیار کرنا اے

دوست! الو لیٹر بھیجا تھا اُس نے تین غلطیاں نکال دیں---
ناں، بھلا وہ کیا ہوم ورک تھا؟

تین چیزیں

تین چیزیں پاک رکھو۔ جسم، لباس، خیالات۔ تین چیزیں قابو میں رکھو۔ زبان، نفس، غصہ۔ تین چیزیں یاد رکھو۔ موت، احسان، نصیحت۔ تین چیزیں برداشت نہ کرو۔ ظلم، جھوٹ، فحاشی۔ تین چیزیں حاصل کرو۔ علم، دین، اعتماد۔ تین چیزیں ضائع مت کرو۔ صلاحیت، موقع، دوست۔ تین چیزیں کبھی نہ توڑو۔ دل، عہد، قانون۔ تین چیزوں کو چھوٹا نہ سمجھو۔ قرض، فرض، مرض۔ تین چیزیں ایک ہی بار ملتی ہیں۔ والدین، وقت، وجاہت۔ تین چیزیں ذلیل کرتی ہیں۔ چوری، چغلی، چاپلوسی۔ تین چیزیں دھیان سے اُٹھاؤ۔ قدم، قسم، قلم اور باقاعدگی سے پڑھتے رہو۔

ایک دُعا

یہ جو لوگ ہیں میرے اثاثہ زندگی میں، یا رب! یہ جہاں بھی رہیں، انہیں اپنی ذات کے سوا کسی کا محتاج نہ کرنا۔ آمین!

جستہ جستہ

O خوراک کی بابت لوگوں کا علم بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ وہ وقت قریب آ گیا ہے جب ریستوران میں بیٹھ کر لوگ کچھ اس طرح آرڈر دیا کریں گے۔

''میرے لئے دو سو کیلریز، میری بیوی کے لئے 150 جبکہ بچوں کے لئے 50،50 کیلریز لے آؤ۔''

O ایک بڑی کمپنی کے ڈائریکٹر کے کمرے سے آواز آئی۔

''ٹائپ، شارٹ ہینڈ اور املا وغیرہ کی غلطیوں کو چھوڑ کر تم اب تک اس کمپنی میں کام کرنے والی تمام سیکرٹریوں سے بہتر ہو۔''

O ''کیا تمہیں یقین ہے کہ تم میرا اخبار کامیابی سے چلا لو گے؟''

جی ہاں، جناب! میں پہلے بھی بلیک میلر ہی تھا۔''

O ''جب میں پیدا ہوا تو میری ماں کو بہت مایوسی ہوئی، وہ شاید لڑکی کی خواہش رکھتی ہونگیں۔''

''نہیں---دراصل وہ طلاق چاہتی تھیں۔''

بارش اور بیگم

O بارش اور بیگم کے برسنے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا، دونوں بے موقع برستے ہیں۔ چھتری کے ذریعے انسان بارش تو محفوظ رہ سکتا ہے لیکن بیوی سے نہیں۔

O بارش کے برسنے سے فصلیں ہری بھری ہوتی ہیں جبکہ بیگم کی بدولت انسان سر بالوں سے جاتا ہے۔

O بارش برسے تو لوگ گھروں کا رخ کرتے ہیں جبکہ بیگم برسے تو گھر سے باہر آنا پڑتا ہے۔

O بارش کے لئے محکمہ موسمیات پیش گوئی کرتا ہے جبکہ بیگم یہ فریضہ مختصر ترین نوٹس پر بھی انجام دے سکتی ہے۔

ایک سروے

فرانس میں ایک بار یہ جاننے کے لئے سروے کیا گیا کہ مرد آدمی رات کو بستر سے کیوں اُٹھتے ہیں تو معلوم ہوا کہ---

o سو میں سے چار تھوڑی سی شراب پینے کے لئے۔
o سو میں سے چھ ''ضرورت'' کے تحت۔
o باقی نوے فیصد اپنے گھر جانے کے لئے۔

تحفہ

ایک کمپنی کے چیئرمین کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا کہ کمپنی کے تمام ملازمین کی بیویوں کو ایک ایک قیمتی سویٹر تحفتاً دیا جائے گا، بیویوں کے ناپ لکھوا دیئے جائیں۔ سب نے ناپ لکھوا دیئے۔ اگلے دن مزید خیر سگالی کے طور پر یہ اعلان کیا گیا کہ چیئرمین ایک خط کے ساتھ سویٹر ہر ملازم کی بیوی کو براہ راست گھر بھیجیں گے۔ اس اعلان پر آدھے سے زیادہ ملازمین نے پہلے کے دیئے ہوئے ناپ تبدیل کروا دیئے۔

علاج

مکمل طبی معائنے کے بعد ایک صاحب کو ان کے ڈاکٹر نے بتایا۔

''آپ کو کوئی مرض نہیں ہے۔ اگر وہ دن میں ایک دو مرتبہ گرم پانی میں تھوڑی سی شراب ملا کر پی لیا کریں تو چند ہی دنوں میں چستی اور پھرتی کا مجسمہ بن جائیں گے۔''

ان صاحب نے احتجاج کیا۔ ''مگر، ڈاکٹر صاحب! آپ کو تو معلوم ہے کہ میں ہمیشہ سے شراب کا سخت مخالف رہا ہوں۔ میرے گھر والے کیا سوچیں گے؟''

ڈاکٹر نے کہا۔ ''آپ گھر والوں کی فکر نہ کریں، میں عمدہ قسم کی شراب کی چند بوتلیں آپ کو چپکے سے دے آؤں گا۔ گرم پانی آپ شیو بنانے کے بہانے منگوا سکتے ہیں۔''

دو دن بعد ڈاکٹر نے حال دریافت کرنے کے لئے اُن کے گھر فون پر اُن کے گھر والوں نے بتایا۔

''جسمانی صحت تو بالکل ٹھیک ہے مگر شاید دماغ کچھ چل گیا ہے، دو دن سے ہر آدھے گھنٹے بعد شیو بنا رہے ہیں۔''

شادیات

O شاعروں کو ضرور شادی کرنی چاہئے۔ اگر بیوی اچھی مل گئی تو زندگی اچھی ہو جائے گی بصورت دیگر شاعری اچھی ہو جائے گی۔

O اگر آپ زندگی کے کچھ دن اچھے بسر کرنا چاہتے ہیں تو شادی کر لیں اور اگر ساری زندگی اچھی گزارنا چاہتے ہیں تو ہرگز شادی نہ کریں۔

O شادی بڑی عمر کی عورت سے کریں۔ یا تو وہ گھر کو جنت بنا دے گی یا آپ کو جنتی!

O بیوی کی تلاش میں نکلو تو ہمیشہ کان استعمال کرو کیونکہ بیوی دُنیا کی وہ عورت ہے جسے آپ دیکھتے کم اور سنتے زیادہ ہیں ''اجی سنتے ہو'' کے لاحقے کے ساتھ!

O آج کل کی بیوی خاوند کو تکلیف اور مصیبت میں نہیں دیکھ سکتی اس لئے وہ اس کے رنڈوا ہونے کی دُعا نہیں مانگے گی بلکہ اپنا بیوہ ہونا قبول کرے گی۔

O خاوند کبھی اپنی بیوی کا آئیڈیل نہیں ہوتا اور جو بیوی کا آئیڈل ہوتا ہے، وہ خاوند نہیں ہوتا۔

آلو چھیلنا سیکھئے

سامان: آلو، چھری، پلیٹ، تولیہ، ڈیٹول، پٹی!

آلو لیجئے اور اسے چھری سے چھیلئے۔ چھلے ہوئے آلو ایک پلیٹ میں رکھتے جائیے۔ ویسے ایک بات تو بتایئے، آپ کو آلو چھیلنے کی بھلا ضرورت ہی کیا ہے؟

ہری مرچیں

O ''ڈاکٹر صاحب بڑا خطرناک آپریشن کرنے لگے ہیں، خطرناک آپریشن---!''

''ہاں، انہیں خطرہ ہے کہ فیس وصول نہیں ہو سکے گی۔''

O کہا ایک آدم خور نے مبلغ سے: اچھا، اگر خدا نے تمہیں ایسے تخلیق نہیں کیا ہے کہ لوگ تمہیں کھائیں تو مجھے صرف اتنا بتا دو کہ خدا نے پھر تمہیں گوشت کا کیوں بنایا ہے؟

☆☆

احمد فراز کے اصلی اشعار اور نقلی حسن کے تذکرے

حافظ مظفر محسن
0300-9449527

مَیں صبح سویرے لوڈشیڈنگ کے زیر سایہ شیو کر کے منہ دھو کر دفتر روانہ ہوا۔ گیلے بال اور سونے پر سہاگہ ہمارے علاقہ پر ترقیاتی کام نازل ہوئے دوسرا سال ہے۔ گیلے بالوں میں مٹی نے کیا رنگ جمایا ہوگا' آپ خود جانتے ہیں۔ نہ سمجھ آئے تو تجربہ کر کے دیکھ لیں۔ مجھے دفتر پہنچ جانے کی جلدی تھی۔ ایک تو حاضری لگانے والے کا خوف' دوسرا بہت سا کام جو میں پچھلے کئی دنوں سے ''کل کر لوں گا'' کے چکر میں جمع کرتا آ رہا تھا۔ تیسرا منہ پر جمی مٹی جو ''ترقیاتی کام'' کی وجہ سے ''کیچڑ'' کی طرح منہ پر چپکی ہوئی تھی--- نہ حاضری' نہ کام۔ سیدھا واش روم کی طرف بھاگا---تو ''مس جی'' واش روم سے نکل رہی تھیں۔ ''توبہ' یا اللہ خیر!---مس جی' آپ بغیر میک اپ کے باہر آ گئی ہیں---'' مس جی کے منہ سے ''ہائے'' نکلا اور وہ پھر بھاگم بھاگ ''واش روم'' گھس گئیں۔ میں خوف کے مارے وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔ میں نے مس جی کو پہلی بار بغیر میک اپ کے دیکھا تھا' کاش ایسا نہ ہوتا۔ ہر آدمی کا ایک امیج آپ کے دل و دماغ میں بنا ہوتا ہے' وہ چکناچور ہو جائے تو قیامت ڈھا دیتا ہے۔ عبداللہ ارشد طویل عرصہ سے مس جی کے عشق میں مبتلا تھا اور ہم نے سن رکھا ہے کہ ہمارے دفتر میں تیس سال پہلے منیر بہادر اور سارا سید بھی کام کرتی تھیں۔ دونوں میں عشق کا دور چل رہا تھا' گویا دونوں عاشقی کی چکی میں پس رہے تھے۔ قسمت کی بدقسمتی کہ ایک دن جس شام منیر بہادر کے گھر والوں نے رشتہ مانگنے جانا تھا' منیر بہادر نے سارا سید کو میک اپ کے بغیر دیکھ لیا۔ ادھر منیر بہادر کے گھر والے رشتہ دیکھنے گھر سے نکلے' ادھر منیر بہادر ائیر پورٹ کی طرف چل نکلا۔ اگلے دن گھر والوں کو منیر بہادر کا فون آیا کہ میں نے سچائی جان لی ہے' اپنے کیے پر پشیمان ہوں۔ میں اس وقت انگلستان کی حدود میں داخل ہو چکا ہوں۔ میرے لئے دعا کیجئے گا' انشاء اللہ کبھی واپس نہ آؤں گا۔ شکریہ---!''

میں نے اسی لمحے عہد کر لیا کہ میں تاریخ تازہ نہیں ہونے دوں گا۔ ''مس جی'' باہر نکلیں تو میں اَدب سے سامنے کھڑا ہو گیا۔ وہ گھبرا گئیں۔ میں نے کہا۔

''مس جی! ہمارے سامنے تو آپ ایک دفعہ بغیر میک اپ آ گئیں۔ خدا کے لئے' عبداللہ ارشد کے سامنے کبھی میک اپ کے بغیر مت آیئے گا---''

مس جی دوبارہ واش روم سے باہر نکلیں اور جب میں نے اپنا منہ شیشے میں دیکھا تو گھبراہٹ ہوئی۔ میں نے جلدی جلدی منہ دھویا اور سوچنے لگا کہ اگر میری منگیتر مجھے اس حلیئے میں دیکھ لے تو کیا ہو؟---وہی ہو جو منیر بہادر نے سارا سید سے کیا تھا یعنی صاف جواب اور میرے گھر والے ''میرے دوست'' سب کو پھر سے میرا رشتہ تلاش کرنے کی فکر لاحق ہوئی اور شاید اس وقت دوبارہ رشتہ ملتا جب میں مشہور سیاسی شخصیت شیخ رشید آف لال حویلی کی طرح توبہ تائب کے درجہ پر فائز ہو چکا ہوں--- بات ہو رہی تھی میک اپ زدہ خواتین کی اور اصلی نقلی چہروں کی۔ اس سلسلہ میں ہم سیاستدانوں کے اصلی نقلی چہروں' ان کے بیانات' پھر اپنے ہی بیانات کی تردید اور پھر سے پہلے والے بیان کی خود ہی تصدیق کر دینا۔ یہ ایک ایسا غیر سنجیدہ موضوع ہے جس پر بڑی تفصیلی بحث ہو سکتی ہے جو گھنٹوں جاری رہ کر سنجیدہ شکل اختیار کر سکتی ہے اور انجام---یاد رکھیں ایسی بحثوں کا کبھی کوئی انجام نہیں ہوتا۔

اکثر پاکستانی مردوں کو کوئی نہ کوئی موضوع چاہئے کہ جس پر وہ تفصیلی بحث کر سکیں۔ بے نتیجہ بحث---خواتین کو تو بحث کے لئے کبھی بھی موضوع کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ وہ ادرک کی اقسام پر کئی کئی گھنٹے بحث کر سکتی ہیں اور آخر میں بات ادرک کی رنگ کے سوٹ پر جا کر ختم ہو جائے گی۔ آج کل ادبی حلقوں میں اک نیا موضوع ہے اور اس پر بحث بھی شروع ہو چکی ہے۔ احمد فراز کے اصلی اشعار اک دوست جو ادبی دنیا میں جانے پہچانے جاتے ہیں' انہوں نے اس موضوع پر کتاب چھاپنے کا اعلان کیا تو حیرت ہوئی کہ اس میدان میں دونمبری شروع ہو گئی؟ صبح اک اردو کی تیسرے درجے کی ویب سائٹ کھولی تو وہاں بھی ادب و شاعری کے شعبہ میں اک عنوان موجود تھا--- ''احمد فراز کا اصلی کلام'' ---عجیب مشکل میں ڈال دیا ان لوگوں نے۔ کیا چائینہ کے کھلونوں کی طرح بڑے شعراء کا دونمبر کلام بھی ادبی حلقوں میں دستیاب ہو گا؟ ٹوئنٹی ٹوئنٹی کرکٹ ٹورنامنٹ کی طرح دونمبر مشاعرے بھی ہوا کریں گے---اک ویب سائٹ پر ''فراز کی اوریجنل غزل'' پڑھی اچھی لگی' ملاحظہ کریں---

پھرے گا تو بھی یونہی کو بکو ہماری طرح
دریدہ دامن و آشفتہ مو ہماری طرح
کبھی تو سنگ سے پھوٹے گی انجو غم کی
کبھی تو ٹوٹ کے روئے گا تو ہماری طرح
وہ لاکھ دشمن جاں ہو مگر خدا نہ کرے
کہ اس کا حال بھی ہو' ہو بہو ہماری طرح

غور کیا تو پتہ چلا کہ واقعی فراز کا اصلی کلام ہے۔ فراز کے کلام پر مبنی بہت سے سینکڑوں نہیں ہزاروں SMS مارکیٹ میں موجود ہیں جن میں پہلے مصرعہ میں اور کبھی دوسری لائن میں فراز کا نام فٹ کر دیا جاتا ہے۔ اس میں مزاحیہ SMS بھی ہیں اور کچھ بہت زیادہ سنجیدہ SMS---

فراز حور لگی تھی جو گھر سے وہ نکلی
وہ اس کے ساتھ کھڑا ہے' لنگور ہو جیسے

اک اور ایسا ہی چائینہ سے تیار SMS ملاحظہ کریں---

وہ پہلی بار جو رسوا ہوا تو میں نے فراز
کہا' ملے گی تجھے روز روز رسوائی

ابھی تک چائینہ میڈ SMS چلانے والوں کی غالب' میر تقی میر اور ایسی ہی دوسرے بڑے بلکہ بہت بڑے شعراء پر نظر نہیں پڑی۔ اللہ کرے' اردو شاعری کے یہ کوہ گراں ان لوگوں کی دسترس سے دور ہی رہیں کہ بے وزن شاعری کے اس دور میں ان بھاری بھرکم شخصیات کے ساتھ یہ زیادتی اچھی نہیں لگتی---احمد فراز کے حوالے سے ظالموں نے SMS کو کیا کیا رنگ دیا کس کس انداز میں پیش کیا احمد فراز مرحوم سے معذرت کے ساتھ ملاحظہ کریں---

کل میں نے اسے خوب ہنسایا جب فراز
ظالم جاتے ہوئے مجھے مسٹر بین کہہ گیا
خالی خالی شہر میں خالی خالی دن
آج احمد فراز کچھ کہنے کے موڈ میں نہیں
بڑے ظالم ہیں اس شہر کے لوگ اے فراز
سم بدل کے کہتے ہیں بتاؤ تو کون ہوں
اٹھا جو میرا جنازہ تو وہ چیخ کے بولے فراز
ٹھہر جاؤ' ابھی وڈی پھوپھی نے آنا ہے

اک شعر جو احمد فراز نے آخری مرتبہ ہسپتال میں کہا' بقول مارکیٹ میں SMS جاری کرنے والوں کے ملاحظہ ہو---

روز پھرتی ہو ان سفید کپڑوں میں فراز
کدی کالا جوڑا پا ساڈی فرمائش تے
منہ میٹھا کرنا ہے تو میرے پاس آ' فراز
مَیں تجھے اخروٹ اور کشمش کھلاؤں گا

☆☆

کچھ ادھر کی، کچھ ادھر کی

☆ شاہد اطہر

''چاند کے لکھاری''

یوں تو لکھاری' لکھاری ہوتا ہے مگر چاند کے لکھاری کچھ خاص ہیں' ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے (مچھر کا کام دیکھا جائے تو اور بات ہے) مگر جانفشانی میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ خاصے نامساعد حالات میں بھی کاغذ کا منہ کالا کرتے رہتے ہیں' پھر اپنی ڈاک کو ارسال کرنے کے بعد پرچے کے پرویز مشرف (ایڈیٹر) کے رحم وکرم پر ہوتے ہیں۔ انتظار کی مشکل گھڑیوں کے بعد جب مضمون شائع ہوتا ہے تو لکھاری کو دو جھٹکے لگتے ہیں۔ پہلا جھٹکا خوشی کا ہوتا ہے' دوسرا حیرت کا کیونکہ جو کہانی اُس نے لکھی ہوتی ہے' بقول اُس کے ایڈیٹر صاحب نے اس کا حلیہ ہی بگاڑ دیا ہوتا ہے اور بقول ایڈیٹر' کہانی کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے---- اگر شائع ہونے والی شے اپنے تنویر پھول صاحب کی ہو تو انہیں دو درجن غلطیاں (جو مصور امین کمپوز کی شرارت ہوتی ہے) بھی نکالنی پڑتی ہیں' یوں اُن کی اشاعت اگلے پرچے کے سندیسے میں مکمل ہوتی ہے۔ قارئین چاند اپنے ان پسندیدہ لکھاریوں کے بارے میں کچھ نہ کچھ جاننے کے لیے خواہش مند رہتے ہیں تو لیجئے' ہم آپ کی خدمت میں کچھ آن دی ریکارڈ اور کچھ آف دی ریکارڈ باتیں پیش کرتے ہیں۔ ایڈیٹر اور لکھاریوں کا ہماری رائے سے اختلاف ہونا لازمی ہے' پڑھنے والوں کیلئے ہرگز ضروری نہیں۔ پہلا تعارف معمولی سا طویل ہے' پھر فارمیٹ سٹ کر دیا گیا۔ ظاہر ہے' سب لکھاریوں کو شامل کرنا ممکن نہ تھا جس کیلئے ایڈوانس معذرت---- تو لیجئے' ملئے اپنے من چاہے لکھاریوں سے۔

ڈاکٹر نسیم جاوید سید: پرانی کہاوت ہے کہ آسمان سے گرا' کھجور میں اٹکا۔ موصوف سعودی عرب سے گرے' اسلام آباد میں اٹکے۔ ڈاکٹر ہیں اور پیشے کے اعتبار سے لیڈی ڈاکٹر (اپنی بے غم) کے مشیر ہیں' بالکل ویسے جیسے رحمان ملک وزیراعظم کے مشیر ہیں اور وزیراعظم کو پتہ ہی نہیں ہوتا کہ مشیر صاحب کیا کرتے پھر رہے ہیں؟---- بہرحال اُن کی ''بے غم'' معاوضے میں کاغذوں کے بہت سے دستے اور بال پن کے ڈبے انہیں فراہم کرتی رہتی ہیں اور کہتی ہیں ''لگے رہو منا بھائی!'' اور موصوف لگے رہتے ہیں---- ''آداب عرض'' میں ''مرحلے وفا کے'' قسطوار لکھتے ہیں۔ ہماری نانی مرحومہ بچپن سے بڑے شوق سے پڑھا کرتی تھیں مگر کہانی کا انجام جاننے کی حسرت لیئے فوت ہو گئیں۔ والدہ ماجدہ بھی اُن کی حسرت پوری نہ کر سکیں اور گمان یہی ہے کہ اب ہم کام آجائیں گے مگر انجام کے بارے میں اگلے جہاں میں بھی نانی کو آگاہ نہ کر پائیں گے---- ڈاکٹر نسیم جاوید کو نیند نہیں آتی البتہ ٹانگ سو جاتی ہے' یوں ڈاکٹر کی تلاش شروع ہو جاتی ہے حالانکہ خود بھی ڈاکٹر ہیں مگر سُن رکھا ہے کہ ڈاکٹر اپنا علاج خود نہیں کر سکتا۔ بیگم بھی ڈاکٹر ہیں مگر زنانہ امراض کی لہٰذا اُن سے رجوع کرنا مردانگی کے خلاف ہوتا ہے---- کہتے ہیں' چور چوری سے جائے مگر ہیرا پھیری سے نہ جائے۔ خود ڈاکٹر ہیں' مگر پریکٹس چھوڑ رکھی ہے مگر ہیرا پھیری کے طور پر چاند میں مفت مشورہ کلینک کھول رکھا ہے۔ اسٹارٹ میں ننھے چڑے سر والی' مائی پھتو' ماجا کمہار کو مشورے دیا کرتے تھے۔ اب ماشاء اللہ ترقی کر گئے ہیں (جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ سوتے کم ہیں' جاگتے میں ہی خواب دیکھا کرتے ہیں) اب کہ سٹینا روکا' انجیلا جولی' جارج بش وغیرہ کو مشورے دے رہے ہوتے ہیں۔ بڑے بذلہ سنج ہیں۔ آپ کو اگر ان سے جہاز لینا ہو تو بس ایک سوئی تحفے میں انہیں دے دیں۔ بُرا منانے میں دیر نہیں لگاتے البتہ انکل کہہ کر

مخاطب کرنے والی لڑکیوں کو اس گستاخی پر اکثر معاف کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب 8/3 اسلام آباد میں رہتے ہیں اور اپنی مارکیٹ بنام سنگم مارکیٹ سے سودا سلف کی خریداری کرتے ہیں جہاں گرمیوں میں وہ جاوید کا لیموسوڈا اور سردیوں میں اسی جاوید کا چکن کارن سوپ شوق سے پیتے ہیں۔ حال ہی میں میٹرو ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں بھی دیکھے گئے جہاں کم سے کم خریداری کی حد دو ہزار ہے' موصوف نے فقط 4 ہزار کے کاغذ اور قلم خرید کیئے۔ جذبہ جنون ہو تو ایسا ہونا چاہیے--- ڈاکٹر صاحب کو پی آئی اے کے اُس پائیلٹ پر بہت غصہ ہے جو گوادر سے کراچی جاتے ہوئے ایک ٹی وی اداکارہ کو کاک پٹ میں بیٹھا کر مشورے دیتا رہا اور نتیجہ کے طور پر معطل ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ مشورے دینا صرف اُن کا کام ہے اور اگر پائیلٹ اتنا ہی مخلص تھا تو اداکارہ کو ڈاکٹر صاحب کے پاس چھوڑ جاتا--- کہنے والے سچ ہی کہتے ہیں کہ وکیل اور ڈاکٹر کبھی مفت مشورہ نہیں دیا کرتے۔ باوثوق ذریعہ کا سفیر لگا دیا مگر مغوی ہونے کے ڈر سے ڈاکٹر صاحب نے یہ پیشکش نامنظور کر دی۔

شوکت علی مظفر: اِن کا تعلق کراچی سے ہے۔ لوگ انہیں ''مظفر بھائی'' کہتے ہیں۔ انڈیا میں ''بھائی'' بڑے بدمعاش کو لیکن ''کراچی'' میں بھائی احترام سے کہا جاتا ہے جیسے الطاف بھائی بلکہ کراچی کی بہت سی بیگمات اسی احترام کے چکر میں اپنے شوہر کو بھی ''بھائی میاں'' کہہ دیتی ہیں--- بے حد کنجوس آدمی ہیں' اچھا لکھتے ہیں مگر مختصر ہی لکھتے ہیں۔ مظفر بھائی آجکل روپوش ہیں کیونکہ انہوں نے چودھری شجاعت حسین پر مضمون لکھ مارا اور بدقسمتی سے چودھری صاحب کو کسی نے پڑھ کر سُنا بھی دیا۔ بس یہی مظفر بھائی سے چوک ہو گئی کہ انہوں نے راتوں میں بھی چودھری جی کو سیاہ چشمہ لگے دیکھ کر سوچ لیا تھا کہ وہ ان کا مضمون نہیں پڑھ پائیں گے--- خیر' صاحب! اب مظفر بھائی میاں اس انتظار میں ہیں کہ چودھری صاحب پرموٹ ہو کر صدر ق لیگ سے چیئرمین ق لیگ ہو جائیں تو وہ آرام سے باہر آجائیں--- شوکت علی مظفر سیاست پر لکھنا اپنے فرائض منصبی میں شمار کرتے ہیں۔ بقول چودھری پرویز الٰہی ''بچہ حکومت'' پر کچھ نہ ہی لکھیں تو بہتر ہے کیونکہ بچہ حکومت پہلے بند کرتی ہے' بعد میں مضمون پڑھتی ہے--- کہتے ہیں کہ سلمان تاثیر کو گورنری فقط نواز شریف کا دشمن ہونے کی وجہ سے ملی ہے وگرنہ پرویز مشرف کا خیر خواہ ہونا اتنی بڑی بات نہیں دیگر الفاظ میں جب علیؓ نہیں' بغض معاویہ کے مصداق پاکستان کی سیاست چل رہی ہے--- کہتے ہیں کہ کوئی چیز ناممکن نہیں۔ پھر ایک دن ہم سب بھی شوکت علی مظفر کی لونگ اسٹوری پڑھ ہی لیں گے۔

زاہد حسین زاہد: پبلسٹی پر زمانے میں کامیابی کی ضامن سمجھی جاتی رہی ہے۔ اب شیو یا بلیڈ کا اشتہار بھی ہو تو اُس میں بھی حسینہ کی موجودگی لازم ہوتی ہے۔ خیر' صاحب! پروڈکٹ کی پبلسٹی سمجھ میں آتی ہے' فلم کی پبلسٹی بھی سمجھ میں آتی ہے۔ چلئے' مانے لیتے ہیں کہ کتاب کی پبلسٹی بھی بہت اہمیت رکھتی ہے مگر یہ ملکہ زاہد حسین زاہد کو ہی حاصل ہے کہ وہ اپنے ''آنے والے'' مضمون کی بھی سالوں پہلے پبلسٹی کر دیتے ہیں۔ ''آج کا مغل اعظم'' کا اشتہار ہم بچپن سے سنتے آرہے ہیں لیکن وہ مغل اعظم منظر عام پر نہیں آرہا لیکن وہ مغل اعظم کل کا مغل اعظم محسوس ہونے لگا ہے یا پھر ''مجاجن'' بن گیا ہو شاید--- رائیٹر صاحب ''چچو کی ملیاں'' میں سالوں لگا دیتے ہیں۔ ایک زمانے میں راقم کو اپنے مضامین کی اشاعت نہ ہونے کی واحد وجہ سمجھتے تھے' اب خود کو سمجھتے ہیں۔ ایڈیٹر سے صرف اُس صورت خوش ہوتے جب ان کا مضمون شائع ہو جائے وگرنہ ایڈیٹر کم فہمی کا شکوہ کرنے میں بھی دیر نہیں لگاتے--- سیاست سے بہت گہرا تعلق ہے چچو کی ملیاں کے مکین الیکشن کے دنوں میں جو بینرز پر نعرے پڑھتے ہیں مثلاً ''آوے گا' او آوے گا'' یا پھر ''نواز شریف شیر ہے' باقی سب ہیر پھیر ہے'' وغیرہ موصوف کے ہی تخلیق کیئے ہوئے ہوتے ہیں۔ شاعری بھی کرتے ہیں اور جن کو سناتے ہیں' ان سے اپنے اشعار کے معنی پوچھنے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہیں کرتے۔

نازیہ ناز نازی: حیران نہ ہوں' یہ ایک ہی لکھارن ہیں اور نام تین ہیں۔ والدہ ''نازیہ'' کہتی ہیں' والد ''ناز'' کہہ کر پکارتے ہیں اور نانی ''نازی'' کے نام سے مخاطب کرتی ہیں۔ محترمہ چاند میں پیشانیاں لکھتی ہیں اور سندیسے بھی لکھا کرتی ہیں۔ ووٹ عمران خان کو دیتی ہیں' خصوصاً جب وہ الیکشن کا بائی کاٹ کر رہے ہوں۔ کرکٹ میں عمران خان کو ہی پسند کرتی تھیں' خصوصاً جب عمران خان نے ریٹائرمنٹ لے لی تھی۔ عمران خان ہی اُن کی آئیڈیل شخصیت ہیں مگر اُن کی شادی جمائمہ سے ہو گئی اور جب عمران خان اور جمائمہ میں علیحدگی ہو گئی تو محترمہ کی اپنی شادی ہو چکی تھی--- پیشانیوں میں کاکوں کی مت مار دیتی ہیں جبکہ کاکے کہتے ہیں کہ بے چاری کی اپنی مت ماری ہوئی ہے وزن کے معاملے میں خود کفیل ہیں' چار سو پونڈ کا دھان پان سا بدن رکھتی ہیں۔ ان عظیم لکھارن نے حال ہی میں انکشاف کیا ہے کہ وہ آئندہ ایک طویل تحریر بھی لکھنے کا ارادہ رکھتی ہیں ہم تمام قارئین ان کی آدھے صفحے کی طویل تحریر کے منتظر ہیں۔ پیشہ کے اعتبار سے استانی ہیں' اکثر بچوں کو انہیں پڑھاتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ بھینس سے بڑی نفرت کرتی ہیں'

یہاں تک کے بھینس کو اپنے گھر پر بھی نہیں رکھتیں۔ کہتی ہیں کہ ایک گھر میں دو بھینس نہیں سما سکتیں۔ بڑی بذلہ سنج ہیں۔ کوئی اُن کو گلاب کا پھول مار دے تو محترمہ جواب میں پھول ضرور مارتی ہیں وہ بھی گملے سمیت---!

احمد حسیب قیصر: نام بڑا، درشن چھوٹے کے مصداق ایسی تحریروں کے درشن کم کم کرواتے ہیں۔ اگرچہ چاند کے پڑھنے والے ان کے تبصروں اور خطوط غالب--- معاف کیجئے گا، خطوط قیصر کے علاوہ بھی بہت کچھ پڑھنا چاہتے ہیں۔ الیکشن میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے ہیں۔ سارا دن ساری رات ٹی وی کے سامنے بیٹھے رہتے ہیں اور پورے گھرانے کو بتاتے رہتے ہیں کہ نواز شریف سے کون سی غلطی سرزد ہوئی، آصف زرداری چونکہ صدر مشرف کے نائب کپتان بنے، مولانا فضل الرحمٰن آج کیا نیا پانسہ پھینکیں گے البتہ ولی خان کی پارٹی کو پسند کرتے ہیں کیونکہ پٹھان جو بھی کہتا ہے، ڈنکے کی چوٹ پر کہتا ہے۔ ججوں کے معاملہ میں کہتے ہیں کہ انہیں کو بے حال کرنے سے بہتر ہے کہ بحال ہی کر دیا جائے۔ سنئیر اور قابل احترام لکھاری ہیں اور پٹھان کی طرح تبصرہ کرتے ہیں یعنی جو دل میں ہو وہی زبان پر ہوتا ہے۔ حد تو یہ ہوگئی کہ حالیہ الیکشن میں ان کے حلقے سے میں کوئی NP کا امیدوار نہ تھا تو ایک راہ گیر پٹھان پر مہر لگا کر اپنے ووٹ کا حق ادا کیا۔ جواب میں پٹھان بھائی نے ان کا ''شکریہ'' ادا کیا اور ہسپتال تک خود چھوڑ کر آیا---لوڈشیڈنگ کے وقت گھر میں ''لال ٹرن'' جیسے عام فہم میں لالٹین کہتے ہیں، جلاتے ہیں کہ NP کا انتخابی نشان یہی ہے۔ مٹی کا تیل نایاب ہو تو چارج ایبل بیٹری والی لال ٹرن روشن کر لیتے ہیں۔

عادل گلزار: فیصل آباد کو پاکستان کا مانچسٹر کہا جاتا ہے اور ہم قسم سے کہتے ہیں، ایسا صرف وہ کہہ سکتے ہیں جو اندھے ہوں یا پھر مانچسٹر کبھی نہ دیکھا ہو۔ مانچسٹر والے اگر فیصل آباد کو دیکھ لیں تو اجتماعی خودکشی سے بھی دریغ نہ کریں گے۔ بہرحال، عادل گلزار کا تعلق اسی شہر سے ہے اور یہی وجہ شہرت ہے۔ فیصل آباد کی نہیں، عادل گلزار کی--- عادل گلزار جب پیدا ہوئے تو وہ مقام ''لائل پور'' تھا، اب مانچسٹر--- معاف کیجئے گا، فیصل آباد ہے۔ سعودی شاہ فیصل نے اس شہر کو آباد نہیں کیا مگر لائل پور کو مشرف با اسلام کرنے کے بعد ایسا ہو گیا--- عادل گلزار چاند کے پرانے لکھاری ہیں، مشورے دینا ان کا مشغلہ ہے اور حیرت ہے کہ اچھے مشورے دیتے ہیں۔ دوسری حیرت کی بات یہ ہے کہ ایڈیٹر صاحب نے اُن کے مشورے پر کبھی عمل نہیں کیا۔ حال ہی میں تحریر بعنوان ''شوکت عزیز امریکہ کو عزیز ہو گئے''، لکھی۔ ہمارے خیال میں شوکت عزیز اگر امریکہ کو پیارے ہو گئے ہوتے تو شاید بہتر ہوتا۔ بڑے حساس جذبات رکھتے ہیں۔ کسی کے مرنے پر بھی اُسے تعزیت کا SMS کر دیتے ہیں مبادا! مرحوم یہ نہ کہے کہ دیکھو، مرنے پر SMS ہی کرنا چھوڑ دیا---انٹرنیٹ استعمال کرنے کے ماہر ہیں۔ اپنے پیارے ماموں کی شوگر کا علاج بھی انٹرنیٹ سے دریافت کرتے ہیں۔ کاروباری آدمی ہیں، سال میں چند دن پڑھ بھی لیتے ہیں۔ چاند کے علاوہ صرف امتحانی کاپی پر لکھتے ہیں۔

پروفیسر ظریف خان: چاند کے سب سے بڑے لکھاری ہیں ارے بھئی، عمر کے لحاظ سے--- لکھتے کم ہیں، شائع زیادہ ہوتے ہیں کیونکہ ایسا کوئی سندیسہ نہیں ہوتا جس میں موصوف کا نام نامی نہ ہو۔ گوٹھ ماچھی میں اردو کے مدرس اعلیٰ ہیں۔ انگریزی سے سخت نفرت کرتے ہیں، یہاں تک کہ جب تنخواہ ملتی ہے تو نوٹ اُس طرف سے گنتے ہیں جس طرف اردو لکھی ہوتی ہے--- خان ہیں تو پٹھان ہیں اور ہم نے کسی پٹھان کی اتنی عمدہ اردو کم کم ہی دیکھی ہے۔ فطرت میں مزاح ہے یا شاید نام کا اثر ہے۔ سنجیدہ بھی خوب لکھتے ہیں۔ حساب سے کم لگاؤ ہے، صرف امتحانی پرچے جانچتے ہوئے جمع تفریق کرتے ہیں۔ چیک بک پر بھی اردو میں لکھتے ہیں اور بنک والوں کو مشکل میں ڈال کر خوش ہوتے ہیں۔ موصوف کی لکھائی بہت باریک ہے جس کی وجہ سے ایڈیٹر چاند کو پہلے ان کی تحریروں کی انلارج کاپی بنوانی پڑتی ہے۔ خود ساختہ ''جلا پتنی'' (بے غم کے بغیر) زندگی گزارتے ہیں، اللہ ایسی ہمت سب کو دے تاکہ بیویاں بھی سکون سے رہ سکیں--- سیاست میں پہلے صرف مسرت شاہین کو پسند کرتے تھے اب تو یہ حال ہے کہ فرزانہ راجہ، شیری رحمان، کشمالا طارق، سسّی پلیجو، فوزیہ وہاب وغیرہ جس پروگرام میں نظر آجائیں، وہ اشتہاروں سمیت دیکھا کرتے ہیں۔ سُنا ہے، سندھ کی کلچر منسٹر کو اپنی شاعری کی کتاب بھجوائی جسے اُس نے آثار قدیمہ کی زینت بنوادی۔

ایک سپیرن خانہ بدوش: حیران نہ ہوں، یہ نام بھی چاند کی ایک لکھارن کا ہے۔ ہمیں ٹھیک سے علم نہیں، گمان یہی ہے کہ یہ موصوفہ کا نام نہیں کیونکہ یہ تو ایک پیشہ ہوتا ہے۔ اب یہ محترمہ چاند میں کون سے سانپ پکڑ رہی ہیں، اس کا بھی کسی کو علم نہیں۔ نام کے علاوہ محترمہ کی وجہ شہرت سندیسے لکھنا ہی ہے۔ امید واثق ہے کہ جب بھی ان کے ہاتھ میں کوئی کوبرا لگ گیا، پھر شاید کوئی طویل تحریر بھی منظر عام پر آجائے۔ خانہ بدوش بھی ہیں، اگرچہ یہ خانہ بدوشی اپنے گھر کے ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک ہوتی رہی ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ محترمہ، مرد ہیں۔ اب اگر کسی مرد کو زنانی وہ بھی خود ساختہ بننے کا شوق ہو تو کسی کو کیا

اعتراض' آجکل کے مرد کون سا سانپ نکال لیتے ہیں؟--- چاند کے مائیہ ناز "ٹیلیے" شاہد روف نے بتایا کہ محترمہ کا چاند (ارے بھئی' رسالہ) گم ہو گیا تو انہوں نے شاہد روف کو رپورٹ لکھوائی۔ شاہد روف نے مدعی کو پکڑ لیا مگر کوئی سانپ برآمد نہیں ہوا۔ بقول اُن کے' یہ پولیس کیس نہیں بلکہ حکیم عنایت اللہ شاہد کا کیس ہے مگر حکیم جی پہلے ہی سیماجان کے معالجے سے بے حال ہیں' پھر ان کا علاج کیونکر کریں؟ یہ ڈر بھی اپنی جگہ برقرار ہے کہ کوئی سانپ علاج کے نتیجے میں ہی نکل آیا تو حکیم جی کیا کریں گے؟--- موصوفہ لوگوں کو خط لکھنے کی بہت شوقین ہیں مگر لوگ خط وصول نہیں کرنا چاہے مبادا "انقرکس" (زہر) ہی نہ نکل آئے۔

ہارون حسرت جالندھری: "حسرت اُن غنچوں پر جو بن کھلے مُرجھا گئے" موصوف کے نام میں ہی حسرت شامل ہے۔ سرگودھا میں پیدا ہوئے' خود کو جالندھری کہتے ہیں حالانکہ جالندھر کو سپنے میں بھی نہیں دیکھا۔ قارئین کیلئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ موصوف بڑے لکھاری ہیں یا شاعر؟ اکثر شاعری میں نثر نگاری اور نثر نگاری میں شاعری کر ڈالتے ہیں۔ کسی کے مرنے پر بھی چاند میں مضمون شائع کروا ڈالتے ہیں۔ اپنے سابقہ مضمون "خواب بنا عذاب" میں بھی انہوں نے اپنی حسرتوں کا ہی اظہار کیا ہے۔ اکثر لڑکے' لڑکیاں بن کر ان سے ایزی لوڈ بھی کروا لیتے ہیں لیکن لڑکیوں--- معاف کیجئے گا' لڑکی--- پھر معاف کیجئے گا' بیوی کو ابھی تک ایزی لوڈ نہیں کر سکے کہ یہ خدا کی مرضی ہے البتہ خدا کے یہاں دیر ہے' اندھیر نہیں--- ان کے خاندان میں کوئی شاعر یا ادیب نہیں گزرا' اسے ہم ادب پر ان کے خاندان کا احسان ہی گردانتے ہیں۔ سائیکل کی سواری موصوف کی پسندیدہ سواری ہے۔ جب تک محترم نے سائیکل پر ایک اچھا مضمون نہیں لکھا تھا' سائیکل ٹھیک چلتی تھی مگر اب نہیں چلتی' اسی سائیکل کی وجہ سے مسلم لیگ ق سے گہرا تعلق رہا۔ یہ الگ بات ہے کہ ق لیگ کی اپنی سائیکل پنکچر ہو گئی ہے۔ چودھری پرویز الٰہی نے پارٹی کا کام نہ کرنے پر انہیں ایک سائیکل تحفے میں دے دی تھی جسے فروخت کر کے نیا موبائل خریدا اور یہ خواہش تھی کہ اُس پر لڑکیوں کے فون آئیں گے پر یہ بھی حسرت ہی رہی۔

منظور احمد اعوان: بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ محترم اعوان بس سروس چلاتے ہیں۔ زیادہ خوش فہمی کی ضرورت نہیں۔ یہ اعوان بس سروس کے مالک نہیں' ڈرائیور ہیں لہٰذا قلم بھی خوب چلاتے ہیں۔ اچھا لکھنے میں' اُور ٹیک کرنے کی کوشش میں چلان کروا کر بیٹھتے ہیں اور رشوت دے کر پھر آگے نکل جاتے ہیں۔ سعودی عرب میں رہنے کا بھی کوئی اثر نہیں لیا۔ لوگوں سے میل جول کے بڑے شوقین ہیں' ایک کپ چائے پینے کیلئے ہزار روپے کرایہ لگا کر پہنچ جاتے ہیں کہ آخر خلوص بھی کوئی چیز ہے۔ پروفیسر ظریف خان سے بہت متاثر ہیں کہ وہ ان سے پنجابی میں بات کرتے ہیں۔ اعوان بھائی! جس دن آپ نے پروفیسر صاحب سے انگریزی میں بات کی تو لگ پتہ جائے گا--- تحفے دینے میں بڑے چوزی ہیں۔ عامر ناصر اعوان کیلئے دودھ کی شیشی لائے ہیں اور اک سپیرن کیلئے بین۔ خطوط لکھنے میں ماہر ہیں' خط کو مضمون کی طرح لکھتے ہیں اور کبھی کبھی مضمون کو خط کی طرح--- مزاح میں بھی شائستگی کا خیال رکھتے ہیں اور ایک گلوکارہ کا تو اس حد تک احترام کرتے ہیں کہ اُس کے خط کی فوٹو کاپیاں ہر ملنے والے کو ارسال کر رہے ہیں۔ ہم تو کہتے ہیں کہ کاش' خط کی جگہ گلوکارہ کی وزٹ ہی ڈال دیا کرے تو مزے ہو جائے۔ پیر پگاڑا ان کے پسندیدہ سیاسی لیڈر ہیں کیونکہ موصوف مزاج کے دلدادہ ہیں۔ رحیم یار خان میں CD'S کی دو کان کھول رہے ہیں' وہ بھی صرف اپنی پسندیدہ گلوکارہ کی CD'S کی وجہ سے---!

راحت وفا: لاہور کی استانی ہو' تحریر میں روانی ہو' وقت کی فراوانی ہو' کچھ عقل کچھ نادانی ہو' سب کی جانی پہچانی ہو تو سمجھ لیں یہ راحت وفا ہیں۔ آداب عرض میں لکھتی ہیں تو اشعار کا ایسا استعمال کرتی ہیں کہ واہ واہ اور چاند میں لکھیں تو خواتین کا پوسٹ مارٹم کر ڈالتی ہیں۔ یہ کسی عورت کا ہی کمال ہو سکتا ہے کہ وہ "اف یہ عورتیں" لکھ دے البتہ مردوں میں "بیگم نوازش علی" کو سخت ناپسند کرتی ہیں۔ استانی ہیں' اسکول میں کھچڑی پکاتی ہیں اور گھر کے کچن میں بچوں کو پڑھاتی ہیں۔ فون پر بات کر لیتی ہیں' SMS کرنے پر جان جاتی ہے کہ اس میں لکھنا پڑتا ہے۔ سیاست دانوں میں فقط شیخ رشید اور واجپائی جی کو پسند کرتی ہیں کہ دونوں سدا کے کنوارے ہیں۔ اس ناتے کم از کم دو عورتیں جو ان دونوں کی بیگمات ہو سکتی تھیں' اُن کی جان تو بچی ہوئی ہے۔ کھانے میں وہ اشیاء پسند کرتی ہیں جو خود نہ پکانی پڑتی ہوں۔ اسٹار پلس کے ڈرامے شوق سے دیکھتی ہیں' پھر کہتی ہیں "اف یہ عورتیں"--- خبروں سے سخت نفرت کرتی ہیں' گھر میں اخبار تک نہیں لگوایا۔ اپنی مرحومہ ساسو ماں سے بہت پیار تھا کیونکہ "ساس بھی کبھی بہو تھی"۔ ویسے اسٹیج ڈرامہ بھی نہیں دیکھا لیکن گھر بھی ایک اسٹیج ہی ہوتا ہے اور زندگی کا ڈرامہ چلتا ہی رہتا ہے۔ خواہش رکھتی ہیں کہ کالا باغ ڈیم بنایا جائے مگر ڈیم فولز یہ ڈیم بننے ہی نہیں دے رہے۔

روح اللہ روح: چاند کے اُبھرتے ہوئے لکھاری ہیں' تعلق مردان سے ہے۔ باتوں سے ہی پٹھان معلوم ہوتے ہیں۔ پرائمری سکول میں دوسری جماعت تک کے انگریزی کے استاد ہیں' پشتو میں انگریزی

پڑھانے میں ملکہ حاصل ہے۔ حساب میں بھی ماہر ہیں' اپنے سکول میں تمام خورد بُرد خود ہی کرتے ہیں اور پھر کمال ہوشیاری سے آڈٹ بھی کروا لیتے ہیں--- سائیکل پر اسکول جاتے ہیں اور پٹرول کے پیسے اسکول سے وصول کرتے ہیں۔ الیکشن کے دنوں میں سیاسی جماعت کے خزانچی بنے ہوتے ہیں' مخالف پارٹی کے بورڈ اُتروا کے اُسے اپنی پارٹی کا بنوا دیتے ہیں اور آڈٹ کے بعد بل خود وصول کر لیتے ہیں۔ ملک اور قوم کی خدمت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے اس لئے غبن عبادت سمجھ کر کرتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے' غبن کر لینے سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ دوسرے غبن کا گناہ کرنے سے بچ جاتے ہیں۔ پڑھے لکھے آدمی ہیں' موجودہ حالات میں سب سے زیادہ پسندیدہ بُک چیک بُک ہے۔ اس ناتے اُن کا پسندیدہ لکھاری وہی ہوتا ہے جو اُن کیلئے چیک لکھ دے۔ ٹی وی میں بزنس پلس اور CNBC چینلز پسند ہیں کیونکہ ان میں دو اور آٹھ بنانے کے طریقے بتائے جاتے ہیں۔ تفریح اور ہنسنے کیلئے خبریں بھی دیکھ لیتے ہیں IPL کرکٹ میں اس وقت دلچسپی شروع ہوئی جب پتہ چلا کہ اُس میں سٹہ چل رہا ہے۔

ظفر ندیم وہرہ: ایک تھا بادشاہ' اُس نے ایک پہلوان پال رکھا تھا اور وہ پہلوان ہاتھی کی دم پکڑ لیتا تو ہاتھی حرکت بھی نہ کر پاتا۔ بادشاہ نے اپنے شوکت عزیز یعنی وزیر اعظم سے کہا کہ دیکھو' کیسا طاقت ور پہلوان ہے ہمارا--- وزیر اعظم نے عرض کیا کہ حضور! یہ بے فکری ہے جو آپ نے اسے عطا کر رکھی ہے۔ اگر اسے صرف آٹا خود خرید کر کھانا پڑے تو اس کی ساری طاقت زائل ہو جائے--- طے پایا کہ وزیر اعظم کی بات کو پرکھا جائے گا۔ بادشاہ نے پہلوان بہادر کو حکم دیا کہ کل سے ٹھیک پانچ بجے صبح وہ دربار میں حاضری لگایا کرے گا۔ پہلوان بہادر کو رات میں نیند ہی نہ آئی کہ صبح ٹھیک پانچ بجے حاضری دینا ہے۔ قصہ مختصر ایک ہفتے بعد وہ ہاتھی کیا' گدھے کو بھی نہ روک پایا اور ایسا ہی کچھ حال ہمارے پسندیدہ لکھاری ظفر ندیم وہرہ کا ہوا جب پریشانیوں کا غلبہ نہ تھا اور موصوف بنگلہ دیش میں منیجر تھے تو ہر بنگالی دوشیزہ محبوبہ دِکھائی دیتی تھی اور اب ہر پاکستانی محبوبہ بہن دِکھائی دیتی ہے۔ خواب لکھتے تھے' مزاح سے بھرپور مگر آجکل سنجیدہ سندیسے اور تبصرے لکھتے ہیں فرق تو پڑتا ہے اعلیٰ قیادت سے' جیو مشرف!--- ہم دعا گو ہیں کہ موصوف کے حالات بہتر ہوں اور چاند میں پھر سے رونق آجائے۔

سید ابرار بخاری: چاند کے لکھاریوں کی بات ہو اور ابرار بخاری کا ذکر نہ ہو یہ ممکن ہی نہیں سید ابرار بخاری مزاح کے دلدادہ ہیں۔ بہترین لکھتے ہیں' خود پر ہنسنے کا فن جانتے ہیں اور ہماری میں بھی مزاح تلاش کر لیتے ہیں۔ حال ہی میں جگر کی گرمی کے مرض میں مبتلا ہوئے' ہزاروں روپے خرچ کر کے صحت یاب ہوئے حالانکہ یہ تندرستی فقط گنے کا رس پی کر بھی مل سکتی تھی مگر موصوف نے ایک اچھا مضمون لکھنا تھا سو بیماری کو طول دیتے رہے--- زندگی میں سب سے بڑا مسئلہ اُن کے پڑوسی مسٹر مغل ہیں جن سے ہر دم مقابلہ چلتا رہتا ہے۔ مغل صاحب کو پیچش لگی' موصوف نے خود کو ہیپاٹائٹس لگوالی کہ بیماری کے مقابلے میں بھی مسٹر مغل کو پیچھے چھوڑنا مقصود تھا۔ ٹی وی اور بی وی سے خوش رہتے ہیں' ٹی وی سے خبریں اور ٹی وی سے کھانے پکانے کی تراکیب سُنتے ہیں--- کھانے پینے کے شوقین ہیں ڈاکٹروں نے ایک سال کیلئے اُن کے من پسند کھانے بند کر دیئے ہیں تو آجکل اُن کی بیگم وہی کھانے زیادہ پکاتی ہیں۔ ''اُف یہ عورتیں!'' انتقام لینے کا کوئی مقصد نہیں چھوڑتیں--- سیاست میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔ محلے کے کونسلر کے امیدوار مسٹر مغل کے کاغذات حرام زدگی--- معاف کیجئے گا' نام زدگی کئی بار مسترد کروا چکے ہیں۔ سیاسی لیڈروں میں چودھری شجاعت حسین کو سب سے زیادہ پسند کرتے ہیں۔ کسی نے اس کی وجہ پوچھی تو بتلایا کہ سارے سیاست دان جھوٹ بولتے ہیں چودھری شجاعت کے علاوہ' کیونکہ اُن کی کہی ہوئی بات کسی کی سمجھ میں ہی نہیں آتی۔

پرنس کشمیری: خود کو پرنس کہنے والے ان کشمیری صاحب کی سوڈا واٹر کی ''فیکٹری'' ہے۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ آجکل شہزادوں پر کیا وقت چل رہا ہے؟--- بہاولپور کے دوسرے شہزادے آصف سہی کے دوست ہیں۔ جب بھی دونوں ملتے ہیں بِل ادا کرنے پر جھگڑا ہوتا ہے۔ چاند کے لکھاری کی حیثیت سے کئی ہزار سندیسے لکھ چکے ہیں۔ دو تین ماہ سندیسے نہ لکھیں تو مضمون یا ہنس بیتی آجاتی ہے۔ مستقل مزاج ہیں اور مستقل مزاجی کا ہی کمال ہے کہ آٹھ سال پہلے جس محبوبہ کی شادی کسی اور سے ہو گئی تھی' اُس کے بچوں کی فوٹو کو اپنے موبائل میں وائل پیپر کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ کھانے میں بھنڈی پسند ہے کہ انگریزی میں بھنڈی کو لیڈی فنگر کہتے ہیں۔ اُن کے کمرے میں ایشوریا' قطرینا اور بپاشا باسو کی تصاویر ان کے پرنس ہونے کی عکاسی کرتی ہیں۔ بقول اُن کے' جو نہ مل سکا اُسی کو مقدر سمجھ لیا--- تونسہ شریف کی لڑکیوں میں بھی اُن تینوں کی خوبیوں ڈھونڈ لیتے ہیں اور اکثر سوڈا واٹر کے پیسے بھی نہیں لیتے۔ سیاست سے دلچسپی اس حد تک ہے کہ آصف سہی کو سیاست میں لے آئے ہیں اور الیکشن میں اُن کا خاصہ خرچہ کروا کر خود کو سیاسی حلقوں میں خوب متعارف کروا دیا ہے۔ موٹر سائیکل ان کی پسندیدہ سواری ہے' کار اس واسطے پسند نہیں کہ چار بندوں کی سواری میں اکیلے بیٹھ کر جانا

پٹرول کا زیاں ہے۔

عصمت ضیاء: محترمہ چاند کی ''ایڈیٹری'' ہیں۔ ہم نے چاند کی کسی لکھاری کو اتنی ترقی کرتے ہوئے نہیں دیکھا' انہوں نے تو باقاعدہ چاند پر گھر ہی بسالیا۔ سندیسوں سے لے کر ''میل ملاقات'' تک کا سفر بڑی تیزی سے طے کیا۔ اس میل ملاقات کے Male خالد بن حامد چیف ایڈیٹر چاند ہیں اور محترمہ اُن کی زوجہ ہیں۔ باتوں کے علاوہ کھانا بھی عمدہ بنالیتی ہیں۔ کریلے گوشت' بھنڈی گوشت' آلو گوشت' گوبھی گوشت' مٹر گوشت' پالک گوشت پکاتے ہوئے بتلاتی ہیں کہ سبزیاں کھانا انسانی صحت کیلئے بہت بہتر ہے' اسی وجہ سے ہانڈی کا سارا گوشت خود ہڑپ کر جاتی ہیں اور شوہر نامدار کو فقط سبزیاں پیش کرتی ہیں تاکہ وہ گوشت کے مضر اثرات یعنی کولسٹرول اور یورک اسٹیڈ وغیرہ سے بچے رہیں--- رشتے بنانے میں ماہر ہیں۔ صرف ایک ماہ کا میل ملاقات ملاحظہ فرمائیں' آپ کو سارے رشتے مل جائیں گے۔ چاچے' تائے' بہن' باجی' بھائی' وغیرہ وغیرہ---عورتوں کے حقوق کی زبردست حامی ہیں اور چاہتی ہیں کہ خواتین کھیلوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں البتہ اُن کو برقعہ پہن کر کرکٹ' ہاکی اور فٹ بال بلکہ تیراکی بھی کرنی چاہیے۔ بقول اُن کے' اگر برقعہ عورت سے اُترے تو مرد کی عقل پر پڑ جاتا ہے۔ فارغ وقت میں صرف مسالہ ٹی وی دیکھتی ہیں اور غور سے سب کھانوں کے پکانوں کی ترکیبیں سمجھتی ہیں اور پھر اُن کو چھوڑ کر سب کچھ عمدہ پکالیتی ہیں۔

غزالہ ثاقب المعروف مس تنقید نگار: کہتے ہیں کہ چور چوری چھوڑ جاتا ہے مگر ہیرا پھیری سے باز نہیں آتا۔ ابرار بخاری پہلے مسٹر تنقید نگار بنے ہوئے تھے' پھر اقرار گناہ کرلیا مگر کہنے والے کہتے ہیں کہ یہ مس تنقید نگار اُن کا ہی دم چھلا ہیں۔ خود کو مس کہتی ہیں اور بقول اپنے' ایک عدد شوہر بھی ہے۔ اگرچہ اپنے نام کے ساتھ پاکستانی لگاتی ہیں جیسا کہ عموماً شادی شدہ خواتین اپنے نام کے ساتھ شوہر کا نام لگاتی ہیں۔ بہرحال تنقید بہترین کرتی ہیں اور بھرپور کرتی ہیں۔ محترمہ کے شوہر کو ان کی تنقید برداشت کرنے پر کسی تمغہ سے نوازا جائے گا۔ سیاست کو بہت بُرا سمجھتی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ساس' بہو سے مسلم لیگ ق والی سیاست کرتی ہے۔ یعنی کہتی ہے کچھ اور ہے اور کرتی کچھ اور ہے۔ سیاست میں اداکارہ میرا اور صائمہ کو پسند کرتی ہیں اور اداکاروں میں شیخ رشید اور چودھری پرویز الٰہی ان کے پسندیدہ ہیں۔ کھانے میں مرغی کی دشمن ہیں۔ چکن جس حالت میں ملے' یعنی چکن کڑھائی' چکن بریانی' چکن پلاؤ' چکن ہانڈی' چکن قورمہ' اُسے فوراً کھا جاتی ہیں۔ جس شے نے بعد میں مرغی بننا ہو اُسے ناشتے میں ہی زہر مار کرلیتی ہیں۔ تمام لوگ اُسے انڈا کہتے ہیں۔ جوتیوں کا جنون کی حد تک شوق ہے۔ جب بھی بازار جانا ہو' جوتی ضرور خریدتی ہیں۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ یہ سب جوتیاں بھی تنقید کے کام آتی ہیں۔ شوہر گھر میں ہیلمٹ پہن کر رہتے ہیں کیونکہ پرہیز علاج سے بہتر ہوتا ہے۔

سیّد نجم الحسن نجم: نجم الحسن صاحب کا تعلق راولپنڈی سے ہے اور سونے پہ سُہاگا کہ شیخ رشید کے حلقے سے ہیں۔ مہذب آدمی ہیں' شیخ رشید کو کبھی ووٹ نہیں دیا۔ موڈی آدمی ہیں لہٰذا لکھتے کبھی کبھی ہیں بلکہ ہڑتال پر بھی چلے جاتے ہیں اور قارئین کی منت سماجت سے واپس بھی آجاتے ہیں۔ پنڈی کے پانی کی نہ جانے کیا تاثیر ہے کہ وہاں کے لوگ چڑچڑے ہو جاتے ہیں مگر موصوف پر اس کا اثر نہیں' شاید منرل واٹر پیتے ہوں---فلمیں دیکھنے کے بہت شوقین ہیں' بیس سال سے سینما میں نہیں گئے۔ سیاست سے بھی بڑا تعلق ہے۔ زندگی میں کبھی ووٹ نہیں ڈالا۔ کہتے ہیں کہ ووٹ امانت ہوتا ہے اور میں لٹیروں کو ووٹ دے کر خیانت کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا۔ خبریں دیکھنے کے دلدادہ ہیں۔ ہر چینل کی ہر خبر' تبصرہ' تنقید دیکھتے ہیں اور پھر سکون آور گولی کھاتے ہیں۔ حالات حاضرہ پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ تمام سیاست دانوں کو فوج میں چلا جانا چاہیے اور سیاست فوج کے حوالے کردینی چاہیے کہ یہی حل ہے ملک میں مستقل سیاسی استحکام کا--- ہم نے تو انہیں یہاں تک کہتے سُنا ہے کہ اگر فون سے کمانڈر ان چیف کا عہدہ ختم کردیا جائے تو پھر کبھی مارشل لاء نہیں لگے گا۔ کھانے میں دال چاول شوق سے کھاتے ہیں لیکن جب سے چاول 125 روپے کلو اور دال 100 روپے کلو ہوگئی ہے' سبزیوں کو پسند کرنے لگے ہیں۔ اس سال پورے روزے رکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ویسے بھی روزے کی افادیت کا پوری قوم کو احساس ہوگیا ہے اور پاکستانی مسلمانوں پر تو سال بھر کے روزے فرض ہونا چاہئے تھے۔

شاہد روف: پولیس اور مزاح دو متضاد باتیں ہیں' پھر بھی ایک ''پولیسیہ'' مزاح کا دلدادہ ہو تو حیرت کی بات تو ہے نا!--- پیشے کے اعتبار سے انسپکٹر پولیس ہیں۔ حیران مت ہوئیے گا' ایم اے پاس بھی ہیں اور لیگل ڈیپارمنٹ میں ہونے کے ناتے تمام ال لیگل باتوں پر نظر رکھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ پولیس کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہوتا مگر کوئی سیاست پولیس کے بغیر نہیں ہوتی۔ پولیس سیاست دانوں کی من پسند چیز ہے۔ ہر MNA اور MPA کی پہلی خواہش ہوتی ہے کہ اُس کا من پسند پولیس افسر اُس کے حلقے میں تعینات ہو جائے--- شاہد روف بڑا شستہ حسِ مزاح رکھتے ہیں۔ ملزم کو بڑی مشکل سے باور کروانا پڑتا ہے کہ پولیس ہی ہے۔ SMS کرنا اُن کو محبوب ترین مشغلہ ہے۔ جب تک سو نہیں

جاتے' SMS کرتے رہتے ہیں۔ صبح نہار منہ ہی SMS شروع کر دیتے ہیں۔ مزاح کے دلدادہ ہیں لہٰذا سیاست دانوں میں بھارتی لالو پرشاد یادیو' پاکستان میں شیخ رشید اور چودھری شجاعت حسین وغیرہ کو فلموں میں دیکھنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں بو برال' امان اللہ کو سیاست میں آنا چاہیے---موصوف کھانا بڑا عمدہ پکاتے ہیں' انڈا تک خود اُبالنا جانتے ہیں اور کئی مرتبہ تو چائے تک خود ہی بنا ڈالی۔ تازہ دودھ پر جان دیتے ہیں' یہ میسر ہو تو کسی اور شے کو منہ لگانا بھی پسند نہیں کرتے۔ گھر میں ذاتی بھینس نہیں ہے اور غیروں کی بھینسوں سے کام چلانا مقدر کی بات گردانتے ہیں۔

امین بابر: رحیم یار خان کے باسی ہیں اور وجہ شہرت ہے جاندار خوبصورت پر مغز ''ماہیے'' ---شاعری کی صنف میں سب سے مختصر صنف ''ماہیے'' ہی ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آزاد شاعری کو خوب ڈائیٹنگ کروائی گئی ہو۔ امین بابر نے اس صنف کو اس لیئے بھی چُن رکھا ہے کہ وہ رج کے کنجوس ہیں۔ اپنے الفاظ کے استعمال میں بھی کنجوسی کرتے ہیں اور چند تختی لائنوں میں مدعا بیان کر دیتے ہیں---سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ ان کی پسندیدہ پارٹی کا نام ہے ''JJON'' یعنی ''جیڑا جتے اودھے نال'' اس مرتبہ تو پیر اپگاڑ کی مسلم لیگ فنکشنل کیلئے کام کرتے رہے کہ انہیں نظر آ رہا تھا' سابقہ ق لیگی حالیہ فنکشنل لیگی جہانگیر خان ترین ان کے حلقے سے جیت جائیں گے سو انہوں نے انہیں جتوا دیا---شاعری کے علاوہ کبھی کبھی نثر بھی لکھتے ہیں۔ عموماً اپنی فطرتی کنجوسی کی وجہ سے سندیسوں پر اکتفار کر لیتے ہیں۔ گرمیوں کے موسم میں تربوز بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ آم کچی لسی کے بغیر نہیں کھاتے۔ کہتے ہیں کہ زیادہ آم سے گرمی ہو جاتی ہے جسے زائل کرنے کیلئے کچی لسی پینا پڑتی ہے چونکہ کچی لسی ٹھنڈی تاثر رکھتی ہے لہٰذا نارمل ہونے کیلئے پھر آم کھاتے ہیں۔ آلو بخارا بالکل نہیں کھاتے' گمان ہے کہ اس کا تعلق بخار سے ضرور ہوگا ورنہ وہ صرف آلو ہی رہ جائے اور سبزی کو پھل کے طور کھانا مغلوں کی شان کے خلاف ہے۔

تنویر پھول: اشعار بنانے کی فیکٹری' اشعار بنانے کا کارخانہ' اشعار بنانے کی مل---جی ہاں' یہ ہیں تنویر پھول جو نہ صرف ہیں چاند بلکہ آداب عرض کے بھی۔ محترم کی ایک ٹانگ کراچی میں ہوتی ہے تو دوسری نیو یارک میں۔ جب وہ کراچی میں ہوتے ہیں تو ہم انہیں تنویر پھول ہی کہتے ہیں اور جب وہ امریکہ میں ہوتے ہیں تو ہم تنویر فلاور کہتے ہیں۔ اس تیز رفتاری سے شاعری کرتے ہیں کہ کراچی سے نیو یارک کی فلائٹ میں ایک نیا بیاض تیار ہو جاتا ہے۔ اردو ادب میں بہت سے اعزازت اور ایوارڈ حاصل کر چکے ہیں۔ محترم کے سب سے بڑے دو مسئلے ہیں۔ پہلا شاعری کی اشاعت کے بعد انہیں 150 غلطیاں نکالنی پڑتی ہیں۔ ہم نے تو کئی مرتبہ چاہا کہ موصوف پروف ریڈر کی اعزازی ذمہ داری سنبھال لیں تا کہ مصور امین کو بعد میں خالد صاحب کی ڈانٹ نہ کھانی پڑے مگر تنویر پھول صاحب کی مصروفیات اس اعزازی ذمہ داری کی راہ میں حائل ہیں' اگرچہ یہی کام انہیں مجبور کرنا پڑ جاتا ہے۔ دوسرا مسئلہ نیو یارک میں پاکستانی کھانوں اور پاکستان میں امریکی کھانوں کا ہے۔ چند ماہ کراچی رہ کر جاتے ہیں تو امریکی کھانا نہیں کھایا جاتا' پھر چھ ماہ میں امریکی کھانے کے عادی ہو جاتے ہیں تو کراچی آنا پڑ جاتا ہے اور اُس وقت پاکستانی مرچوں والے پکوان کھانے میں بڑی دقت محسوس کرتے ہیں۔ امریکی خالص کھانوں سے جو صحت بہتر ہوتی ہے' وہ پاکستانی ملاوٹ زدہ کھانوں سے تباہ ہو جاتی ہے پھر بھی پیار پاکستان سے ہی کرتے ہیں کیونکہ سب سے پہلے پاکستان---!

عظمیٰ احمد: فلم مولا جٹ کا مشہور ڈائیلاگ تھا ''مولا نوں مولا نہ مارے تے مولا نہیں مردا'' ہم کہتے ہیں کہ ''عورت نوں عورت نہ مارے تے عورت نئی مردی'' ---عظمیٰ احمد بھی عورت ہیں اور مضمون بھی عورت پر ہی لکھتی ہیں۔ نہ جانے ان عورتوں کے پاس عورت کے علاوہ کوئی موضوع کیوں نہیں ہوتا؟ تحریر میں بھی اسٹار پلس کا ڈرامہ ہی چلاتی رہتی ہیں۔ لکھاری صاحبہ عورت کو ایسی مخلوق گردانتی ہیں جو خود مظلوم ہے اور ظلم کرتی رہتی ہے۔ ہمیں حیرت ہوئی جب محترمہ کہتی ہیں کہ عورت سے شادی کرنے والے بوڑھے ہو جاتے ہیں مگر کیا وہ عورتیں سدا جوان ہی رہتی ہیں؟---عظمیٰ احمد کھانے میں مرچیں بہت کھاتی ہیں' پھر مرچوں کی دھانس مارنے کیلئے میٹھا کھاتی ہیں لیکن جب بھی مضمون لکھنا ہوتا ہے تو ہری مرچیں تل کر کھاتی ہیں۔ ماں کے بارے میں بہت اچھے جذبات رکھتی ہیں' بشرطیہ وہ اپنی ہی ماں ہو جبکہ عورتیں شوہر کی ماں کو ماں نہیں سمجھتیں' ساس سمجھتی ہیں کیونکہ ساس بھی کبھی بہو تھی۔ عظمیٰ جی کہتی ہیں کہ اکثر عورتیں خوبصورت ہوتی ہیں یا خود کو خوبصورت بنا لیتی ہیں۔ ہمیں اس سے قطعی اختلاف نہیں۔ اگر دنیا کی آدھی مخلوق غلط فہمی میں ہو تو جمہوریت کی رو سے اُسے غلط فہمی نہیں' خوش فہمی کہا جا سکتا ہے---ووٹ ہمیشہ مردوں کو ہی دیتی ہیں۔ بقول اُن کے' عورت کو ووٹ دینے سے ووٹ ضائع ہو جاتا ہے کہ عورت نے آخر کار بچے ہی سنبھالنے ہوتے ہیں۔ عظمیٰ جی کو یہ نہیں پتہ کہ زمانہ بدل گیا ہے اور اب مردوں کی اکثریت بچے سنبھالنے میں لگی ہے۔ محترمہ کی صحت کا موبائیل فون سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ حال ہی میں ان کا موبائیل چوری ہو گیا تو شاید بخار

میں مبتلا ہو گئیں' افاقہ صرف اُسی صورت میں ہوا جب نیا موبائل مل گیا۔

ایلفا اینڈ اومیگا: جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے' موصوف انسان نہیں بلکہ کوئی خلائی مخلوق ہیں اور شاید اسی وجہ سے چاند پر مستقل براجمان ہیں۔ اپنے نام کی وضاحت بھی چاند کی حیاتی ''حیات'' کے طور پر کرتے ہیں۔ پیشے کے لحاظ سے سائنس دان ہیں۔ چوتھی جماعت تک بڑی سائنس پڑھی اور لٹو کے گھومنے پر سائنسی مقالہ بھی لکھا جس میں نیوٹن کو چیلنج کیا گیا ہے کہ کشش ثقل کوئی شے نہیں' اصل شے وہ رسی ہے جو لٹو کو گھماتی ہے۔ مضامین بھی سائنسی لکھتے ہیں۔ حال ہی میں ان کی تحریر ''تین بٹا تین'' شائع ہوئی جس سے اُن کی سائنسی قابلیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کھانے پینے میں بھی سائنسی اصول کارفرما ہیں' ہوا کھاتے ہیں اور غم پیتے ہیں۔ اداکاراؤں میں پسندیدہ اداکارہ صائمہ ہے اور بقول ان کے' جو کھاتی پیتی ہے وہ بدن کو لگتا تو ہے' نا؟--- اداکاروں میں شفقت چیمہ پسند ہیں۔ سواری میں سائیکل پسند ہے کہ اُس میں ہارس پاور نہیں' صرف مین پاور کا استعمال ہوتا ہے۔ آئین اسٹائن کی ٹائم تھیوری پر ہر پل عمل کرتے ہیں کہ انسان اگر ماضی میں چلا جائے تو موجودہ وقت تھم جاتا ہے اِس لئے بارہ سال سے چھٹی کلاس میں ہی ہیں۔ گندم کی شکل' کھیرے کی بناوٹ قطعی پسند نہیں' فقط بھنڈی پسند ہے اور وہ بھی اُس کے انگریزی نام ''لیڈی فنگر'' کی وجہ سے--- کیلے کے چھلکے کو صرف اس لئے ناپسند کرتے ہیں کہ اس سے پھسل کر انسان کشش ثقل کا قائل ہو جاتا ہے۔

سمیرا شاہ اینڈ حمیرا شاہ: بقول مسٹر ڈبکلاں' ریما شاہ اور مدیحہ شاہ اور بقول خود کے' سمیرا شاہ اینڈ حمیرا شاہ بڑی من چاہی رائیٹر ہیں۔ اپنے ناموں میں ''اور'' کی جگہ ''اینڈ'' لگا کر تھوڑی سی ماڈرن ہونے کا تصور بھی پیش کرتی ہیں حالانکہ چاند کے بابائے اُردو پروفیسر ظریف خان انگریزی کے الفاظ اُردو میں استعمال کرنے پر خفا بھی ہو سکتے ہیں۔ جڑواں ہیں اینڈ ایک ہی ہسپتال میں ایک ہی وقت میں پیدا ہوئیں اور پیدا ہوتے ہی اتنا ''ٹوائیں ٹوائیں'' کیا کہ نرسوں کو یاد ہی نہ رہا' بڑی کون ہے اور چھوٹی کون؟ لہٰذا اب دنوں اک دوجے کو باجی کہتی ہیں۔ شاہ رخ خان کو بہت پسند کرتی ہیں' فلمیں سلمان خان کی دیکھتی ہیں جبکہ اخلاق عامر خان کا پسند ہے۔ یہی حال سیاست میں ہے۔ پسند پیپلز پارٹی ہے' ووٹ نواز شریف کو دیتی ہیں اور پروگرام شیخ رشید کے دیکھتی ہیں۔ کھانے میں بھی یہی فارمولا ہے۔ مٹن پسند کرتی ہیں' کھاتی دال چاول شوق سے ہیں۔ گھر والوں کو ایک نئی مشکل آن پڑی ہے کہ لڑکے کون سے پسند کیئے جائیں' منگنیاں کن سے ہوں اور باراتیں کون لے جائیں گے؟--- ان کو جو مدیحہ شاہ اور ریما شاہ کہا گیا تو مسرت گیلانی نے اپنا نام بدل کر مسرت شاہ کر لیا ہے جیسا کہ شاہ رخ خان کے ساتھ ریما کو ایک پروگرام میں شرکت کا موقعہ ملا تو اس کا اصرار تھا کہ اُس ریما خان کہا جائے--- محترمائیں بہت بڑی لکھاری ہیں اکثر خط تک لکھ لیتی ہیں۔ امتحانی کاپی پر صرف اپنا رول نمبر ہی لکھتی ہیں۔

مہر عبدالماجد ڈائنامائیٹ: خود کش حملوں کے اس دور میں کوئی ذہنی شعور خود کو اپنے سرنیم ''ڈائنا مائیٹ'' سے متعارف نہیں کروا سکتا۔ ہمارے معاشرے میں مرد کے نام کا آخری حصہ وہ ہوتا ہے' جس کی محنت سے وہ دنیا میں تشریف لاتا ہے جبکہ خواتین کے نام کا آخری حصہ وہ ہوتا ہے' جس کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو تشریف لانی ہوتی ہے۔ اس ناتے چاند کے یہ عظیم لکھاری ڈائنامائیٹ کی پیداوار ہیں یا پھر ان کی خوبصورتی کی وجہ سے لوگ انہیں ڈائنامائیٹ کہتے ہیں جیسے بازاری زبان میں خوبصورت لڑکی کو ''بم'' کہا جاتا ہے--- بڑے جلد باز ہیں۔ حال ہی میں جلد بازی میں مضمون بھی ''جلد باز'' لکھ مارا۔ پسندیدہ شخصیت میں بھارت کی وہ 71 سالہ خاتون ہے' جس نے 71 سالہ ہونے پر دو جڑواں بچیوں کو جنم دیا ہے اور گنیز بک میں اپنا ریکارڈ درج کروایا۔ پتہ نہیں' موصوف کو اُس خاتون کی کون سی جلد بازی دیکھائی دی؟--- خود کش حملہ آوروں کے پسندیدہ لکھاری ہیں۔ یہاں خود کش سے ہماری مُراد خواتین سے ہے۔ کھانا بھی بہت جلدی میں کھاتے ہیں۔ اکثر روٹی کھانے کے بعد انہیں احساس ہوتا ہے کہ سالن تو پڑے ہی رہ گئے ہیں۔ ناشتے میں فرائی میزائل' لنچ میں توپ کڑاہی اور رات میں بم بریانی شوق سے لیتے ہیں۔

نوید ظفر کیانی: بلاشبہ چاند کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ راقم الحروف بچپن سے ان کی مزاحیہ شاعری سے محظوظ ہوتا چلا آرہا ہے۔ مزاحیہ اشعار بنانے کی باقاعدہ فیکٹری ہیں اور خام مال سے مالا مال ہیں۔ پیشے کے اعتبار سے شاید لوہار ہیں اور ہر قسم کے اشعار کی ٹانگ توڑ مروڑ دیتے ہیں اور جب ٹکریں مارنے پر آتے ہیں تو خوب خوب ''ٹکریں'' مارتے ہیں۔ لوگوں سے بہت کم مخاطب ہوتے ہیں' کبھی کبھار خط کے ذریعے بولتے ہیں مگر خوب بولتے ہیں۔ کھانے میں پھل کھانے کے بڑے شوقین ہیں' خوب پھل کھاتے ہیں مگر فقط ایک پھل' ایک عدد سے زیادہ نہیں۔ یعنی ایک عدد سے تجاویز نہیں کرتے خواہ وہ انگور' جامن' آلو بخارا' خوبانی ہی کیوں نہ ہو' روٹی اور بوٹی پر بھی یہی فارمولا اپلائی ہوتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے ماشاءاللہ صحت اچھی ہے اور شاعری بھی--- ووٹ ہمیشہ فضل الرحمٰن کی جمعیت اسلام کو دیتے ہیں

حسن کا کوئی امیدوار ان کے حلقے سے کھڑا نہیں ہوتا۔ شاید اسی وجہ سے یہ صرف حلوے کی دیتے ہیں' ایک چمچ خود بھی کھا لیتے ہیں۔ TV دیکھنے میں بھی دین اور دنیا کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ QTV کے علاوہ ''ہم سب امید سے ہیں'' ذوق اور شوق سے دیکھتے ہیں۔ موٹر سائیکل پسندیدہ سواری ہے۔ آجکل اس چکر میں ہیں کہ کسی طرح موٹروے سائیکل کی طرح' بیوی بھی CNG پر کنورٹ ہو جائے۔ ہابی ماچس کے ڈبیاں جمع کرنا ہے۔ اب تک لاکھ کی تعداد ہو چکی ہے اور کتنے سگریٹ پیتے ہوں گے' آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔

خادم حسین مجاہد: بقول پیر جنگلی کے' عورت کا مزاج پر بڑا بُرا اثر ہوتا ہے' جب تک ان موصوف کی شادی نہیں ہوئی تھی' چاند میں خوب خوب لکھا کرتے تھے۔ ہماری کم نصیبی کہ آٹھ سال قبل اُن کے ہاتھ نیلے --- معاف کیجئے گا' پیلے ہو گئے۔ چاند کا ایک باغی گروپ تھا جس میں ارشاد العصر جعفری اور موصوف ہوا کرتے تھے' موصوف تو پھر بھی واپس آ گئے مگر جعفری صاحب نے علمِ بغاوت جاری رکھا ہوا ہے --- خادم صاحب اپنی بیگم کے خادم ہو چکے ہیں اور جب زیادہ فلسفہ بولتے ہیں تو آداب عرض جیسے سنجیدہ پرچے میں لکھا کرتے ہیں۔ چاند میں جب بھی آتے ہیں (شاید اُن دِنوں بیگم میکے گئی ہوئی ہیں) خوب آتے ہیں۔ اِن کا ایک مشہور واقعہ ہے۔ ایک روز ناشتے میں بیگم سے بولے کہ دیکھو' یہ اُبلا ہوا ایک انڈا ہے۔ میں فلسفے کی رو سے ثابت کر سکتا ہوں کہ یہ ایک نہیں دو انڈے ہیں --- بیگم نے اطمینان سے وہ انڈا اُٹھایا اور کھاتے ہوئے بولیں کہ یہ انڈا تو میں کھا لیتی ہوں' فلسفے والا دوسرا انڈا آپ تناول کر لیں --- بڑے لکھاری ہیں اِس لئے سیاسی نعرے بھی لکھتے ہیں ''دیکھو دیکھو کون آیا' شیر آیا شیر آیا'' بھی موصوف کی تخلیق ہے۔ ووٹ ہمیشہ پیپلز پارٹی کو دیتے ہیں۔ کھانے میں بھنڈی گاجر' پالک' شلغم' کریلے و دیگر سبزیوں شوق سے کھاتے ہیں جو کہ اُن کے ذاتی کھیت --- معاف کیجئے گا' ذاتی دوکان کی پیداوار ہیں۔

سیما جان: چاند کی واحد ''شی میل'' (ہجڑا) ہونے کی وجہ سے ان کا ایک الگ مقام ہے' وہی مقام جو ''آج ٹی وی'' میں بیگم نوازش علی کا ہے۔ بہت سے دلوں پر راج کرتی ہیں۔ راقم الحروف کی' کے دوست ہیں اور حکیم عنایت اللہ شاہد کیلئے روح کا عذاب کیونکہ وہ چاہتے راقم کو ہیں اور حکیم جی اُن کو۔ مابدولت اُن کا نام ہمیشہ علیحدہ کر کے لیتے ہیں یعنی سیما علیحدہ اور جان علیحدہ۔ اس پر محترمہ' محترم بہت خوش ہوتی' ہوتے ہیں۔ حکیم جی نے تو اپنی وصیت میں اپنی تمام جائیداد یعنی چارپائی' سائیکل اور چند حسینوں کے خطوط اُن کے نام کر رکھے ہیں' موصوفہ کی شاعری اپنے شکیل عادل جیسی ہے جو اکثر SMS کے ذریعے ہمیں ارسال کرتی رہی۔ رہے ہیں۔ چاند میں خاصی رونق جماتی' جماتے ہیں۔ ہو سکتا ہے' بیگم نوازش علی کی طرح یہ بھی کسی ٹی وی چینل پر دِکھائی دیں اور حکیم جی نے تو قسطوں پر TV ابھی سے آڈر کر دیا ہے۔ سیما جان بے حد حسین ہیں اپنے پرنس کشمیری کی طرح۔ اگر وہ صرف لڑکا ہوتیں تو نقص امن کے خطرے کو مدنظر رکھ کر صوبہ ''پختون خواہ'' میں اُن کے داخلے پر پابندی ہوتی اور صرف لڑکی ہوتیں تو شاید (خاکم بدہن) عصمت ضیاء سے پہلے خالد صاحب کی نظر کرم ان پر ہو چکی ہوتی ورنہ ''میں تھا نا!'' --- ''شی میل'' کی حیثیت سے حکیم جی کو مبارک ہوں۔ کاش' کہ ہم بادشاہ ہی ہوتے تو سیما --- جان کو اپنے حرم سراء کا دربان لگا دیتے۔ کسی فیکٹری میں ''کام'' کی وجہ سے آجکل اُن کے پاس لکھنے کا ٹائم نہیں ہے۔

حکیم عنایت اللہ شاہد: موصوف چاند کے بڑے لکھاری ہیں' اب تک ہزار خط لکھ چکے ہیں۔ تعریف بھی اسی طرح کرتے ہیں جیسے طنز کر رہے ہوں۔ ان کے خطوط میں بڑی حکمت ہوتی ہے اور اکثر مریضوں کو نسخے کی جگہ خطوط ہی لکھنا شروع ہو جاتے ہیں۔ عرصہ دراز سے آئیڈیل کی تلاش میں ہیں' موصوف کا آئیڈیل سیما جان ہیں۔ کہنے والے کہتے کہ سیما جان ایک حسین لڑکا تھیں' حکیم جی کی مردانہ طاقت کی ادویات کھا کر ''شی میل'' بن گئیں --- اپنی ادویات خود بھی کھاتے رہتے ہیں' اب اولاد کی تمنا ہے۔ کھانا نہیں کھاتے' اپنی معجونین ہی تناول فرماتے ہیں۔ ذاتی کھیت ہیں' اُن کو قدرتی کھاد بھی خود ہی فراہم کرتے ہیں البتہ ایسا کرتے وقت امریکن سُنڈی سے بچاؤ کا اہتمام ضرور کرتے ہیں۔ سیاست میں بڑی دلچسپی ہے۔ ان کے اکثر مریض MNA اور MPA کے الیکشن میں اپنی ضمانتیں ضبط کروا چکے ہیں۔ سارے شہر کو پولیو کے قطرے پلاتے ہیں' خود کبھی نہیں پیئے۔ سائیکل چلانا نہیں آتا اس لئے ون ڈانکی پاور کی سواری لے رکھی ہے۔ چاند کی رونق ہیں۔ عصمت ضیاء کو تو ایسے نسخے بھی لکھ بھیجتے ہیں جن میں شوہر کی کار ہتھیانے کے آسان طریقے درج ہوتے ہیں۔ مفید مشورے مفت نہیں دیتے۔ جمعرات کو حکمت کدہ سارے دن کھلا ہوتا ہے' ذاتی معالجہ ہومیو پیتھک سے کرواتے ہیں۔ خود کہتے ہیں کہ نیم حکیم خطرہ جان ہوتا ہے خواہ وہ جان' سیما جان ہی ہو۔

صائمہ کشمش: نئے پڑھنے والے اس بارونق چاند کی لکھارن سے آجکل کم واقف ہیں کیونکہ یہ کئی سالوں بعد پھر جلوہ گر ہوئی ہیں۔ بڑی دھان پان سی شخصیت ہیں اور پتہ نہیں' انہیں کھانے کو کیوں نہیں دیا جاتا۔

پیشے کے اعتبار سے ''کمپوڈر'' ہیں۔ ہر دوا تیار کرتے وقت باقاعدہ چکھ کر دیکھتی ہیں' پروفیسر ظریف خان کے بعد سب سے باریک لکھائی محترمہ کی ہی ہے' شاید اس کی وجہ یہی ہے کہ کاغذ بہت مہنگا ہو گیا ہے اور مادام ڈاکٹری نسخے کی چھوٹی سی پرچی پر ہی مضمون لکھنے بیٹھ جاتی ہیں--- دشمنی اونٹ جیسی رکھتی ہیں' یعنی کبھی دشمن کو نہیں بھولتیں۔ دوستوں کو اکثر بھول جاتی ہیں اور کئی بار تو راقم کو للکار چکی ہیں۔ ہمارا مشورہ ہے کہ محترمہ گلوکوز پیا کریں کیونکہ ''بزک'' بھی اُن کے منہ سے سیٹی کی آواز کی صحت سنائی دیتی ہے--- بڑی نفیس خاتون ہیں ''آداب عرض'' میں ہمیشہ سے صائمہ نفیس بن کر لکھا۔ کھانے میں برگر بہت پسند ہیں حالانکہ برگر فیملی سے تعلق نہیں۔ بیمار شاد بھی خوب رہیں کہ ڈاکٹر فیملی سے تعلق ضرور ہے۔ سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں' شاید اسی لئے عمران خان پسندیدہ سیاست دان ہیں' جن کو الیکشن میں ووٹ دینے بھی چلی گئیں' بعد میں پتہ چلا کہ انہوں نے بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ لاہور کی نیو خان بسوں سے بڑا پیار ہے۔ سارا دن انہیں میں سفر کرتی ہیں' کنڈیکٹر نہیں ہیں۔

نثار احمد: ہونے والے صاحب کتاب ہیں' یعنی ڈیڑھ سو صفحات کی کتاب لکھ رہے ہیں اور پورے تین صفحات تو مکمل بھی کر چکے ہیں۔ ویسے بھی اپنے پیسے کو آگ لگانے کا پُروقار طریقہ یہی ہے کہ آپ کتاب لکھ ڈالیں--- اپنے نام کو دادو (سندھ) کے بغیر نہیں لکھتے' مبادا قاری یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ دادو اسلام آباد میں ہے۔ سندھی پر بڑی قدرت رکھتے ہیں' گھر کا بچہ بچہ فراوانی سے سندھی بریانی کھا لیتا ہے۔ ان کی پسندیدہ خوراک میں پلو مچھلی اور اس کی ''آنی'' ہے۔ شکار پور کا اچار دادو میں ہی بنا لیتے ہیں اور پھر اُسے شکار پور کا اچار کہہ کر فروخت کرتے ہیں۔ اسلام آباد میں جب بھی نمائش لگتی ہے' موصوف شکار پوری اچار کا اسٹال ضرور لگاتے ہیں۔ ہم سے تو انہوں نے آج تک کبھی پیسے ہی نہیں لئے بلکہ بعد میں حساب میں لکھا' چار چار چوری ہو گئے۔ دادو (سندھ) کی دوسری شے جو مشہور ہے' وہ ہیں وہاں کے ڈاکو' ایک مرتبہ تو موصوف کو بھی اغوا کر کے لے گئے تھے مگر بعد میں اُلٹا ڈاکوؤں نے جرمانہ ادا کر کے ان سے جان چھڑائی--- آلو گوشت' پالک' پلاؤ بڑے شوق سے کھاتے ہیں اگر وہ پڑوس سے آئے ہوں۔ لوگ انہیں ''اداسائیں'' (بڑا بھائی) کہتے ہیں' اب محبوبہ بھی اسی نام سے پکارے تو اس میں ہمارا قصور نہیں ہے۔ اپنی کتاب پر راقم سے تعریف نامہ (دیباچہ) لکھوانا چاہتے ہیں' ہم تیار ہیں بشرطیکہ اُسے کتاب میں نہ چھاپا جائے۔

مسٹر ڈبکلاں: چاند میں بہت سے ایسے عظیم لکھاری ہیں جن کو اپنا اصل نام بھی لکھنا نہیں آتا۔ سعید خان کو غلط فہمی ہوئی کہ صلاحیتوں سے زیادہ نام کا اثر ہوتا ہے تو وہ رنگیلا بن گئے' رفیع خاور کو ایسی غلط فہمی نے ننھا بنا دیا اور مسٹر ڈبکلاں بھی اسی بیماری میں مبتلا ہیں حالانکہ مشتاق یوسفی' ڈاکٹر یونس بٹ' اطہر شاہ خان' کرنل محمد خان سے ہیں۔ کسی نے یہ بیکار حرکت نہ کی اور بڑا نام کمایا۔ کسی ڈبکلاں کو ہم نے نام کماتے نہ دیکھا' سوائے ان محترم کے--- خیر' صاحب! نام میں کیا رکھا ہے؟--- جب تک موصوف کے پلک میں کچرا آیا ہوا تھا' وہ اتنا نہیں لکھتے تھے۔ اب ماشاء اللہ فل اسپیڈ میں چل رہے ہیں۔ مزاح لکھنے کے علاوہ موصوف نے لومز لگا رکھی ہیں اور جب بھی لوڈشیڈنگ ہوتی ہے' لکھنے بیٹھ جاتے ہیں اور چونکہ بجلی کا آنا' بجلی کے جانے سے کم ہے لہٰذا خوب خوب لکھ رہے ہیں۔ دیسی کھانوں کے بہت شوقین ہیں بشرطیکہ یہ دیسی کھانے بدیسی ہوں۔ برگر' رول پراٹھا' پیزا' چکن شاسلک وغیرہ جہاں ملے' جتنا ملے' ہڑپ کر جاتے ہیں۔ بارش کا موسم بہت پسند ہے' اکثر برسات میں باہر نکل آتے ہیں۔ مینڈک پسندیدہ جانور ہے۔ چڑیا گھر جانے کے بہت شوقین ہیں' اپنوں سے مل کر مسرور رہتے ہیں۔ بڑے ادب سے گفتگو کرتے ہیں' محبوبہ کو بھی ''بہن جی'' کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ اسی وجہ سے ''گنگا رام' اب تک کنوارہ رہ گیا ہے۔

شاہد اطہر: جی ہاں' راقم الحروف کا یہی نام ہے--- چاند کی دنیا میں سب سے زیادہ صفحات کالے کرنے کا اعزاز رکھتے ہیں' حادثاتی طور پر لکھاری بنے اور اپنے کتے پر مضمون ''لے پالک'' لکھ دیا۔ کرم فرماؤں نے تھوڑی سی تعریف کیا کر دی' پھر چاند کی جان نہیں چھوڑی--- زندگی میں اتنی غلطیاں کیں کہ گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں نام آ سکتا ہے۔ سب سے پہلے چاند میں اپنے پوتے کی تصویر اپنے نام سے شائع کروا دی اور پھر کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔ قدرت نے بولنے کی صلاحیت نہ دی لہٰذا فون پر بات نہیں کر سکتے' صرف SMS کر سکتے ہیں' خود کو ڈبل MA/LLB کہتے ہیں--- جی ہاں' چار مرتبہ آٹھویں جماعت پاس کی ہو تو بندہ دو مرتبہ MA تو ہو جاتا ہے نا!--- ترقی معکوس کی عمدہ مثال ہیں۔ 25 سال امریکن کمپنی میں عیش کی' اب حلیم کی ریڑھی لگانے کی سنجیدہ کوشش کر رہے ہیں۔ خود لکھنا نہیں آتا' یہ تو اُن کی بےغم کی مہربانی ہے جو وہ لکھ دیتی ہیں۔ سب سے بھاری وہ دن تھا جب حسین لڑکی نے انکل کہہ دیا اور خودکشی کے کئی منصوبے بے عمل رہے' پھر جب لڑکی کی ماں نے بھی انکل کہہ دیا تو خود کو مردہ سمجھ کر بے حس بنے رہے--- کھانا خوب پکاتے ہیں' اسی وجہ سے اُسی ''بے غم'' نے تادم تحریر گھر میں رکھا ہوا ہے۔

☆☆

ماڈرن مرزا صاحبہ

☆ محمد ارشد سعید

مرزا اپنے فلیٹ میں لیٹا ابن صفی کا ناول ''عمران کا بنگلہ'' پڑھ رہا تھا کہ اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

''ہیلو! مرزا اسپیکنگ'' اُس نے رسیور اُٹھا کر بھاری آواز میں کہا۔

اُس کی آواز میں بھاری پن ناول کا پہلا ہی باب پڑھ کر ہو گیا تھا۔

''ہائے مرزا! تم کتنے کٹھور ہو گئے ہو---'' دوسری طرف سے صاحباں کی مترنم آواز سنائی دی۔ ''وہ بھی کیا دِن تھے جب تم ہمارے گھر کی برابر والی چھت پر بانس لٹکا کر لٹک کر آ جایا کرتے تھے' روز مجھے ملا کرتے تھے اور اَب جبکہ تم کو بس' رکشہ' ٹیکسی غرضیکہ ہر چیز کی سہولت ہے بلکہ خود تمہارے پاس وہ کھٹارا سی فیٹ بھی موجود ہے' پھر بھی تم ہفتوں شکل نہیں دِکھاتے۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں' مجھے تو تمہارا عشق جھوٹا لگتا ہے---؟''

''صاحباں!'' مرزا نے اِس طویل تقریر کا فیتہ درمیان میں سے کاٹتے ہوئے کہا۔ ''تم تو جب بھی فون کرتی ہو لڑائی کرتی ہو۔ تم نے ہمیشہ میرے عشق پر شک کیا ہے' یہ کوئی نئی بات نہیں لیکن کیا کبھی تم نے پوچھا کہ مَیں کن مشکلات کا شکار ہوں---؟'' مرزا نے جلدی سے ایک ہنگامی سانس لیتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ''تمہیں کیا معلوم تنہا رہنا کتنا عذاب ہے۔ جب ہوٹل میں کھانا کھاتے وقت پلیٹ سے مکھی نکل آتی ہے تو کیا حالت ہوتی ہے اور کہ تمہیں کیا معلوم کہ ہر مہینے کی دو تین تاریخ کو جب مالکِ مکان کرایہ وصول کرنے کے لیے دروازہ توڑتا ہے---'' مرزا کا لہجہ دردناک ہو گیا۔

''تبھی تو کہتی ہوں مجھے بیاہ کر لے جاؤ' یہ سارے مسئلے ختم ہو جائیں گے۔'' صاحباں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

''کون کہتا ہے مسئلے ختم ہو جائیں گے---'' مرزا نے غصہ سے کہا۔ ''مکھی ہوٹل کے کھانے میں نہ سہی گھر کے کھانے میں نکلا کرے گی اور تمہارے موجودہ ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے خطرہ ہے کہ کھانا ہوٹل سے بھی بدمزہ ہوا کرے گا۔ ہوٹل میں تو پھر بھی سالن میں مکھی نکل آئے تو بیرا دوسری پلیٹ لا دیتا ہے۔ اندیشہ ہے کہ شادی کے بعد تمہارے کھانے میں اِس قسم کا اعتراض کیا تو تم پلیٹ منہ پر ہی مار دو اور یہ اعلان نہ کر دو کہ مَیں نے مکھی خود سالن میں ڈال کر درحقیقت تمہاری خلاف ایک ازدواجی سازش کی ہے۔''

''مرزا! میری بات تو سنو۔'' صاحباں بولی۔

مرزا نے اُس کی بات پر قطعاً توجہ دیئے بغیر اپنی بات جاری رکھی گویا اُسے اندیشہ ہو کہ اگر اُس نے صاحبان کو بولنے کا موقع دیا تو وہ خود ترستا ہی رہ جائے گا۔ اِس مرتبہ تو وہ پہلے سے بھی مختصر سانس لیتے ہوئے بولا۔

''---اور جہاں تک مالکِ مکان کا مسئلہ ہے تو تمہارا خیال ہے کہ وہ تمہاری من موہنی صورت دیکھنے کے بعد ہر ماہ دروازہ بجانا چھوڑ دے گا؟ میرا تو خیال ہے کہ پھر وہ بہانے بہانے سے اور بھی تواتر سے دروازہ بجائے گا۔ اگر کسی طرح یہ مسئلہ حل ہو بھی گیا یعنی تمہارے کنجوس گھر والوں نے جہیز میں ایک عدد مکان دے کر حاتم طائی کو سخاوت کے اولمپکس میں شکست دینے کی کوشش کر بھی ڈالی تب بھی اگر مسائل شروع ہو جائیں تو وہ ٹی وی کی کسی بور سیریل کی طرح ختم ہونے میں نہیں آئے حتیٰ کہ مرزا بیچارہ ختم ہو جائے گا۔''

''مرزا! مَیں تو کہہ رہی تھی---''

مرزا زبردست روانی میں تھا' اُس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

''اگر ہماری شادی ہو گئی تو اِس کے بعد تو تم ہی مستقلاً بولا کرو گی اِس لیے فی الحال مجھے بولنے دو۔ فل ٹائم کے ساتھ ساتھ مَیں نے پارٹ ٹائم جاب بھی کر لی ہے اِس لیے وقت نہیں ملتا۔''

اِس موڑ پر صاحباں کو کسی نہ کسی طرح بولنے کا موقع مل گیا۔

''تم پیسوں سے شادی تو نہیں کر رہے' تم مجھ سے شادی کر رہے ہو۔ ہم تو عاشق لوگ سودائی ہیں' مرزا!''

مرزا طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''شادی سے پہلے ساری لیلائیں'

شیریاں اور سسیاں یہی کہتی ہیں لیکن شادی کے بعد اگر زندگی میں لپ اسٹک کی کمی رہ جائے تو ہاتھ پر ہاتھ مار کر کہتی ہیں کہ ہائے' میری تو قسمت ہی پھوٹ گئی تھی جو اس نکھٹو کے پلے بندھ گئی۔ تم بھی یہی کہو گی نا!"

"ہائے مرزا! ایسی اُمید رکھتے ہو مجھ سے؟" صاحباں روہانسو ہو گئی۔

"تو اور کیا' اس کی شر پسندانہ حرکتیں حسب معمول جاری ہیں۔" مرزا برہمی سے بولا۔ "مَیں تمہیں یہ بتانے لگا تھا کہ آخر مَیں بھی انسان ہوں' میری قوت برداشت کب تک میرا ساتھ دے گی۔ تمہیں معلوم ہے کہ میرا ریوالور کا نشانہ کیسا ہے اور مَیں نے اَب تک ریوالور تھانے میں بھی جمع نہیں کروایا۔ ضرورت پڑی تو سات کے سات بھائیوں کو قطار میں کھڑا کر کے ایک ہی گولی سے ٹھنڈا کر دوں گا۔" مرزا غصہ سے بولا۔

"ہائے ہائے' مرزا! تم کیسے تشدد پسند ہوتے جا رہے ہو اور تشدد پسندی میں ایسی کفایت شعاری۔ سات گولیوں کی جگہ ایک گولی۔" صاحباں نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔ "لیکن سوچو وہ بھی میرے بھائی ہیں' مَیں اُن کے ساتھ کم از کم اِس قسم کا سلوک پسند نہیں کروں گی جیسا تم نے کہا ہے۔ زیادہ سے زیادہ مَیں تمہیں جودو کراٹے کا ایک آدھ ہلکا پھلکا داؤ استعمال کرنے کی اجازت دے سکتی ہوں۔ وہ بھی اِس صورت میں کہ جب سب بھائی تمہیں گھیر لیں۔ تمہیں مجنوں کی مثال سے سبق لینا چاہیے۔ وہ کس قدر سعادت مند تھا' لیلیٰ کے گھر والے اِس کی جب چاہتے لاتوں' مکوں اور تھپڑوں سے تواضع کر ڈالتے تھے اور وہ اُف بھی نہ کرتا تھا۔ وہ تو لیلیٰ کے کُتے سے بھی پیار کرتا تھا۔"

"صاحباں! وہ اِس لیے خاموشی سے مار کھا لیتا تھا کہ اِس کی صحت کمزور تھی۔ مَیں مجنوں جیسا ڈیڑھ پسلی کا عاشق نہیں ہوں اور پھر دوسری بات یہ کہ لیلیٰ مجنوں کی اور ہماری لو اسٹوری پڑھ پڑھ کر لوگ کیا یونہی بور ہوتے رہیں گے؟"

جن کی بیٹی

لب اس گل سیمیں کے جو یاقوت ہوئے ہیں
لڑکوں کے لئے وہ ترے تابوت ہوئے ہیں
تجھ کو جو ہے دیکھا تو اثر اتنا نہیں ہے
ابا کو ترے دیکھ کے مبہوت ہوئے ہیں

سید فہیم الدین، دوحہ قطر

"اچھا یہ ساری بحث چھوڑو---" صاحباں بولی۔ "یہ بتاؤ کہ اَب کہیں ملو گے بھی یا فون پر ہی اتنی لمبی لمبی باتیں ہوتی رہیں گے' اِس طرح کب تک گزارہ ہوگا؟ تمہیں دیکھنے کو اَب تو آنکھیں ترس گئی ہیں۔"

"اچھا تو ایسا کرو کل شام پانچ بجے سے چھ بجے کے درمیان طارق روڈ والے شیزان میں آ جاؤ' میں تمہارا انتظار کروں گا۔" مرزا نے نیم دِلی سے کہا کیونکہ اُس کا علم تھا کہ دفتر سے چھٹی لینے کے بعد پانچ چھ سو روپے خرچ ہو جائیں گے۔

"ٹھیک ہے مَیں پہنچ جاؤں گی۔" صاحباں نے بڑی شرمساری سے کہا اور فون بند کر دیا۔

مرزا تقریباً چھ بجے شیزان پہنچ گیا۔ صاحباں ابھی تک نہیں آئی تھی۔ اُس نے پانچ منٹ انتظار کیا' اِس دوران تین گلاس ٹھنڈا پانی پیا۔ ابھی وہ اندازہ لگا ہی رہا تھا کہ صاحباں آئے گی بھی کہ نہیں کہ صاحباں جھٹکے سے دروازہ کھول کر بار میں داخل ہوئی۔ اِس نے اسکائی بلیو ساڑھی کے ساتھ زرتار پھولوں والا بلاؤز پہنا ہوا تھا اور بالوں کے جوڑے میں موتیے کے گجرے سجا رکھے تھے۔ گلے میں ڈائمنڈ لاکٹ تھا اور پیروں میں میچ کرتے جوتے۔

"اُف' آج تو قیامت لگ رہی ہو قیامت!" مرزا نے والہانہ انداز سے کہا۔

"بس بس زیادہ رومانٹک ہونے کی کوشش نہ کرو' ویٹر ہماری طرف دیکھ رہا ہے۔"

"پورے پون گھنٹے سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔" مرزا نے شکوے سے کہا حالانکہ اُسے آئے ابھی پانچ منٹ ہی ہوئے تھے۔

"مَیں تو بڑی دیر سے آنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن شمیر کو شاید شک ہو گیا تھا کہ مَیں تم سے ملنے آ رہی ہوں۔ وہ گھر سے ٹل ہی نہیں رہا تھا حالانکہ اِس کی ڈیوٹی کا ٹائم تھا۔ بڑی مشکل سے وہ گھر سے رُخصت ہوا تو مَیں جلدی جلدی تیار ہو کر بھاگی آئی ہوں۔"

"اچھا یہ بتاؤ کیا کھانا پینا ہے؟" مرزا نے حاتم طائی اسٹائل کی مسکراہٹ ہونٹوں پر لاتے ہوئے کہا حالانکہ دھڑکن اِس خوف سے تیز ہو گئی تھی کہ صاحباں کہیں سینڈوچز' فنگر فش یا کسی مہنگی چیز کی فرمائش نہ کر دے۔ اُس کی جیب میں صرف ہزار روپے کا نوٹ تھا اور اُسے ابھی کار میں پٹرول بھی ڈلوانا تھا۔

"مَیں تو آج کل ڈائیٹنگ کر رہی ہوں---" صاحباں نے بڑی متانت سے کہا۔ "میری سہیلیوں نے احساس دلایا ہے کہ مَیں موٹی ہوتی جا رہی ہوں۔ میں کچھ نہیں کھاؤں گی میرے لیے تو صرف ایک بلیک

کافی منگوالو۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اپنے سراپے کا جائزہ لینے لگی۔

مرزا نے دِل ہی دِل میں خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں موٹاپے سے بچنا بے حد ضروری ہے' صاحباں!'' حالانکہ کسی بھی اعتبار سے مرزا کو وہ موٹی نظر نہیں آ رہی تھی لیکن وہ سوچ رہا تھا کہ لڑکیوں کا موٹاپے سے خوف زدہ رہنا اِن کے چاہنے والوں کی جیب کے لیے سود مند ہے۔

''اچھا مَیں تم سے ضروری بات کرنے آئی تھی کہ میرے گھر والے میری شادی طے کر رہے ہیں' اَب کیا ہوگا؟'' صاحباں نے بڑے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

مرزا کو ایک زوردار چھینک آ گئی۔ شادی کی خبر اُس کے لیے غیر متوقع نہیں تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ تقریباً ہر محبت کا یہی انجام ہوتا ہے۔ اِس کے باوجود اُسے کافی دُکھ ہوا اور پھر یہ اَنا کا مسئلہ بھی تھا۔

''تمہاری شادی میرے علاوہ دُنیا کے کسی مرد سے نہیں ہوسکتی۔'' مرزا نے گولڈ لیف کے آخری سگریٹ کا کش لیتے ہوئے بڑے اعتماد سے کہا۔

''تم اِسی اطمینان سے بیٹھے رہنا' وہاں گھر والوں نے مجھ سے چوری چوری نہ جانے کیا کیا معاملات بھی طے کر لیے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی روز اچانک تم میرے گھر کے سامنے سے گزرو تو وہاں شامیانے لگے ہوئے ہوں اور لوگ زردہ پلاؤ اُڑا رہے ہوں اور تم کوئی سیڈ سونگ ہی گاتے رہ جاؤ مثلاً ''محبت کا جنازہ جا رہا ہے'' یا ''بچپن کی محبت کو دِل سے نہ جدا کرنا'' وغیرہ وغیرہ۔''

مرزا خاموشی سے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے اِس کی طرف دیکھتا رہا۔ صاحباں گویا اُس کی غیرت کو جگانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

''ابھی سے کچھ کرلو' کچھ سوچ لو۔ اِس سے پہلے کہ چڑیاں کھیت چگ جائیں۔''

''تم پرواہ نہ کرو' صاحباں!'' مرزا پُرسکون لہجے میں بولا۔ ''مَیں کوئی کاہل عاشق نہیں ہوں جو صرف سیڈ سونگ پر ہی گزارہ کروں' مَیں تمہیں سماج کے ہاتھوں سے چھین لینے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔'' وہ گویا آج تمام تر جرأت مندی کا اظہار کرنے پر تلا ہوا تھا۔

''ٹھیک ہے تو پھر تم ہر قسم کی صورتِ حال کے لیے تیار رہنا۔ بس اَب مَیں چلتی ہوں' یہی ضروری بات بتانے کے لیے آئی تھی۔'' صاحباں نے بلیک کافی ختم کرتے ہوئے کہا۔

''بیٹھو ایسی بھی کیا جلدی ہے۔''

''نہیں میرا جانا ہی بہتر ہے۔ تمہیں معلوم نہیں جب سے میرے بھائی ثمیر نے پولیس میں نوکری کی ہے تب سے اُس کی طبیعت بڑی کھوجی ہوگئی ہے۔ ہر وقت تیری ٹوہ میں لگا رہتا ہے۔''

''اچھا خیر' دیکھوں گا اُسے بھی۔'' مرزا نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔

ویٹر بل لے آیا۔ مرزا نے بل کی ادائیگی کی۔ قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ ٹپ کے پیسے پلیٹ میں چھوڑے اور باہر آ گیا۔ باہر آ کر اُس نے صاحباں کو خدا حافظ کہا اور وہ اپنی مرسڈیز میں بیٹھ کر رُخصت ہوگیا۔

مرزا اپنے گاؤں جانے کے لیے سوٹ کیس میں کپڑے رکھ رہا تھا' کل گاؤں میں اُس کی بہن کی شادی تھی۔ شادی میں شریک ہونے کے لیے اُس نے بڑی کفایت شعاری سے کام لیتے ہوئے کچھ تحفے خریدے تھے اور کچھ نقد رقم بھی جمع کی تھی۔ دفعتاً فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔

''ہیلو' مرزا اسپیکنگ۔'' اُس نے سوٹ کیس بند کر کے رسیور اُٹھا

گدھے سے بڑا گدھا

جونہی یوری آسٹن نے مریخ پہ قدم رکھا، اسے سامنے ہی ایک وحشی ننگ دھڑنگ اپنی طرف آتا نظر آیا۔

''اوہ، تو یہاں بھی ٹارزن پایا جاتا ہے؟'' یوری نے پوچھا۔

''تم زمین سے آئے ہو، نا!'' ٹارزن نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے پوچھا؟

''ہاں---مگر تمہیں کیسے پتہ چلا؟'' یوری آسٹن نے حیرانی سے کہا۔

''یہ دیکھو، ایک مائیکرو راڈار ہمارے عقلمند الو نے ایجاد کیا ہے۔ تم جونہی ہمری حدود میں آئے، ہمیں پتہ چل گیا۔'' ٹارزن نے اسے ایک لمبا آئینہ دکھایا۔

''اچھا تو یہ مائیکرو راڈار ہے---اور کیا کچھ ایجاد کیا ہے تم لوگوں نے؟''

''یہ دیکھو، یہ کمپیوٹر ہے---1000z ماڈل ہے، اس سے آگے ہماری سائنس رکی ہوئی ہے''

یوری آسٹن نے دیکھا کہ ایک خالی مانیٹر پڑا تھا۔

''اس کا کی بورڈ، ماؤس اور سی پی یو کہاں ہے؟'' یوری نے سوال کیا۔

''وہ کیا ہوتا ہے؟ ہم تو اسے ایسے ہی چلاتے ہیں---لگتا ہے، تم لوگ ابھی تک p6 اور p7 میں ہی اٹکے ہوئے ہو۔ بھائی! اسے آن کرو اور اس کے سامنے بیٹھ جاؤ۔ دل میں جو خیال لاؤ گے، یہ وہی آپشن yes کر دے گا۔ اسے آنکھوں کی لہروں اور دماغ کے خیالات سے چلایا جاتا ہے۔'' ٹارزن نے بڑے فخر سے بتایا۔

''واہ بھئی واہ---تو پھر اسے اب آن کرو۔ میں بھی تو دیکھوں۔'' یوری آسٹن نے حیرت اور مرعوبیت سے کہا۔

''وہ جی، اس میں بس ایک مسئلہ ہے کہ سامنے بیٹھا بندہ اگر پلکیں جھکائے تو یہ بھی ری سٹارٹ ہونے لگتا ہے۔'' ٹارزن نے منہ بسورتے ہوئے بتایا۔

''اور اگر یہ مسئلہ میں حل کر دوں تو---؟'' یوری آسٹن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیا واقعی---؟'' ٹارزن خوشی سے اچھلا اور بولا۔ ''یہ کمپیوٹر ایک گدھے نے ایجاد کیا ہے۔ اگر تم اس کا فالٹ دور کر دو تو میں تمہیں اس سے بڑا گدھا تسلیم کرلوں گا۔''

محمد محبوب ملک، مظفر آباد

کر کہا۔

''مرزا میں صاحباں بول رہی ہوں۔'' صاحباں کی آواز کانپ رہی تھی اور وہ سخت خوف زدہ معلوم ہوتی تھی۔

''کیا بات ہے' اتنی نروس کیوں ہو؟ کیا تمہارے علاقے میں پانی کی پائپ لائنیں پھٹ گئی ہیں۔'' مرزا نے پوچھا۔

''نہیں' مرزا! یہاں اِس سے بھی بڑی قیامت گزر گئی ہے---'' صاحباں رو دینے والے لہجے میں بولی۔ ''گھر والوں نے مجھے ایک کمرے میں تقریباً بند کر رکھا تھا اور ٹیلی فون کو بھی تالا لگا رکھا ہے اِس لیے مَیں تمہیں بروقت اِس المیے کی اطلاع نہیں دے سکی۔ میرے پاس وقت کم ہے۔ مَیں تمہیں یہ خبر دینا چاہتی تھی کہ اِس وقت میری شادی ہو رہی ہے۔ باہر بارات آ چکی ہے' مَیں نے سرخ جوڑا پہنا ہوا ہے اور تھوڑی دیر بعد پرائی ہونے والی ہوں۔ ظالم سماج اپنی سازش میں تقریباً کامیاب ہو چکا ہے۔ اِس تھوڑے سے وقت میں کچھ کر سکتے ہو تو کر لو۔ مَیں نے جان پر کھیل کر یہ موقع نکالا ہے۔ اچھا' بس اَب مَیں واپس اپنے کمرے میں چلتی ہوں' کوئی آ رہا ہے۔''

آ پہنچے ہیں

تیرے دیدار کو اغیار تک آ پہنچے ہیں
تیری محفل میں چڑی مار تک آ پہنچے ہیں
انگلیاں جم گئیں زناٹے کا چانٹا کھا کر
ذائقے مار کے رخسار تک آ پہنچے ہیں
اب تو اک آنچ کی اغوا میں کسر رہتی ہے
فاصلے عشق کے دیدار تک آ پہنچے ہیں
خیر فیشن کی ہو اب اس کی بدولت گھر میں
جن سے رونق تھی وہ بازار تک آ پہنچے ہیں
رشوتیں سکوں کی ، نوٹوں کی حدوں سے گزریں
سنتے ہیں معاملے اب کار تک آ پہنچے ہیں
کہہ دو دشمن سے کہ دھوتی کو سنبھالے اپنی
ہاتھ افواج کے ہتھیار تک آ پہنچے ہیں
ہو گیا عشق میں بد نام اناڑی اتنا
پوسٹر بھی دیوار تک آ پہنچے ہیں

اناڑی مہوی

کھٹ سے ٹیلی فون بند ہو گیا۔ مرزا ریسیور تھامے چند لمحے اِسے تکتا رہا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ ہو گیا ہے۔ صورتِ حال بڑی نازک تھی۔ اُسے اپنی بہن کی شادی میں شریک ہونے کے لیے گاؤں بھی جانا تھا۔ اِدھر صاحباں بھی اُس کی کائنات تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اُسے کوئی اور لوٹ کر لے جائے' عزت کا سوال تھا۔ آخر اُس نے فیصلہ کیا کہ پہلے صاحباں کی طرف جانا چاہئے۔ اِس فیصلے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اُس نے حال ہی میں فلم ''فرض اور محبت'' دیکھی تھی۔ اِس میں ہیرو نے بھی یہی کیا تھا پہلے اپنی محبت کو بچایا تھا' پھر فرض بھی ادا کر لیا تھا۔ پھرتی سے اُس نے اپنا ریوالور لوڈ کیا' کار نکالی' اِس کا فیول چیک کیا اور پھر آندھی اور طوفان کی طرح صاحباں کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

راستے میں سوچ رہا تھا کہ اُسے شادی رکوانے کے بعد کیا کرنا چاہئے۔ پہلے اُس نے سوچا کہ وہاں جا کر عین اِس وقت جب مولوی صاحب نکاح پڑھانے لگیں گے تو وہ گرجدار آواز میں کہے گا کہ یہ شادی نہیں ہو سکتی۔ لوگ پوچھیں گے کہ کیوں نہیں ہو سکتی۔ مَیں کہوں گا کہ تم اخبار نہیں پڑھتے' برسوں پہلے شادی اور جہیز کا قانون منظور ہو چکا ہے اور تم لوگوں نے حکومت کی اجازت سے زیادہ مہمان بلا رکھے ہیں اور جہیز بھی پچاس ہزار سے زیادہ کا دے رہے ہو' چند منٹ میں پولیس یہاں پہنچنے والی ہے۔ پولیس کی دھمکی سے وہ لوگ خوفزدہ ہو کر تتر بتر ہو جائیں گے اور مَیں اُن کی بوکھلاہٹ سے فائدہ اُٹھا کر صاحباں کو لے اُڑوں گا---

لیکن مرزا کو اپنا فیصلہ فوراً ہی ترک کرنا پڑا کیونکہ اُسے یاد آ گیا کہ صاحباں کا بھائی شمیر تو خود پولیس میں ہے' اُن لوگوں کو پولیس کی دھمکی دینے کا فائدہ؟ چنانچہ اُس نے فیصلہ کیا کہ صاحباں کے ساتھ چھپتے چھپاتے ہی نکل جانا بہتر ہے۔ اُس نے گاڑی کوٹھی کے پچھلی طرف روکی۔ اِس طرف بھی لان تھا اور دیوار زیادہ اُونچی نہ تھی۔ مرزا کار پر چڑھا پھر دیوار پر چڑھا اور اندر کود گیا۔ یہاں واقعی شادی کا ہنگامہ تھا' پوری کوٹھی سجی ہوئی تھی۔ سامنے والے لان میں اور باہر سڑک پر بھی شامیانے لگے ہوئے تھے' بینڈ والے اِس خوشی کے مقام پر بڑے دردناک سروں میں اِس گانے کی دُھن بجا رہے تھے---

یہ دُنیا یہ محفل میرے کام کی نہیں

مرزا پوری کوٹھی کے جغرافیے سے واقف تھا اِسی لیے وہ فوراً صاحباں کے کمرے کی طرف بڑھا۔ کمرے کی پچھلی کھڑکی کے پاس جا کر اُس نے بڑی احتیاط سے اندر جھانکا۔ یہ دیکھ کر اُسے حیرت ہوئی کہ صاحباں اکیلی ہی عروسی لباس میں بیٹھی تھی' کوئی سہیلی وغیرہ نہیں تھی۔ شاید صاحباں نے عقلمندی سے کام لیتے ہوئے سب کو ٹرخایا ہوا تھا۔ وہ

دلہن بنی بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ لافانی عشق و محبت کے تمام کہانیوں کو ہیروئنوں سے زیادہ خوبصورت۔ مرزا نے اندازہ لگایا کہ اگر آج صاحباں کو فرہاد، مجنوں یا رانجھا وغیرہ بھی دیکھ لیتے تو جیلس ہو جاتے کیونکہ شیریں، لیلیٰ یا ہیر اتنی خوبصورت یقیناً نہیں تھیں۔

مرزا کھڑکی کے راستے کمرے میں کودا تب وہ چونکی۔ مرزا کو دیکھ کر اس کے چہرے پہ یوں خوشیوں کی چمک آ گئی جیسے کسی دفتری بابو کو شام چار بجے صدر سے آسانی سے بس میں جگہ مل گئی ہو۔ مرزا نے پھرتی سے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے ساتھ لے کر اسی راستے سے نکل بھاگا جہاں سے آیا تھا۔

☆☆

مرزا کی فیٹ کسی صحت مند مینڈک کی طرح اُچھلتی کودتی سپر ہائی وے پر چل رہی تھی۔ سڑک پر کراچی کی سڑکوں کی طرح نشیب و فراز نہیں تھے مگر مرزا کی گاڑی کو نشیب و فراز کے بغیر ہی اُچھلنے کودنے کی عادت تھی۔ مرزا پوری رفتاری سے گاڑی چلا رہا تھا اور وہ پوری رفتار تیس میل فی گھنٹہ تھی۔ صاحباں مرزا کے کندھے سے سر لگائے نڈھال نڈھال سی بیٹھی تھی۔ مرزا دانت پر دانت جمائے سڑک کو گھور رہا تھا جو کسی طرح ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

''ہائے مرزا! مجھے تو یہ سب خواب لگ رہا ہے۔ کیا ہم واقعی ظالم سماج کی آنکھوں میں دھول جھونک کر نکل آئے ہیں؟'' صاحباں بے یقینی سے بڑبڑائی۔

''خوابوں کا زمانہ گزر گیا جان! اَب تم نیند آور گولیاں کھانا چھوڑ دو۔ اَب ہم تم ایک ہونے والے ہیں اور ہمیشہ ایک رہیں گے۔'' مرزا نے جواب دیا۔

اسی قسم کی گفتگو کرتے ہوئے بالآخر وہ شام ڈھلے لاہور پہنچ گئے۔ شہر میں قدرے ڈھنگ کا ایک ہی ہوٹل تھا۔ مرزا نے اس میں دو کمرے لے لیے۔ صاحباں ذرا ایزی ہونا چاہتی تھی لیکن ایمرجنسی میں وہ اپنا سامان وغیرہ نہیں لا سکی تھی اس لیے اُس نے دُلہنوں والا بھاری بھر کم لباس اُتار کر مرزا کا ایک سلیپنگ سوٹ پہن لیا تھا۔

''صبح اُٹھ کر سب سے پہلے مولوی صاحب اور گواہوں کا انتظام کرنا تا کہ ہم نکاح پڑھوا سکیں۔'' صاحباں نے مرزا کو تاکید کی۔

''بہت بہتر---'' مرزا نے سعادت مندی سے کہا پھر دبی دبی زبان میں بولا۔ ''ہماری جوڑی تو آسمانوں پر ملائی جا چکی ہے، زمین پر ہمارے نکاح کو بھلا کون روک سکتا ہے؟''

دوسری صبح اِن کی یہ خوش فہمی دور ہو گئی۔ صبح ہی صبح دروازہ زور سے دھڑ دھڑایا گیا۔ مرزا نے خمار آلود لہجے میں کہا۔

''کون ہے؟''

''میں شیرازی ہوں۔ اِس ہوٹل کا مالک، ذرا ایک منٹ میری بات سنئے گا۔'' باہر سے آواز آئی۔

مرزا نے جیسے ہی اُٹھ کر دروازہ کھولا اُس کے پیروں تلے سے قالین نکل گیا۔ سامنے ہوٹل کے مالک کے ساتھ پانچ پولیس والے بھی وردیوں میں کھڑے تھے اور سب سے آگے صاحباں کا بھائی انسپکٹر شمیر تھا۔

''خبردار! کوئی ایسی ویسی حرکت کرنے کی کوشش مت کرنا، تمہیں صاحباں کو اغوا کرنے کے جرم میں گرفتار کیا جاتا ہے۔'' شمیر گرج کر بولا۔

''اغوا---؟'' مرزا حیرت سے بولا۔ ''میں نے اُسے قطعاً اغوا نہیں کیا، یہ اپنی مرضی سے میرے ساتھ آئی ہے۔ بے شک اِس سے پوچھ لو۔''

اِس دوران شور و غل سن کر صاحباں بھی اپنے کمرے سے نکل آئی تھی۔

''کیوں صاحباں! تم اپنی مرضی سے آئی ہو؟'' شمیر نے آنکھیں نکالتے ہوئے پہلے سے بھی زیادہ گرجدار آواز میں صاحباں سے پوچھا۔

بڑے بھائی کی موٹی موٹی سرخ آنکھیں اور پھڑ پھڑاتی ہوئی گھنی مونچھیں دیکھ کر اور گرجدار آواز سن کر صاحباں کی ٹانگوں کی کپکپاہٹ اور بڑھ گئی، وہ ہکلاتے ہوئے بولی۔

''نہیں بھائی جان! یہ بدمعاش مجھے ریوالور دکھا کر زبردستی اُٹھا لایا تھا۔''

''مجھے معلوم ہے اِس بدمعاش کا کام یہی ہے۔ میں آٹھ دس اغواء کے پچھلے کیس بھی اِسی پر ڈالوں گا۔'' شمیر نے مرزا کو ہتھکڑی پہناتے ہوئے کہا۔ دوسرے ہی لمحے اُس نے مرزا کے کمرے سے ریوالور بھی برآمد کر لیا۔

☆☆

آج کل مرزا سنٹرل جیل میں چھ سال قید کاٹ رہا ہے اور صاحباں نے ایک بیوٹی پارلر کھول رکھا ہے جہاں وہ لڑکیوں کو دُلہن بناتی ہے اور خود اپنے لیے کوئی نیا رشتہ آنے کے انتظار میں آہیں بھرتی ہے اور کبھی کبھی زیرِ لب گانا بھی گنگناتی ہے---

عمریا بیتی جائے کوئی رشتہ نہ آئے

☆☆

ہمیں شروع سے پنک پینتھر کارٹون پسند رہا ہے۔ اگر کہیں اِس کی جھلک بھی نظر آ جاتی ہے تو ہم چند لمحے ضرور اِسے دیکھتے ہیں کیونکہ یہ اپنی سادگی سے شرارتیں پیدا کرتا ہے جو ہمیں بے حد پسند آتی ہیں۔ اگرچہ لڑکپن کی فرصت تو اب میسر نہیں کہ ہم باقاعدہ پنک پینتھر کارٹون دیکھ کر محظوظ ہو سکیں مگر جب بھی موقع ملا' اِس کارٹون نے ہمیں گدگدایا مگر ایک دِن اچانک ہی ٹی وی پر نظر پڑی تو ایک کلین شیو صاحب' کالا چشمہ لگائے سلیقے سے بچے کھچے بال جمائے چلے آ رہے تھے اور میڈیا کے لوگ اُن کے اطراف اُن سے سوالات کرنے کے لئے بے چین دوڑ رہے تھے' کسی صحافی نے اُن سے کوئی سوال کیا اور اُنہوں نے کوئی جواب دیا جو ہمارے سر سے گزر گیا۔ وہ تو بعد میں پتہ چلا کہ اُن کی باتیں سمجھنے کے لئے بندے کو اپنی ذاتی ڈکشنری سے بھی کام لینا پڑتا ہے جو اُس نے حفظ کی ہوئی ہوتی ہے--- یہ چوہدری شجاعت حسین صاحب سے ہمارا باقاعدہ پہلا تعارف تھا' اِس کے بعد ہم اُن کے فین ہو گئے ہیں۔ پنک پینتھر کی پسندیدگی اپنی جگہ ہے۔

چوہدری شجاعت اتنے اسمارٹ ہیں کہ ہم نے ایک پریس کانفرنس والی تصویر دیکھی تو سمجھے کہ تمام ہی خواتین پریس کانفرنس کر رہی ہیں' وہ تو اخبار والوں نے نشاندہی کی کہ اِن میں چوہدری صاحب بھی موجود ہیں۔ جنہوں نے چوہدری صاحب کو سرسری نظر سے دیکھا ہے' وہ اِس تصویر کو دیکھ کر اُلجھن میں پڑ جاتے ہیں' خاص طور پر وہ لوگ جو بلا کے حسن پرست ہیں وہ مشکل میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ چوہدری صاحب خواتین کی موجودگی میں زیادہ خوبصورت ہیں یا پھر اِن کی وجہ سے خواتین خوبصورت دکھائی دے رہی ہیں؟

میرا دوست مَلک کہتا ہے کہ چوہدری صاحب انتہائی شرمیلے ہیں' اگر ایسا نہ ہوتا تو چشمہ نہ لگاتے--- مجھے مَلک کی بات سے سو فیصد اتفاق ہے چوہدری صاحب انتہائی حد تک "شر--- میلے" ہیں۔ ویسے کالا چشمہ لگانے کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی دُشمن آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہیں کر سکتا جبکہ چوہدری صاحب کا چشمہ تو اتنا کالا نظر آتا ہے کہ کوئی دُشمن چشمہ لگا کے شیشہ میں شیشہ ڈال کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ چوہدری صاحب کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ لفاظی کرنے والے سیاستدان نہیں ہیں بلکہ عملی اقدامات پر زور دیتے ہیں' کبھی کبھی تو اتنا زور دیتے ہیں کہ "الف" الگ "قد" الگ' دوسرا "الف" الگ اور "مات" الگ الگ کھڑے ہانپتے دکھائی دیتے ہیں۔ اِس موقع پر مَلک صاحب نے یہ تبصرہ فرمایا کہ وہ واقعی عملی اقدامات سے زیادہ "عملی اقدا--- مات" سے کام لیتے ہیں۔

چوہدری صاحب کو بولتے ہوئے دیکھا جائے تو پہلی نظر میں ایسا لگتا ہے کہ وہ انگریزی بول رہے' جب غور سے دیکھا جائے تو لگتا ہے کہ وہ واقعی انگریزی بول رہے ہیں۔ جب اُن کے الفاظ سمجھنے کے لئے ڈکشنری کھولی جائے تو پھر احساس ہوتا ہے اُنہوں نے کوئی "اپنی ہی" انگریزی بولی تھی جو انگریزوں کی بھی سمجھ سے بالاتر ہے۔ کہتے ہیں اچھا سیاستدان وہ ہوتا ہے جو وہ کچھ بولے جو سننے والے کو اچھا لگے اور کرے وہ کچھ جو خود سے اچھا لگے' اِس لئے کہا جا سکتا ہے کہ چوہدری صاحب "اچھے سیاستدان" ہیں۔ کچھ لوگوں کے بقول سیاست اُنہیں گھٹی میں ملی ہے۔ ہم اِن کی تصحیح کرنا چاہتے ہیں کہ سیاست اُنہیں "مٹھی" میں ملی ہے' جیسے کچھ لوگ منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوتے ہیں' یہ "اخبار" لئے دُنیا میں آئے تھے۔ ہماری اِس بات کی تصحیح بھی مَلک صاحب یوں کرتے ہیں کہ وہ اخبار گاما کالو جسٹ کا تھا جسے چوہدری صاحب نے جھپٹ کر پکڑ لیا تھا کہ دیکھیں' اِس میں اِن کی آمد کی خبر شائع ہوئی ہے کہ نہیں اور لوگوں نے اتنی سی بات کو بڑھا چڑھا کر یہ کر دیا ہے کہ وہ اخبار لے کر دُنیا میں آئے تھے۔ بات کچھ بھی ہو' ہمیں تو اِن رپورٹروں پر حیرت ہوتی ہے جو اِن کے بیان نہ صرف شائع کرتے ہیں بلکہ وہ سمجھ کر لکھ بھی لیتے ہیں کیونکہ ہم نے جب بھی اِن کی باتیں سننے کی کوشش کی' ہماری یہ کوشش رائیگاں ہی گئی۔ اِس سے تو اچھا تھا ہم کوئی پشتو فلم دیکھ لیتے جس کے

تلاشِ گمشدہ

شوکت علی مظفر

ڈانس آج تک ہماری سمجھ میں نہ آ سکے--- پشتو فلموں سے ہمیں یاد آیا کہ پشتو فلموں کی ایک انفرادیت یہ ہے کہ اِس میں ہیرو سلم اور ہیروئن موٹی تازی بلکہ صرف موٹی موٹی ہی سلیکٹ کی جاتی ہے یعنی ہیروئن سلیکٹ کرنے کے لئے اسکرین ٹیسٹ کی بجائے "کرین ٹیسٹ" لیا جاتا ہے۔

چوہدری صاحب کو ہمارا مشورہ ہے کہ اگر وہ سیاست چھوڑنے کا ارادہ کر لیں (جو کہ ناممکنات میں سے ہے) تو وہ پشتو فلموں کا رُخ کریں کیونکہ اِن میں تمام ہیروز کی خوبیاں موجود ہیں۔ ملک صاحب نے اِس موقع پر حسبِ عادت ٹانگ اُڑانے کی کوشش کی کہ چوہدری صاحب کو پنجابی فلموں میں کام کرنے کا مشورہ دیا جانا چاہئے لیکن ہم نے اُن کا منہ یہ کہہ کر بند کر دیا کہ پنجابی فلموں میں فلم کی کامیابی کا سارا دارومدار ہیرو پر ہی ہوتا ہے اور ہیرو کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں۔

☆ مونچھیں ہونا لازمی ہیں۔

☆ آواز پاٹ دار ضرور ہونی چاہئے۔

☆ چشمہ کی بجائے اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا عادی ہو۔

☆ اور چوہدری نہ ہو کیونکہ پنجابی فلموں میں چوہدری ہیرو کی بجائے وِلن ہوتے ہیں۔ ہاں' اگر چوہدری صاحب کو منفی رول پسند ہو تو وہ بصد شوق پنجابی فلموں کا رُخ کر سکتے ہیں۔

(ایک نامعقول کے بقول تو یہی مناسب ہے' یہ نامعقول کون ہو سکتا ہے؟ بتانے کی ضرورت نہیں)

ہمیں ایک بات پر ہمیشہ اعتراض رہا ہے۔ چوہدری صاحب کا انتخابی نشان سائیکل کی بجائے کچھ اور ہونا چاہئے تھا کیونکہ بندہ چوہدری ہو اور بیٹھے غریبوں والی سواری سائیکل پر تو کچھ مناسب نہیں لگتا۔ مجھے شک ہے' شاید ابرار الحق نے اُنہیں ورغلایا ہوگا کہ پہلے سے سائیکل پر گانا تیار ہے' اِس لئے چوہدری صاحب اِن کے جھانسے میں آ کر سائیکل ہی انتخابی نشان منتخب کر چکے ہوں' اگر وہ ہم سے مشورہ کرتے تو ہم نہ صرف اِن کے شایانِ شان محفوظ سواری کو منتخب کرنے پر اصرار کرتے بلکہ ایک گانے کی ٹانگ توڑ کر اُنہیں نیا گانا تیار کروا دیتے کہ---

اَج ٹینک تے مہراں لا ساڈی فرمیش تے

(آج ٹینک پر مہر لگا ہماری فرمائش پر)

بہرحال دُشمنوں کی نظر لگی اور اِن کی سائیکل سرک گئی بلکہ بکھر گئی۔ ظاہر ہے ایسا تو ہونا ہی تھا جب سولہ کروڑ عوام کو ابرار الحق کے ورغلانے پر ایک چھوٹی سی سائیکل پر بیٹھنے کی دعوت دی جائے تو سائیکل کا یہی کچھ حشر ہونا تھا جبکہ ہمارے منتخب نشان پر مہر لگانے کے بعد اِس گانے کو کچھ اِس طرح بھی آگے بڑھایا جا سکتا تھا کہ "ذرا لا کے سامنے آ ساڈی فرمیش تے" اب جس میں ہمت ہوتی تو صرف وہی ٹینک کے سامنے آنے کی جسارت کر سکتا تھا' ویسے بھی غریب غرباء کو اپنی سواری پر بٹھانے کا یہی نتیجہ نکلتا ہے جس کا خمیازہ چوہدری صاحب بھگت رہے ہیں اور اِس بات کا الزام وہ مدرسے کی معصوم بچیوں پر ڈالتے ہیں کہ اُن کی بددُعائیں اِنہیں لے ڈوبیں حالانکہ اِس بات میں کوئی حقیقت نہیں' اگر ہوتی تو چوہدری صاحب الیکشن نہ ہارتے بلکہ--- خیر رہنے دیں۔

جب سے الیکشن ہوئے چوہدری صاحب بہت کم نظر آ رہے ہیں۔ کئی بار سوچا کہ اُنہیں فون کروں لیکن مسئلہ وہی آڑے آتا رہا کہ اِن کی بات سمجھنے کے لئے ترجمان (جس کا ملنا بہت ہی مشکل ہے) کی ضرورت پڑتی کیونکہ اِس کے بغیر اِن کی بات کم از کم ہماری سمجھ میں نہیں اتی۔ بہرحال ہم اِس غلط فہمی میں رہے کہ اِن کی "گمشدگی" صرف ہمارے لئے ہی وجۂ پریشانی بنی ہوئی ہے' مگر ایسا نہیں کیونکہ ہمیں آج ہی ایک تلاشِ گمشدہ کا پیغام موصول ہوا ہے' جس سے ہمیں دیگر لوگوں کی پریشانی کا بھی احساس ہوا ہے یہ پیغام کچھ اِس طرح سے ہے۔

☆ تلاشِ گمشدہ ☆

"نام چوہدری شجاعت' بولنے اور دیکھنے میں انفرادیت' ذہنی توازن بالکل متوازن--- اٹھارہ فروری کی شام' کالا چشمہ پہنے سائیکل کو پنکچر لگوانے نکلے تھے۔ جن صاحب کو ملے وہ فوراً نواز شریف سے رابطہ کر کے اُنہیں اطلاع دیں۔"

ہماری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا کہ پیغام لکھنے والے نے نواز شریف کو اطلاع دینے کی بات کیوں کی ہے؟--- اگر آپ کو سمجھ آ جائے تو ہمیں بھی سمجھا دیں۔ تب تک ہم یا تو پنک پینتھر دیکھ لیں یا پھر چوہدری صاحب ہی کی کوئی پرانی ویڈیو دیکھ کر انتظار کرتے ہیں۔

☆☆

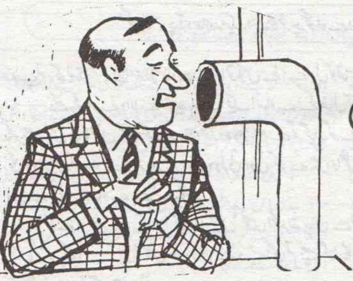

روزِ حماقت

☆ محمد عباس طوروی

"برخوردار نمبر دس----!"

ساوے نے سامنے کھڑے اپنے ایک بیٹے کو ملائمت سے مخاطب کیا--- یہاں اِس اَمر کی وضاحت ضروری ہے کہ ساوے کی کل پیداوار یعنی اولاد اِتنی ہے کہ اِن کے نام یاد کرنا اور یاد رکھنا ساوے کے لیے بہت مشکل تھا اِس لیے ساوے نے اپنی تمام اولاد کو اُن کی پیدائش کے حساب سے نمبر دے رکھے ہیں اور بوقتِ ضرورت اُنہیں اِنہی نمبروں سے پکارا جاتا ہے سوائے منیر المعروف منیر اکگڑ کے جس کا نمبر پیدائش کے حساب سے پہلا ہے۔ چونکہ ساوے کی نظروں میں اُس کی کوئی بھی اولاد ایک نمبر نہیں ہے اِس لیے ساوا منیرے کو اُس کے نمبر کی بجائے اُس کے نام ہی سے مخاطب کرتا ہے۔

"ابا! میَں نو نمبر ہوں، دس نمبر نہیں---" ساوے کے اِس طرح بلانے پر بیٹا صاحب خفگی سے بولے۔

"اچھا، تو تم نمبر نو ہو--- ویسے شکل سے مجھے دس نمبریئے لگے تھے۔" ساوے نے عذرِ گناہ پیش کیا۔

"شکل کا کیا ہے، ابا! شکل سے تو آپ بھی جیل سے بھاگے ہوئے لگتے ہیں۔" برخوردار نمبر نو نے گستاخی سے کہا۔

"جیل والوں نے بھاگنے کا موقع ہی کب دیا تھا ورنہ میَں یہ بھی کر دیتا۔" ساوے نے ایک سرد آہ بھری۔ "کم بختوں نے سزا پوری ہونے سے پہلے باہر ہی نہیں آنے دیا تھا بلکہ شاید دو تین منٹ زیادہ ہی اندر رکھا تھا۔"

"ابا! تم جیل بھی گئے تھے، کس جرم میں---؟" نمبر نو نے اشتیاق سے پوچھا۔

"ہاں، پتر! یہ کام بھی میَں نے کیا تھا--- غلطی تو میری اِتنی زیادہ نہیں تھی مگر پولیس والوں نے مجھے خواہ مخواہ پکڑ لیا تھا اور حسبِ معمول خاطر تواضع کے بعد جیل بھی بھجوا دیا تھا---"

"ابا! تم نے کِیا کیا تھا؟"

"کچھ بھی نہیں کِیا تھا--- میَں تو چوہدری صاحب سے ملنے گیا تھا، واپسی پر میَں غلطی سے اُن کی گھوڑی کو اپنی گھوڑی سمجھتے ہوئے کھول کر لے آیا تھا۔ وہ تو مجھے کسی نے دیکھا نہیں ورنہ وہیں مجھے غلطی کا احساس دلا دیتا---" ساوے نے تاریخی حقیقت سے پردہ اُٹھانا شروع کیا۔

"مگر ابا! یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ کسی نے تمہیں دیکھا ہی نہ ہو---؟"

"تمہارا باپ ہوں میَں، اِتنا کچا کام نہیں کرتا--- وہ تو دوسرے دن کسی نے گلی میں سے گزرتے ہوئے گھوڑی کے ہنہنانے کی آواز سن لی اور چوہدری صاحب کو خبر کر دی۔ پھر اِس کے بعد پولیس نے آن دروازہ کھٹکھٹایا اور پھر--- اِس سے آگے تم سن ہی چکے ہو البتہ یہ ہے کہ اِس کے بعد مجھے نصیحت ہوگئی کہ---"

"چوری نہیں کروں گا---" برخوردار نے لقمہ دیا۔

"اُلو کے پٹھے! چوری نہ کروں تو کھاؤں کہاں سے؟--- نصیحت یہ ہوئی تھی کہ آئندہ کچا کام نہیں کروں گا اور چوری کرتے ہی مسروقہ مال آگے نکال دیا کروں گا۔"

ساوے نے گرج کر کہا۔ ساوے کے بزعم خود گرجنے سے اُس کے بلغم زدہ سینے سے ایسی ڈراؤنی آوازیں برآمد ہوئیں کہ برخوردار کا دِل دہل گیا۔ ساوے نے کھانسی کے زور سے آگے پیچھے ہوتے ہوئے جلدی سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور بیٹے سے کہا۔

"یہ پانچ روپے پکڑو اور ایمیسی کی چھوٹی ڈبیا لے آؤ، چار روپے کی ملے گی--- باقی روپے تم رکھ لینا، کیا یاد کرو گے؟"

برخوردار کے روانہ ہونے کے بہت دیر بعد تک بھی ساوا اپنا سینہ پکڑ پکڑ کر کھانستا رہا۔ کافی دیر کے بعد کھانسی نے اُس کی شکستہ حالی پر رحم کیا اور رُخصت ہوگئی۔ طبیعت سنبھلنے پر ساوے کو ایکدم یاد آیا کہ اُس کے پاس تو پانچ کا نوٹ نہیں تھا، پھر اُس نے بیٹے کو کیا دے دیا ہے؟ ساوے نے جیب میں ہاتھ ڈال کر چیک کیا تو اُسے اندازہ ہوا کہ اِس نے اُس کو پچاس کا نوٹ دے دیا ہے--- میَں نے تو اُسے یہ بھی کہا تھا کہ باقی

روپے تم رکھ لینا---اپنا اندازِ سخاوت یاد آیا تو اُس نے اپنے دِل کو تھام لیا---مجھے کچھ ہونے والا ہے' شاید ہارٹ اٹیک! ساوے نے خیال کیا پھر جیسے اُس کی ٹانگوں میں سکت نہ رہی اور وہ دھڑام سے گر گیا۔ گرنے کی آواز سن کر ساوے کی زوجہ نمبر ایک دوڑتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور چیخ مار کر ساوے سے لپٹ گئی۔

''ہائے او منیرے کے ابا! کیا ہوا تمہیں' کہیں الحمدللہ جان سے تو نہیں گزر گئے؟---ہیں' نبض چل رہی ہے' ویسے بھی تم جیسے گناہگار اِتنی جلدی مرتے نہیں ہیں۔''

وہ ساوے کو ہوش میں لانے کی تدبیر کرنے لگی۔ اِتنی دیر میں ساوے کی بیشتر اولاد منہ منکوحہ ثانی جائے وقوع پر پہنچ گئی اور پھر سب اپنے اپنے طریقے سے ساوے کو ہوش میں لانے کی تدبیر کرنے لگے۔

''میرا خیال ہے' ابا عازمِ سفر ہونے لگے ہیں۔'' منیرے نے تلوے رگڑتے ہوئے کہا۔

''اِس منزل کی طرف جہاں سے کوئی نہیں واپس لوٹتا۔'' برخوردار نمبر تین نے ساوے کے حلق میں پانی اُنڈیلتے ہوئے ارشاد فرمایا اور پھر چیخ مار کر ساوے سے لپٹ گیا۔ ''ہائے وے میریا اَبا! کیوں اِتنی جلدی جا رہے ہو؟''

ساوے نے ابھی ایک آنکھ ہلکی سی کھولی ہی تھی کہ برخوردار نمبر نو ایمپسی کی ڈبیا ہاتھ میں پکڑے اندر داخل ہوا۔ ساوا اُسے دیکھتے ہی اُٹھ بیٹھا اور کچھ کہنے ہی والا تھا کہ برخوردار نے ایمپسی کی ڈبیا اور کچھ روپے اُس کے ہاتھ میں پکڑائے۔

''یہ لو ابا! یہ تمہارے سگریٹ اور یہ تمہارے پینتالیس روپے---''

ساوے نے روپے پکڑ کر جیب میں ڈال لیے اور نمبر نو کی اِس ایمانداری پر خوش ہوتے ہوئے ترنگ میں آ کر زوجہ نمبر ایک سے گویا ہوا۔

''کیوں' نیک بخت! کیا یہ واقعی میری اولاد ہے؟''

زوجہ نمبر ایک نے جو ساوے کے اِتنا جلدی روبصحت ہونے پر حیران تھی' ساوے کو گھورا اور پھر خفگی سے کہا۔

''تمہیں شک ہے کیا---؟''

اماں اور ابا کو پرائیویٹ قسم کی باتیں کرتے دیکھ کر سب اولاد باہر چلی گئی جبکہ ساوے نے کہنا شروع کیا۔

''ارے' شک نہ کروں تو اور کیا کروں؟---میں نے پچاس روپے اِسے پکرائے تھے پانچ روپے سمجھ کر اور کہا تھا کہ میرے لیے سگریٹ لے آؤ۔ اَب چونکہ میں نے تو اپنی طرف سے پانچ روپے دیئے تھے اِس لیے میں نے کہہ دیا کہ باقی تمہارے مگر یہ واپسی پر مجھے پینتالیس روپے دے گیا ہے---نہیں' بیگم! اِتنی ایماندار میری اولاد نہیں ہو سکتی۔ اِتنی ایمانداری کا مظاہرہ خود مَیں نے کبھی زندگی میں نہیں کیا تو میری اولاد کیسے کر سکتی ہے---نہیں' بیگم! نہیں---''

ساوے کی طرف سے خود پر لگائے جانے والے اِس سنگین الزام پر زوجہ نمبر ایک ساوے کو غصے سے گھورتی ہوئی احتجاجاً واک آؤٹ کر گئی۔ اِس کے جانے کے بعد ساوے نے سگریٹ نکالا مگر سلگانے سے پہلے ہی اُسے یاد آ گیا کہ اُس نے ماچس تو منگوائی ہی نہیں تھی۔ اُس نے فوراً آواز لگائی۔

''منیرے---او پتر' منیرے!'' منیرا فوراً حاضر ہو گیا۔ ساوے نے جیب سے ایک نوٹ نکالا اور منیرے کو دے کر کہا۔ ''ایک ماچس لے آؤ دوکان سے مگر ذرا جلدی آنا۔''

منیرے نے ایک بار نوٹ کی طرف دیکھا اور پھر ساوے کو گھورنے لگا۔

''ابا! میرا خیال ہے کہ تمہیں اَب پاگل خانے چلا ہی جانا چاہئے---''

''خانہ خراب! کیا اول فول بکے جا رہا ہے---؟'' ساوا طیش سے بے حال ہو گیا۔

''اور نہیں تو کیا' ابا! یہ دیکھ ذرا کیا لکھا ہے یہ---''

منیرے نے نوٹ کے سامنے کے رُخ کے بائیں طرف اپنی شہادت کی اُنگلی رکھ کر وہاں لکھی عبارت اپنے والدِ محترم کو دِکھائی جس نے اپنی مرتی ہوئی آواز میں پڑھا ''ننھے ننھے بچوں کو عید مبارک'' پھر ساوا خود بھی اپنی آواز کے ساتھ مردہ ہوتا چلا گیا۔ منیرا والدِ بزرگوار کی طبیعت ایک بار پھر خراب ہوتے دیکھ کر باقی بھائیوں کو بلانے ہی والا تھا کہ ساوے نے ایک ایسی دلدوز چیخ ماری کہ تمام اہلِ محلّہ کو واضح طور پر سنائی دی ہو گی مگر اُن کی اِس چیخ پر غور نہ کرنے کی وجہ ایک ہی تھی کہ وہ ایسی چیخوں کے عادی تھے کہ ساوے اور اُن کی زوجہ ثانی کے مابین ہونے والی جنگ کے اختتام پر ایسی چیخیں ساوے کے حلق سے اکثر برآمد ہوتی رہتی تھیں۔

''کیا ہوا' ابا! تم ٹھیک تو ہو نا---؟'' منیرا تشویش سے بولا۔

''کچھ نہیں' کچھ نہیں---بس یہ ثابت ہو گیا ہے کہ برخوردار نمبر 9 میری ہی اولاد ہے' بیشک ایسا فراڈ میری ہی اولاد کر سکتی ہے۔''

ساوے نے جان لیا تھا کہ 9 نمبر نے اُسے اصلی نوٹوں کی بجائے نقلی نوٹ پکڑا دیئے تھے جس پر ساوا اِتنا ہی حیران ہوا تھا جتنا کہ اَب

نوٹوں کے جعلی ثابت ہونے پر--- پانچ منٹ میں دوبار حیران ہونے کا واقعہ ایک بار پہلے بھی ساوے کے ساتھ پیش آیا تھا جب ایک شادی میں عین نکاح کے وقت دولہا اپنا سہرا متوقع ''جائے واردات'' پر چھوڑ کر موقع سے فرار ہوگیا تھا اور پانچ منٹ بعد خود ہی واپس آ گیا۔ بعدازاں دولہا نے انتہائی شرمندگی کے ساتھ واضح کیا تھا کہ آج کچھ دوستوں نے مذاق میں اُسے قبض کشا گولیاں دے دی تھیں جن کے نتیجے میں وہ بار بار بھاگنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور موقع واردات سے فرار بھی اِس سلسلے کی ایک کڑی تھا۔

''کیا اِس سے پہلے تمہیں اپنی مردانگی پر شک تھا۔''

زوجہ نمبر ایک چلائی' اُسے یاد آ گیا تھا کہ ساوے نے شک کا اِظہار کیا تھا--- دراصل اِس روز ساوے سے صبح ہی سے حماقتیں سرزد ہو رہی تھیں۔ سب سے پہلی حماقت یہ ہوئی کہ زوجہ نمبر دو کی چھوٹی بہن کے جگانے پر خلافِ معمول صبح سویرے تقریباً گیارہ بجے بیدار ہو گیا۔ دوسری حماقت یہ ہوئی کہ نہانے لگا حالانکہ اُسے نہائے ہوئے ابھی ایک مہینہ ہی گزرا تھا۔ جب نہا کر اوپن ائیر غسلخانے سے نکلا تو بدن پر ایسے کپکپی طاری تھی جیسے دسمبر کے مہینے میں نہایا ہو۔ مزید حماقت یہ ہوئی کہ تازہ تازہ پراٹھے نوش جان کئے۔ اُس کا معدہ صبح کے وقت کے پکے ہوئے تقریباً منجمد پراٹھے ہضم کرنے کا عادی تھا اِس لیے جب تازہ تازہ پراٹھے وصول کرنے کے بعد معدے نے احتجاجی مظاہرہ کیا تو ساوا ''باہر'' جانے پر مجبور ہوگیا۔ یہاں ساوے سے ایک اور غلطی سرزد ہوگئی کہ اِس نے رفع حاجت کے لیے اپنے ازلی دُشمن کاکے کی زمین منتخب کر لی۔ فراغت کے بعد جب ساوا کھڑی فصل کی اوٹ سے نکلا تو کاکے کو خونی نظروں سے گھورتے پایا' نظروں ہی نظروں میں وہ کہہ رہا تھا کہ اَب آئے نا' بچو! میرے ہاتھ۔ ایسا رگڑا لگاؤں گا کہ اگلی پچھلی سب بھول جاؤ گے--- کاکے کو جارحانہ عزائم کے ساتھ کھڑے دیکھ کر ساوا سمجھ گیا کہ اَب کوئی نہ کوئی تاریخی نوعیت کی جنگ ہوگی۔ ساوے کی توقع کے عین مطابق کاکے نے اپنا مطالبہ پیش کر دیا جس کا مطلب قابلِ اشاعت زبان میں کچھ اِس طرح بنتا ہے کہ کارکردگی کے نتیجے میں وجود پانے والے ایٹمی مواد کو ساوا اپنے ہاتھوں سے واپس وہیں پہنچائے جہاں سے وہ برآمد ہوا تھا۔ ظاہر ہے' یہ ایک انتہائی فضول اور ناقابلِ قبول قسم کا مطالبہ تھا اِس لیے ساوے نے ڈپلومیسی سے کام لیا اور ضرورت کے وقت گدھے کو بھی باپ بنائے جانے والے محاورے کو ذہن میں رکھ کر فوراً کاکے کو بھائی کہہ دیا۔

''بھائی صاحب! مجھ سے غلطی ہو گئی جس کی معافی چاہتا ہوں--- ویسے بھی یہ غلطی نہیں ہے بلکہ میری نیکی ہے کہ تمہاری فصل کو کھاد فراہم کی ہے اور تم مجھے اِس نیکی کا یہ صلہ دے رہے ہو؟ واقعی لوگ سچ کہتے ہیں کہ آج کل نیکی کا زمانہ نہیں ہے۔''

آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے ساوے کی آواز رندھ گئی تھی لیکن ساوے کی اِس بے مثال اداکاری کا بھی کاکے پر کوئی اثر نہ ہوا اور اُس نے اپنا مطالبہ برقرار رکھا۔ کاکے کے اصرار پر ساوا اشتعال میں آ گیا اور اُس نے کاکے سے کہا۔

''مَیں نہیں کروں گا یہ سب' مجھے الکل (ایسا کرنا آتا نہیں ہے) نہیں ہے۔ تم کر کے دِکھاؤ پہلے تو ہوسکتا ہے' مَیں بھی کرلوں مگر گارنٹی پھر بھی کوئی نہیں ہے۔ دوسری صورت میں تم میرا جو بگاڑ سکتے ہو' بگاڑ لو---''

ساوے نے یہ کہا اور واپس گھر کی طرف چل پڑا۔ یہ ایک ''مردانہ وار'' پسپائی تھی۔ کاکا' ساوے کو باآواز بلند بُرے نتائج کی دھمکیاں دیتا رہا مگر ساوے پر اِن کا کیا اثر ہونا تھا' وہ تو اِس بات کا قائل تھا کہ کُتے بھونکتے رہتے ہیں اور قافلہ چلتا رہتا ہے۔ ''محاذِ جنگ'' سے واپسی پر ساوے سے جو حماقت ہوئی وہ شروع میں تفصیل سے بیان کی جا چکی

ایک صارف کی التجا

ہم کو مشقِ ستم نہ بنا' واپڈا
چھوڑ دے اَب یہ جورو جفا' واپڈا
تیرا ہر فرد ہے بس اِسی تاک میں
کوئی آ کے کرے کک مکا' واپڈا
بل ہزاروں میں آتا ہے اِک بلب کا
کیجئے کچھ تو خوفِ خدا' واپڈا
اِس کو بجلی کے چوروں میں شامل کیا
تو ہوا جس کسی سے خفا' واپڈا
تیری وحشت سے لرزاں ہیں اہلِ وطن
بن گیا ہے تو اِک اژدہا' واپڈا
آج سے بس یہی فیصلہ ہے مرا
مَیں جلاؤں گا کل سے دِیا' واپڈا
ایک آوارہ ہی کو نہیں ہے گلہ
تجھ سے نالاں ہے خلقِ خدا' واپڈا

آوارہ بلی ٹنگوی' بلی ٹنگ (کوہاٹ)

ہے۔ اِس کے بعد ساوے سے اِس کی منکوحہ اوّل نے کہا کہ وہ گھر میں موجود بکرے کو قاسو قصائی کے ہاتھ فروخت کر آئے۔ یہ بکرا موصوف 1971ء کے ماڈل تھے اور اَب اپنی زندگی کے دِن پورے کر رہے تھے ''دَم واپسیں بر سرِ راہ ہے'' کی عملی تفسیر بنے ہوئے --- ساوا بھی قریب المرگ بکرے کو لے کر فوراً روانہ ہو گیا تھا قاسو قصائی کی طرف مبادا دیر کرنے کی صورت بکرا صاحب داعیٔ اجل کو لبیک نہ کہہ دیں۔ اِس قریب المرگ بکرے سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ لیٹے لیٹے (کھڑا ہونے کی نہ اِس میں ہمت رہی تھی اور نہ ہی عمر) آخری ہچکی لے کر پسماندگان کو بر عطا فرما جاتا۔ ساوے نے غنیمت سمجھا کہ بکرے کو قاسو قصائی کے ہاتھ فروخت کر ڈالے۔ جو کچھ بھی ملتا، کم از کم صبر تو نہیں کرنا پڑتا --- قاسو قصائی کے بارے میں ساوے کے خیالات بہت نیک تھے۔ ساوے کے خیال میں جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو جن، بھوت، چڑیلیں اور اِسی طرح کی دوسری چیزیں ''ایجاد'' کرنے کا حکم دیا تھا تو جواباً فرشتوں نے عرض کی تھی کہ یا اللہ! اگر تجربے کے طور پر اِنہی تمام خصوصیات رکھنے والی ایک شخصیت اِنسانی قالب میں ڈھال دی جائے تو کوئی مضائقہ تو نہیں ہے؟ پھر بحکم باری تعالیٰ ایسی ایک اِنسانی شخصیت بنا دی گئی جس میں جن، بھوت، بدروح اور چڑیل وغیرہ کی تمام خصوصیات تھیں، پھر اُسے (ساوے کے خیال میں) قاسو قصائی کا قالب دے کر زمین پر ارسال کر دیا گیا اور ساوے کے نزدیک اہلِ زمین کو فرشتوں کا یہ ''تجربہ'' بہت مہنگا پڑ رہا ہے۔ قاسو قصائی کا حلیہ بھی ایسا ہے کہ اِسے بغور بلکہ سرسری نظر میں دیکھنے سے ہی ساوے کے خیال سے اِتفاق کرنے کو جی چاہتا ہے۔ قاسو قصائی کی ظاہری شکل وصورت بڑی عجیب وغریب بلکہ عجائبانہ ہے۔ اِس کی ناک بڑی خطرناک لگتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے لائسنس یافتہ ریوالور ہے۔ اگر اِس کی ناک سائیڈ پوز سے ملاحظہ کی جائے تو بالکل اُردو کے ہندسے ''ے'' کی طرح نظر آتی ہے اِسی لیے جہاں دوسروں کے لیے کہا جاتا ہے کہ وہ گلے ملا، وہاں قاسو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ناک ملا کیونکہ گلے ملتے ہوئے اِس کی ناک سب سے پہلے ملتی ہے۔ ہونٹوں کو دیکھنے پر سب سے پہلے ذہن میں تنور کے دہانے کی شبیہہ آتی ہے۔ قاسو کی آنکھیں بالکل بکرے کی آنکھوں جیسی ہیں یعنی دو ہی ہیں۔ اِس کو یہ آنکھیں بہت خوبصورت لگتی ہیں بشرطیکہ بند ہوں۔ ساوے کے خیال میں اِس نے یہ آنکھیں اپنے ہاتھوں سے وفات پانے والے کسی بیل کی لگوائی ہوئی ہیں۔ قاسو کے چہرے کی لمبائی چوڑائی بالکل برابر ہے اور اِسی وجہ سے اِس کا چہرہ گول نظر آتا ہے، ایک ایسا دائرہ جس کا قطر دس اِنچ ہو۔ رنگ ایسا ہے کہ توے کو اُونٹ کے پہاڑ تلے آنے والے محاورے پر یقین آ جاتا ہے۔ قاسو کی مونچھیں اِتنی خوفناک ہیں کہ اِن سے کسی کو با آسانی ڈرایا جا سکتا ہے، اِسی لیے وہ کمزور دِل حضرات کے سامنے نہیں جاتا مبادا دفعہ 302 کا طلاق نہ ہو جائے۔ سر کے بال ہمہ وقت کھڑے رہتے ہیں اور اِس کے سر پر ہاتھ رکھنے سے زخمی ہونے کا اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھار جب وہ حجام کے پاس اِن سرکنڈوں --- معاف کیجئے گا، بالوں کو کٹوانے کے لیے جاتا ہے تو حجام اِس کے بال کاٹنے سے پہلے ایک نئی قینچی احتیاطاً منگوا لیتا ہے کہ کہیں بال کاٹتے ہوئے قینچی نہ ٹوٹ جائے۔ گال پر چاقو کے ایک زخم کا پرانا نشان ہے۔ کبھی کبھی ساوا خیال کرتا ہے کہ اِس کے اِس گال کو بچپن میں کسی نے سیب سمجھ کر کاٹنے کی کوشش کی ہوگی مگر خون نکلنے پر حیران رہ گیا ہوگا کہ معاملہ کیا ہے؟ پھر لومڑی کی طرح اِس نے یہ سوچ کر سیب کھانے کا اِرادہ ترک کر دیا ہوگا کہ سیب گندے ہیں --- ساوا مزید خیال کرتا ہے کہ کاش! اِس کی جگہ مَیں ہوتا تو کم از کم ادھا سیب ضرور کھا جاتا بعد میں چاہے بدہضمی ہی ہو جاتی اور بعد کی پھر بعد میں دیکھی جاتی --- قاسو کا سر مجموعی طور پر ایک بڑے سائز کے فٹ بال کی طرح نظر آتا ہے۔ یہ تو گاؤں کے تمام افراد کی دِلی تمنا ہے کہ اِس سر کو فٹ بال کی طرح استعمال کیا جائے مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ --- اِنہی خیالوں میں گم ساوا قاسو قصائی کی دوکان پر جا پہنچا اور پھر بکرے کو قاسو کی نظروں کے سامنے کرتے ہوئے اِسے بڑی قرات سے سلام کیا۔

''السلام وعلیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ، یا قاسو بھائی!''

قاسو قصائی، ساوے جیسے مرنجان مرنج قسم کے آدمی کے منہ سے اپنا نام ایسی بے تکلفی سے سن کر بدک گیا۔

''تمیز سے گل کر، اوئے ساویا! میرا نام قاسم ہے، قاسو نہیں ---''

اِس نے اپنا گمدا ہوا میں شمشیر آبدار کی طرح لہراتے ہوئے کہا --- یہاں اِس کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ تمام کردار گاؤں کے ہیں اور ظاہر ہے کہ خالص ''گوند پنجابی'' بولتے ہیں لیکن پنجابی چونکہ مجھے لکھنے میں تکلیف ہوتی ہے اور آپ کو بھی یقیناً پڑھتے ہوئے مشکل پیش آئے گی سو آپ دوستوں اور بالخصوص اپنی سہولت کے لیے مَیں یہ تمام باتیں ''سلیس اُردو'' میں تحریر کروں گا۔ آپ نے میرا جو بگاڑنا ہے، بگاڑ لیں۔ مَیں تو پرورش لوح وقلم کرتا رہوں گا۔

''تم کوئی گریڈ بیس کے افسر ہو کہ تمہیں تمہارے اصلی نام سے بلاؤں ---؟'' ساوے نے اپنا مدقوق سا سینہ باہر نکالنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''مَیں رینک کے لحاظ سے بریگیڈیئر جنرل ہوں اور میرے سٹارز

یہ چھری ٹوکے ہیں۔ اِتنا ڈر تو فوجی سپاہی کو جنرل کے سٹارز سے نہیں لگتا جتنا بکرے اور تم جیسے دنبے میرے سٹارز سے ڈرتے ہیں۔'' قاسو نے اپنے آلاتِ قتل کی نمائش کی---''ویسے آپس کی بات ہے، تم میرے پاس آئے کیوں ہو۔ کیا کوئی اُدھار وغیرہ حاصل کرنے کا چکر ہے؟ اگر ایسی بات ہے تو پھر پیشگی معذرت۔ آج کل کاروبار بڑا مندے میں جا رہا ہے، خسارے پہ خسارا اُٹھا اُٹھا کر---''

''تیرا کیا خیال ہے، میں اُدھار مانگنے کے علاوہ کسی اور کام کے لیے کسی کے پاس نہیں جاتا؟'' ساوے نے بنا کسی ندامت کے کہا۔

''ایسا آج تک ہوا تو نہیں کہ تم کسی کے پاس گئے ہو اور تم نے اُدھار نہ مانگا ہو۔'' قاسو ایک طنزیہ مسکراہٹ سے بولا۔

''تو پھر آج دیکھ لو---میں واقعی اُدھار مانگنے نہیں، کسی اور کام سے آیا ہوں۔'' ساوا بولا۔

''ایں---کس کام سے؟''

قاسو مارے حیرانگی کے بے ہوش ہوتے ہوتے بچا---ساوے نے بکرے کے گلے میں پڑی رسّی کو ایک زوردار جھٹکا آگے کی طرف دیا جس سے بکرا بہ اَمر مجبوری دو قدم چل کر آگے ہو گیا۔ ساوے نے قاسو سے کہا۔

''دراصل میں یہ بکرا تمہارے ہاتھ فروخت کرنے کے لیے آیا ہوں۔''

''کون سا بکرا---؟'' قاسو نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر دیکھا جدھر بکرا موجود تھا مگر اس نے ظاہر یہی کیا جیسے بکرا اِسے نظر ہی نہ آیا ہو۔

''یہ والا---'' ساوے نے بکرے کا ایک کان پکڑ کر قاسو کو دِکھایا۔

''یہ بکرا ہے، اِسے بکرا کہہ رہا ہے تو؟---ساویا! کچھ ہوش کر، یہ تو پورا داند ہے۔'' قاسو نے بکرے کی کمزور بلکہ کمزور ترین صحت کو دیکھ کر کہا۔

''اِسے داند تو مت کہہ، یہ تو میرا چاند ہے چاند---'' ساوے نے بکرے کی پشت پر بڑے لاڈ سے ہاتھ پھیرا۔

''واقعی ہے تو چاند ہی لیکن ہے پہلی رات کا چاند---'' قاسو نے ایک بار پھر بکرے کے تنِ ضعیف کو طنز کا نشانہ بنایا۔

''خدا کا خوف کرو---دوسروں پر فقرہ کسنے سے پہلے اِنسان کو اپنے گریبان میں جھانک لینا چاہیے۔ اگر یہ پہلی رات کا چاند ہے تو تم کیا ہو، آخری تاریک رات؟'' ساوا اپنے بکرے کی ہتک و توہین برداشت نہ کر سکا۔

شغل + مغل

(شاعر حضرات سے بغیر معذرت کے ساتھ)

۞ محمد صابر مغل عبدو پوری: ہٹا لو اے جانِ من اپنے چہرے سے
یہ گھٹا جیسی زلفیں

☆ روز سالن سے ''بال'' نکلتے ہیں۔

۞ ڈاکٹر بی کے بلوچ: وقتِ رُخصت اس کی آنکھیں مجھ سے کہہ رہی تھیں
کہ پھر اپنے بھائیوں سے پٹواؤں گی تجھے

☆ اِتنی دیر میں پہلے زخموں پر پایوڈین لگا یئے۔

۞ نعیم خان نیازی: دِل کے ارماں آنسوں میں بہہ گئے
جو اُن سے کہنا تھا وہ ہم اُن کی اماں سے کہہ گئے

☆ چشمہ کا نمبر تبدیل کروالیجیے۔

۞ ڈاکٹر بی کے بلوچ: مظلوم تو ہر شوہر ہوتا ہے
مگر زمانہ کیوں اِنکاری ہے

☆ زمانے کو بیوی کے ہاتھ نہیں لگے اِس لیے۔

۞ محمد رفیق خان: جب سے بیگم گئی ہے میکے
گھر میں جنت کی ہوا چل رہی ہے

☆ اگر ''جنت'' کے ابے کو پتہ چل گیا تو؟

۞ محمد رفیق خان: بیگم سے پٹنا تو خیر برحق ہے
مگر نیند رات بھر کیوں نہیں آتی

☆ مزید پٹنے کے ڈر سے۔

۞ محمد ایاز: پہلے آتی تھی پڑوسن کھڑکی میں
مگر اَب نہیں آتی

☆ اس نے آپ کو غور سے دیکھا ہوگا اور اِس کا تراہ نکل گیا ہوگا۔

۞ محمد قربان، اوکاڑہ: ہمیں معلوم تھا کہ ''وہ'' نکلے گی بے وفا
اِس لیے ہم نے اِس کی چھوٹی بہن سے بھی لگا رکھی تھی

☆ اِسے کہتے ہیں دور اندیشی---!

۞ محمد قربان: اُس نے ہاتھوں پہ مہندی لگا رکھی تھی
ہم نے اُس کی ڈولی اُٹھا رکھی تھی

☆ اگر مہندی نہ لگائی ہوتی تو وہ آپ کو دو چار لگا دیتی۔

۞ یاوش منصور: سنا ہے ڈالی ہے تم نے دوکان میرج کی
اِسے کوئی سوہنی لڑکی دِکھا کہ مر جائے

☆ اگر مارنا ہی ہے تو سوہنی سی لڑکی بغیر میک اَپ کے دِکھایئے۔

۞ شاہد اطہر: رات بھر سوتا ہوں، نہ جاگتا ہوں
بس تیرے سائے کے پیچھے بھاگتا ہوں

☆ جب بھاگ بھاگ کر تھک جاؤ تو رکشہ کروالیجیے گا۔

۞ اکبر بخاری: سیانے بھی اِن کے ساتھ تھے کملے بھی اِن کے ساتھ تھے
پیسے والے ہی نہیں کنگلے بھی ان کے ساتھ تھے

☆ کیا ''وہ'' ریوڑیاں بانٹ رہے تھے۔

محمد صابر مغل عبدو پوری

''کیا کمی ہے مجھ میں---؟'' قاسو نے اپنے گول مٹول چہرے پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

''کمی تو نہیں البتہ زیادتی ضرور ہے---'' ساوے نے دِل میں کہا اور گویا ہوا۔ ''کمی ہے تجھ میں اِنسانیت کی' اور کمی ہے تجھ میں ایک من فیئر اینڈ لولی کی---''

''مجھ میں اِنسانیت کی کمی کہاں ہے؟--- اللہ کا ایک نیک بندہ ہوں۔ ابھی کل خالہ صغراں میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ میں نے بکرا بیچنا ہے' تم میرے گھر آ کر دیکھ لو۔ اللہ قسم! پندرہ سو کا بکرا ڈھائی ہزار میں لے آیا اِس لیے کہ میں جانتا تھا' اُسے بڑی ضرورت ہے آج کل روپوں کی اور ویسے دیتا تو وہ لینے سے اِنکار کر دیتی۔ میں نے سوچا کہ ایسے نیکی کروں کہ دوسرے ہاتھ کو بھی پتہ نہ چلے۔''

''وہ تو میں جانتا ہوں کہ تم خالہ صغراں کی بیٹی ناجو پر نظر رکھتے ہو اور اُس کی نظروں اور اُس کے دِل میں کوئی خالی پلاٹ حاصل کرنے کے لیے تم نے ''ٹور جماتے'' ہوئے زیادہ روپے دے دیئے ہوں گے لیکن منہ دھور کھو' وہ تمہیں گھاس نہیں ڈالنے والی اور نہ ہی اُس کے دِل کی کالونی میں کوئی پلاٹ خالی بچا ہے۔ ہر پلاٹ پر گاؤں کا کوئی نہ کوئی لڑکا قابض ہے۔'' ساوے نے گویا کڑوا سچ اُگل دیا۔

''اوئے' ساویا! تو نہیں جانتا کہ میں کتنا شریف' نیک اور پرہیز گار قسم کا بندہ ہوں۔ وہ تو میں نے اِن سیاستدانوں کی طرح کبھی اپنی نیکیوں کی نمائش نہیں کی ورنہ میں بھی ملک کا ایک نامور سماجی کارکن مشہور ہوتا۔ میں تو نیکی کر دریا میں ڈال'' کا قائل ہوں۔ خدا کی راہ میں خرچ کرنے والے کو اِس کا ڈھنڈورا نہیں پٹوانا چاہیے---'' قاسو نے اپنے لہجے میں عاجزی پیدا کرنے کی ایک ناکام کوشش کی' ناکام اِس لیے کہ اِس طرح اِس کے چہرے پر ہمہ وقت چھائے رہنے والی نحوست مزید بڑھ گئی تھی۔ قاسو اپنی اِس نحواست کو چھپانے کی بہتیری کوشش کرتا تھا مگر ''کیا بنے بات'' جہاں بات بنائے نہ بنے۔''

''واہ واہ' کیا عاجزی ہے۔ پھڑ بھی مار گئے اور خود کو عاجز بھی کہہ گئے۔ خالص امریکی پالیسی کا مظاہرہ کیا ہے تو نے--- ویسے قاسو! تیرے شجرہ نسب میں گزشتہ آٹھ نسلوں تک کوئی امریکی نہیں ہے' اِس سے پہلے کوئی ہو تو خاص فائدہ نہیں کہ تب امریکیوں کی اِتنی ویلیو نہیں تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تیرا شجرہ غلطی سے پہلی ہی پشت میں کسی امریکی سے---''

ساوے نے قاسو پر میٹھی چھری سے حملہ کرنا چاہا تھا مگر ناکام ہو گیا۔ قاسو اِس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ایک لمبی چھلانگ لگا کر ساوے تک آ پہنچا اور پھر ساوے کو ایکدم ایک زبردست قسم کا ''قصائی پنجا'' دیا' بکرے کی طرح اِس کو گھسیٹتا ہوا ''مقتل'' پر لے گیا اور ساوے کو چھری کی دھار دِکھانے لگا جو وہ ساوے پر ہی آزمانے کا عزم مصمم رکھتا تھا۔ ساوے کی سمجھ میں اِس وقت ''چھری تلے دَم لینا'' والا محاورہ اپنی پوری ہولناکی کے ساتھ آ گیا۔

''یہ چھری کی دھار دیکھ رہے ہو' اِتنی تیز ہے کہ تمہاری گردن کاٹ دے گیا اور تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے۔ جہنم کے فرشتوں سے پوچھو گے کہ مجھے یہاں کون چھوڑ گیا ہے' ابھی تو میں اپنے گاؤں میں تھا؟''

قاسو نے دہشت ناک لہجے میں کہا--- ساوا خوف سے بے حال ہو گیا اور ایک بار پھر اُس نے گدھے کو باپ بنا لیا۔

''مجھے معاف کر دو' قاسو بھائی! میں تو مذاق کر رہا تھا اور تم سیریس ہو گئے--- بھلا اِس میں بُرا ماننے والی کیا بات ہے۔ میں نے تمہیں امریکی کی اولاد کہا تو تم مجھے کہہ لو۔''

ساوے کی حالت چھری کو دیکھ دیکھ کر پتلی ہوئی جا رہی تھی اور وہ تصور میں اگلے روز کا اخبار دیکھ رہا تھا جس میں ایک دو کالمی خبر تھی کہ موضع فلاں فلاں کے ساکن قاسو قصائی نے ایک شخص کو چھری سے ذبح کر ڈالا' مقتول نے اُسے کوئی اشتعال انگیز بات کہہ دی تھی جس سے قاسو قصائی نے اُسے غصے میں آ کر موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

''تو تو ہے ہی امریکی کی اولاد' اِس لیے تجھے کیا فرق پڑے گا مگر میں نہیں ہوں اِس لیے مجھے فرق پڑتا ہے--- بہر حال' اِس دفعہ تو میں معاف کر دیتا ہوں مگر آئندہ ایسا کیا تو---''

قاسو نے اُسے ایک مخرب اخلاق دھمکی نما گالی سے نوازا اور ساوے کا گریبان چھوڑ کر اُس پر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ساوے نے اِتنی جلدی اور آسانی سے جان چھوٹ جانے پر خدا کا شکر ادا کیا اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اِس کے بعد ظاہر ہے' مروّت نام کی چیز کا ساوے اور قاسو قصائی کے درمیان کوئی دخل نہ تھا اِس لیے ساوے نے قاسو سے بکرے کی قیمت بتانے کا کہا۔ قاسو نے بکرے کی قیمت 250 روپے بتائی اور پھر بڑھا کر 300 پر ٹک گیا۔ ساوے کو چونکہ بکرا فروخت کرنا ہی تھا وگرنہ تین سو بھی نہ ملتے اِس لیے ساوے نے 300 روپے پر ہی اکتفا کیا اور قاسو سے اِس ہاتھ پیسے لے کر اُس ہاتھ بکرے کی رَسّی قاسو کے ہاتھ میں تھما دی۔ قاسو نے بکرے کو رَسّی سے پکڑ کر زور سے اپنی طرف کھینچا اور ساوے کے دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے بکرے کو چھری پھیر دی۔ ساوے کو چند لمحے پہلے والی صورتحال یاد آ گئی جب وہ خود اِسی چھری تلے سانس لے رہا تھا۔ اُس نے ایک بار پھر خدا کا شکر ادا کیا کہ قاسو نے

جوشِ جذبات میں اُس کے گلے پر چھری نہیں چلا دی ورنہ اُب تک وہ حساب کتاب سے فارغ ہو کر سوئے دوزخ عازم سفر ہوتا--- قاسو قصائی کی ایک ناک، سوری دوکان سے واپسی پر ساوے کے ذہن میں خیال آیا کہ اُس نے بکرے کی جو قیمت قاسو سے وصول کی ہے وہ توسیدھی زوجہ نمبر ایک کی جیب کشادہ میں چلی جائے گی اس لیے اُسے اپنا چائے پانی بنانے کے لیے زوجہ نمبر ایک کو بتانا چاہئے کہ بکرا 150 روپے میں بکا ہے اور باقی رقم اپنے کھیسے میں رکھ لینی چاہئے، اپنی اس ایماندارانہ سوچ پر ساوا مسکرا دیا--- اچانک ساوے کے کانوں میں زنانہ گالیوں کی جدید ترین ورائٹی آن ٹھہری۔ گالی نما شعروں کی اِس غزل کے ہر مصرعے میں آنے والا ساوے کا نام یہ شرمناک نتیجہ ظاہر کرتا تھا کہ اِن گالیوں کا ہدف بدقسمتی سے ساوا ہی ہے۔ بدقسمتی گالیاں دینے والی کی تھی جو یہ بھول گئی تھی کہ وہ ساوے کو گالیاں دے رہی ہے، ساوا! جو فنِ دشنام طرازی کا موجد ہے (بزعم خود) اور اپنے منہ سے گالی کے سوا کچھ نکالتا ہی نہیں۔ ساوا اپنے دُشمن کے ساتھ سب کے سامنے وہ کچھ کر سکنے کا دعویٰ کرسکتا ہے جو چھپ کر کرتے ہوئے بھی خوفِ خدا طاری ہو جاتا ہے اِس لیے صاف ظاہر ہے کہ اِن جدید ترین گالیوں کے جواب میں ساوے نے اپنی فصاحت و بلاغت کا مظاہرہ کرنا ہی تھا۔ ساوے نے بھی جواب آں غزل کے طور پر نو ایجاد گالیوں سے مخاطب کو نوازنا شروع کر دیا۔ مخاطب جو کہ ایک عورت تھی، وہ کیسے خاموش ہوتی۔ نتیجتاً دونوں کے درمیان دشنام طرازی کا مقابلہ شروع ہو گیا جو شاید تا قیامت جاری رہتا اگر اہل محلہ اِس مقابلے کی راہ میں حائل نہ ہوتے۔ اہل محلہ کی سر توڑ کوششوں کے بعد جب فریقین نے فائر بندی کر دی تو سب سے پہلے چاچی صفیہ نے ساوے کی مخاطب عورت سے دریافت کیا۔

''ہائے بہن، صابرہ! کیا کر رہی تھیں اور کیوں--- تمہیں شرم نہیں آئی اِتنی خفیہ زنانہ اصطلاحات کو اِس طرح بیچ بازار بیان کرتے ہوئے؟''

''ارے اِس مرجانے کو شرم نہیں آئی تو مجھے کیوں آئے، مَیں کیا کسی سے کم بے شرم---'' بہن صابرہ نے اپنی بے شرمی کا اظہار ہو جانے پر فوراً منہ بند کر لیا۔

''کیوں اوئے ساویا! شرم نہیں آئی تجھے اِس طرح کرتے ہوئے--- گھر میں بیویوں سے گالیاں کھا کے تیرا جی نہیں بھرتا جو اَب گلیوں میں بھی یہی کام شروع کر دیا ہے---؟'' چاچا صدیق بولا۔

''مجھے کیا کہتے ہو، صابرہ کو کہو جس نے ایکدم ہی بغیر کسی وجہ کے مجھ پر گالیوں کا فائر کھول دیا تھا۔ مجھے تو کچھ پتا نہیں کہ یہ کیا معاملہ ہے۔''

باذوق قارئین کے لیے بیبیے اشعار

مسئلہ

شیخ اپنی رگ کو کیا کریں، ریشے کو کیا کریں
مذہب کے جھگڑے چھوڑیں تو پیشے کو کیا کریں
فرہاد سے کہا کہ مناسب ہے تجھ کو صبر
کہنے لگا، بتائیے تیشے کو کیا کریں
(اکبرالہ آبادی)

امپورٹڈ کفن

انتہا بھی اس کی ہے، آخر خریدیں کب تلک
چھتریاں، رومال، مفلر پیرہن جاپان سے
اپنی غفلت کی یہی حالت اگر قائم رہی
آئیں گے غسال کابل سے، کفن جاپان سے
(علامہ اقبالؒ)

مماثلت

اپنی دولت، اور غیروں کے اُڑانے کے لیے
کوئی کھانے کے لیے، کوئی کمانے کے لیے
آپ ہی کی خو ہے بالکل آپ کے ت میں بھی
بے تحاشا دوڑتا ہے کاٹ کھانے کے لیے
(احمق پھپھوندوی)

تیرے اِنتظار میں

تڑپتی دھوپ میں کجلا گئے، کیا تم نہ آؤ گے
جہاں تم نے کہا، ہم آ گئے، کیا تم نہ آؤ گے
سحر سے دوپہر تک پان والے کی دوکان سے ہم
کوئی پچیس پتے کھا گئے، کیا تم نہ آؤ گے
(آذر عسکری)

فقط!

زمین نیچے ہے، اوپر آسماں ہے
خدا رکھے بہت اچھا مکاں ہے
کا غفلت پہ ہجوم عاشقاں ہے
تو مسجد میں فقط ''گل شیر خاں'' ہے
(مجید لاہوری)

ترتیب و انتخاب ۞ سیّد بدر سعید

ساوے نے اپنی صفائی پیش کی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر اِس کا قصور ثابت ہوگیا تو پھر اِن سب سے اُسے بڑی مار پڑے گی۔

''آخر تمہیں ہوا کیا تھا جو ایسے ایک دوسرے کو گالیاں دے رہے تھے---بہن صابرہ! تمہی بتاؤ' کیا معاملہ ہے۔ کہیں ساوے سے اُدھار کی واپسی کا معاملہ تو نہیں ہے؟'' صدیق صاحب نے اپنی طرف سے معاملے کی تہہ تک پہنچ کر کہا۔

''میرے خیال میں یہ معاملہ نہیں ہے۔ ساوے سے کون اُدھار واپس مانگ سکتا ہے' سب جانتے ہیں کہ سمندر میں ڈوبے ہوئے روپے واپس مل سکتے ہیں مگر ساوے کے ہاتھ گئے ہوئے نہیں---میرا خیال ہے' یہ کوئی اور ہی چکر ہے۔ کیوں' ساوے! تم نے کیا کِیا ہے؟'' ریاض صاحب نے اپنا تجزیہ پیش کیا۔

''مَیں نے تو کچھ نہیں کیا' مَیں تو اپنے خیالوں میں مگن جا رہا تھا کہ اچانک ہی صابرہ نے مجھے بلا کسی جواز کے گالیاں دینی شروع کردیں اور گالیاں سن کر مَیں کہاں چپ رہ سکتا تھا۔ آپ کو میرا پتا ہی ہے کہ سوتے وقت بھی کسی نہ کسی کو گالیاں دے رہا ہوتا ہوں---باقی اصل معاملے کے بارے میں مَیں بھی اِتنا ہی بے خبر ہوں جتنا کہ آپ ہیں۔'' ساوا گڑگڑا کے بولا۔

''دیکھو' اَب کیسا میسنا بن رہا ہے۔ اِس وقت مجھے آنکھ مارتے ہوئے تو نے کیا سمجھ لیا تھا کہ فوراً تیرے ساتھ ٹانکا لگالیتی---ارے مَیں تو تیرے جیسے مردوں کو گھاس بھی نہیں ڈالتی۔'' یہ کہتے ہوئے صابرہ کا انداز ایسا تھا جیسے کہہ رہی ہو کہ تم سے بہتر اگر کوئی ہو تو پھر گھاس تو کیا' ونڈا بھی ڈال دیتی ہوں---''ریاض بھائی! اِس نے مجھے آنکھ ماری تھی اور اِس کے بعد شیطانی انداز میں مسکرایا تھا جس پر مَیں نے اِسے گالی دی تو جواباً اِس نے بھی---باقی آپ کو علم ہی ہے کہ پھر کیا ہوا تھا۔''

''خوف خدا کرو کچھ' صابرہ! مَیں نے کب تمہیں آنکھ ماری تھی اور کب تمہیں دیکھ کر مسکرایا تھا؟'' ساوا بدک اُٹھا۔ ''مجھ سے قسم لے لو---''

مگر اُس کی قسم پر کون اعتبار کرتا' سب جانتے تھے کہ ساوا دھیلے کے لیے بھی قسم کھا سکتا ہے اور یہاں تو جان بچانے کا معاملہ تھا۔ اِن سب کو اپنی طرف جارحانہ انداز میں بڑھتے دیکھ کر ساوے کا ذہن احتیاطی تدابیر ڈھونڈھنے کے لیے سوچ کے سمندر میں غوطہ خوری کے لیے چلا گیا۔ اِتنا تو وہ صابرہ کے بیان سے اندازہ لگا ہی چکا تھا کہ جب وہ اپنی ایماندارانہ سوچ پر بے اختیار مسکرایا تھا تب ہی صابرہ نے اِس کا کوئی غلط مطلب لے لیا تھا اور نتیجتاً اَب وہ سمجھ چکا تھا کہ صابرہ کے بیان کے بعد اِس کی ''صحت صفائی'' بہت کمزور ہو چکی تھی اور اِس نے اگر اپنی جان بچانے کے لیے کوئی حربہ اختیار نہ کیا تو پھر جلد ہی اِس کی داستاں تک نہ ہوگی داستانوں میں---صابرہ نے چونکہ اپنا کیس مضبوط کرنے کے لیے ساوے پر ایک آدھ الزام اور تھوپ دیا تھا اِس لیے وہ اہل محلّہ کی ہمدردی حاصل کرنے میں کامیاب رہی تھی جن کا گرافت ویسے بھی عورت کی طرف جھکاؤ رکھتا ہے۔ سوچ کے سمندر میں غوطہ زن ساوے کے ہاتھ ایک گوہر خیال آیا جس کو عملی ''کپڑا'' پہنانے کے لیے اِس نے چاچی صفیہ سے کہا جو کہ صابرہ کی زنانہ زون کی طرف سے سب سے بڑی حمایتی تھی۔

''صفیہ! تم ہی بتاؤ کیا مَیں ایسا لگتا ہوں---؟''

''ایسا سے تمہارا کیا مطلب ہے؟'' چاچی صفیہ جو کہ اپنا سینڈل اُتار کر ہاتھ میں پکڑ چکی تھی' خفگی سے بولی۔

''میرا مطلب ہے---'' ساوے نے وضاحت کی۔ ''تم خود ہی بتاؤ' اگر مَیں شوقین مزاج ہوتا تو چالیس سال میری عمر ہوگئی ہے' کہیں سے کوئی ایسی بات تم نے سنی ہے؟---ویسے بھی ساوا چاہے جہاں کا بُرا ہو مگر کسی کی ماں' بہن سے ایسی نیچ حرکت نہیں کرسکتا۔ تم خود گواہ ہو---''

صفیہ کے چہرے کی رنگت سرخ ہوگئی' شاید کچھ نہ یاد آنے والے واقعات یاد آنے پر---''تم ہی بتاؤ' اگر مَیں ایسا ہوتا تو تمہیں نہ چھیڑا کرتا یا تم سے دِل لگانے کی کوشش نہ کرتا جبکہ تم صابرہ سے ہزار درجہ حسین اور خوبرو ہو۔ خود ہی سوچو کہ اگر مَیں تم جیسی خوبصورت عورت کے ساتھ ایسی کوئی حرکت نہیں کرتا تو پھر صابرہ جیسی بے ڈھنگی اور بدصورت عورت کے ساتھ چھیڑخانی کیسے کرسکتا ہوں؟'' ساوے نے اپنا کیس چرب زبانی اور مکھن کے بھرپور استعمال سے پیش کیا۔

''بدصورت تم ہو' تمہاری ماں ہے جس نے تم جیسے بدشکل کو جنا ہے۔ بدشکل تمہاری اولاد جو تم جیسے بے ڈھنگے کی اولاد ہے---ارے بھائیو! اِسے مارتے کیوں نہیں' کیا تم ماں بہنوں والے نہیں ہو؟''

صابرہ غصے سے پھٹ پڑی۔ بھلا کون سی ایسی عورت ہے جو خود پر بدصورتی جیسا لفظ لاگو ہوتا برداشت کرلے اور پھر صابرہ جیسی زبان دراز عورت!---صابرہ کی بات سن کر سب مرد و زن کی توپوں کا رُخ ساوے کی طرف ہوگیا لیکن صفیہ نے قبل از فائر' سیز فائر کرادیا اور سب کے سامنے آکر بولی۔

''دیکھو جی' ساوے نے اپنی صفائی میں جو کچھ کہا ہے' دِل کو لگتا ہے کہ یہ بے قصور ہے اور قصور سارا اِس ڈائن کا ہے اِس لیے ساوے کو چھوڑ دو' خواہ مخواہ اِسے مار کر اِس غریب نادار کی بددُعائیں لینے کا کیا فائدہ؟''

ساوے نے جو صفیہ پر لگائے گئے منوں وزنی مکھن کو رائیگاں جاتے دیکھ کر خوفزدہ اور پریشان ہو گیا تھا اور متوقع طور پر اور متفقہ طور پر چنے والے لتروں کو سہہ لینے کے لیے خود کو تیار کر چکا تھا' جب صفیہ کو اپنے لگائے گئے مکھن پر آ کر سلپ ہوتے دیکھا تو اُس کی رگ رگ میں خوشی کی لہر دوڑنے لگی کیونکہ صفیہ کی حمایت ہی تمام توپوں کا رُخ موڑنے کے لیے کافی تھی۔ صابرہ نے جو اپنی سب سے بڑی حمایتی سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی' غصے سے پاؤں پٹخا اور تمام حاضرین مجمع کو رہی گالیاں دیتے ہوئے وہاں سے روانہ ہو گئی جو وہ کچھ دیر پہلے ساوے کو دے رہی تھی۔ اس کی اِن نوازشوں یعنی گالیوں پر تمام افراد صفیہ کی اِس بات سے قائل ہو گئے کہ سارا قصور اصابرہ کا ہے اور ساوا بے گناہ ہے اور پھر ساوے کے لیے وہاں سے کھسک آنا چنداں مشکل نہ تھا--- ساوا اِسی طرح سرِعام اپنے فن دشنام طرازی کا مظاہرہ کرتا رہتا ہے اور چونکہ وہ فن دشنام طرازی کی انتہا پر ہے اِس لیے وہ ادائے فن کے وقت بھول جاتا ہے کہ وہ کس سے مخاطب ہے۔ ایک دفعہ تو ساوا جب غصے کی انتہا پر تھا' روانی میں اپنے برخوردار نمبر 1 المعروف منیرا اکڑ کو بجو کی اولاد کہہ گیا تھا جس پر منیرے نے حیران ہو کر کہہ دیا تھا کہ ابا! ویسے تم شکل سے لگتے نہیں ہو--- ساوا گالی کو اِس طرح خود پر ہی پلٹتے دیکھ کر مزید اشتعال میں آ گیا تھا اور کہہ اُٹھا تھا۔

''کھوتے کے پترا! چپ کر میں تیرا ''پیو'' ہوں۔''

منیرے نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ ''ہاں' اَب ٹھیک کہا ہے۔ تم شکل سے بھی یہی محسوس ہوتے ہو۔''

پھر وہ فوراً بھاگ کھڑا ہوا تھا مگر باوجود 160 میل فی گھنٹے کی رفتار کے ساوے کے فائر کردہ ''چھتر میزائل'' سے نہیں بچ سکا تھا اور چھتر میزائل ٹھیک اِس کی جائے تشریف پر جا لگا تھا--- اِس روز بھی گھر واپسی پر وہ بھول گیا تھا کہ جس گلی میں وہ چل رہا ہے اِس گلی میں کاریز جتنی نالیوں کی بہتات ہے۔ اِس نالی فراموشی کی سزا اِسے آبِ غیظ میں غرقاب ہونے کی صورت میں ملی اور اپنے ''صاف ستھرے'' جسم اور کپڑوں کو دیکھ کر وہ تاسف کی اِنتہا پر پہنچ گیا۔ ساوے نے انتہائی شرمندگی کے ساتھ خود کو اِس آبِ رواں وگنداں سے باہر نکالا اور منہ پر سے اِس شیریں اور میٹھے کیچڑ کو اُتارنے لگا جو گاؤں والوں کی خوش خوراکی کا نتیجہ تھا اور پھر سر جھکائے گھر کی طرف عازم سفر ہو گیا۔ بدقسمتی سے چونکہ یہ روزِ حماقت تھا اِس لیے ایک موڑ مڑتے ہوئے اِس کی ملاقات ایک بار پھر اپنے ازلی دُشمن کاکے سے ہو گئی اور اِس سے پہلے کہ وہ ساوے کی حالت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اِس پر کوئی فقرہ کستا' ساوے نے جھٹ اِسے اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے لیا اور اِس سے جپھی ڈال لی۔ کاکا' ساوے کا ایسا دُشمن تھا کہ اگر ساوا اِس کے لیے اپنی جان بھی دے دیتا تب بھی وہ یہی کہتا کہ ضرور اِس میں بھی ساوے کا کوئی مفاد ہے۔ کئی بار عید کے روز ساوے نے مسجد میں اِس سے رسمِ دُنیا نبھانے اور دستور پورا کرنے کے لیے عید ملنے کی کوشش کی تو کاکا منہ پھیر کر کھڑا ہو جاتا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ساوے کو عید ملنے کے بھی قابل نہیں سمجھتا مگر بالآخر ساوے نے بھی ایک دِن اِس سے عید مل لی تھی اور کاکے جیسے دُشمن سے عید ملنے کے عہد میں کامیاب ہو کر سرخرو ہوا تھا مگر کاکے نے بعد میں اِس سے عید ملنے کی یہ تاویل پیش کی تھی کہ چونکہ اِس دِن اُس کی دونوں جیبیں خالی تھیں اِس لیے اُسے ساوے سے عید ملنے میں کسی نقصان کا اندیشہ محسوس نہ ہوا تھا اور اُس نے بغیر کسی تردّد کے ساوے کو گلے لگا لیا تھا--- ساوے کے بارے میں ایسے خیالات

ماتمِ بجلی

محفل شعر و سخن یوں تو سجائی رات بھر
بے سرے نغمے سنائے' ہیر گائی رات بھر
جب گئی بجلی اچانک' سارے پاکستان کو
گالیاں بکتا رہا جورو کا بھائی رات بھر
مچھروں نے راگ بھیں بھیں کا سنایا جس گھڑی
ساتھ ہم نے بھی دیا' تالی بجائی رات بھر
ایک پل بھی چین سے سونے دیا نہ رات میں
صحن میں ہم نے گھسیٹی چارپائی رات بھر
شیخ جی بیٹھے رہے اپنی دکاں کو کھول کر
اِک دیا روشن کیا' اور کی کمائی رات بھر
موم بتی کر کے روشن کام اپنے سب کیئے
خوں جلایا' دِل جلایا' جاں جلائی رات بھر
کروٹیں لیتے رہے ہم فجر کی اذان تک
ماتمِ بجلی کیا' اور دی دُہائی رات بھر
زندگی بے کیف اور بے رنگ ہو کر رہ گئی
بلبلاتی ہی رہی محرم خدائی رات بھر

رفیع یوسفی محرم
5-A-12/4 ناظم آباد' کراچی

رکھنے والا کاکا اگر ساوے کی موجودہ حرکت پر طیش میں نہ آتا تو پھر کیا کرتا؟ ساوے نے گلے ملنے کا بہانہ بنا کر اپنے کپڑوں اور ہاتھوں پر لگی ہوئی اِس خوش رنگ وخوشبودار کیچڑ کو جو اِسے گندی نالی میں گرنے کی وجہ سے عطا ہوئی تھی' کاکے کے سفید لٹھے کے نئے کھڑکھڑاتے سوٹ پر نت نئے دِلفریب ودیدہ زیب نقش ونگار بنا کر اپنی اِس چالاکی پر ہنسنا شروع کردیا۔ کاکے نے جب اِسے دانت نکالتے ہوئے اور اپنے نئے سوٹ کی ناگفتہ بہ حالت کو دیکھا تو فرطِ طیش میں ایک عدد زوردار مکا ساوے کے نحوست زدہ چہرے پر ماردیا۔ اَب یہ ساوے کی خوش قسمتی تھی کہ اُسے دُشمن بھی اپنے ہی جیسا ملا تھا (صحت کے لحاظ سے) وگرنہ اُس کی دُشمنی اگر شیدے پہلوان یا قاسو قصائی جیسے کسی طاقتور شخص سے ہوتی تو اِس مکے کے پیچھے کارفرما جذبات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ اَمر صاف نظر آتا تھا کہ اِس مکے سے ساوے کا ''ڈب کھڑبا'' چہرہ چپٹا ہوجاتا مگر چونکہ مکا مارنے والا بھی ساوے کی طرح مرنجاں مرنج ہی تھا اِس لیے یہ توقع صرف ناک کی حد تک ہی پوری ہوئی۔ اِس زوردار مکے کے فوراً بعد اُوپر تلے پڑنے والے مکوں اور لاتوں نے اُسے حقائق کی دُنیا میں لاکھڑا کیا اور حقائق چونکہ اُس کی شرارت کی وجہ سے اُس کے خلاف ہی تھے اِس لیے اُس نے کاکے سے دودو ہاتھ کرنے کے برسوں کی حسرت کو دِل میں ہی دفنائے رکھا اور موقع واردات سے فرار ہونے میں ہی عافیت جانی۔ ڈیڑھ سو میل فی گھنٹے کی سپیڈ سے گاؤں کی ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں بھاگتے ہوئے اچانک ہی اِس پر ایک رُوح فرسا اِنکشاف ہوا کہ کاکا جوشِ اِنتقام سے مغلوب اِس کے تعاقب میں تھا۔ یہ اِنکشاف کاکے کے منہ سے نکل پڑنے والی شدید اور بہترین قسم کی مغلظات سے ہوا تھا جن کا ہدف لازمی طور پر ساوا ہی تھا۔ اِس خوف سے کہ کاکا اِس کے پیچھے پیچھے ہے' وہ سہم گیا کہ اَب ضرور اِس کا آخری وقت ہے اور درحقیقت اِس کے پیچھے کاکا نہیں' فرشتہ اجل ہے جس نے ساوے کو جل دینے کے لیے کاکا کا بہروپ اختیار کررکھا ہے مگر یہ سوچتے ہوئے بھی وہ رُکا نہیں' تیزی سے دو تین موڑ مڑ کر سامنے آنے والی مسجد میں جا گھسا اور ایک اوپن ایئر غسلخانے میں گھس کر اندر سے دروازہ بند کرکے باہر سے آنے والی آوازوں پر کان دھرلیا۔ کاکا جو کہ بڑی کامیابی کے ساتھ ساوے کا تعاقب کررہا تھا' ساوے کو غائب پاکر پریشان ہوگیا اور پریشانی کے اِسی عالم میں اِس کی ملاقات شیخ اکبر سے ہوگئی۔ یہ ملاقات بالکل مسجد کے دروازے کے سامنے ہوئی۔ شیخ اکبر کی طرف سے باعثِ پریشانی دریافت کرنے پر کاکے نے اُنہیں بتایا کہ وہ آج اِنسان سے ایک قاتل کے رُتبے پر ترقی کرجائے گا لیکن شرط یہ ہے کہ اِسے ساوا مل جائے۔

''یہ کپڑے آپ دیکھ رہے ہیں' ساوے نے اپنے گندے ہاتھ لگا کر اِن کپڑوں کی یہ حالت کی ہے مگر پھر میرے ہاتھوں مرنے کی بجائے بھاگ آیا۔ مَیں بھی اِس کے پیچھے پیچھے تھا' یہاں اِس گلی میں آکر وہ غائب ہوگیا ہے مگر جائے گا کہاں بچ کر---میرا نام بھی کاکا ہے۔ بندہ اگر کسی بل میں بھی چھپا ہوا ہو تو وہاں سے بھی ہاتھ ڈال کر نکال لیتا ہوں۔''

شیخ اکبر نے اپنے ہاتھوں میں موجود تسبیح نمائشی طور پر رولتے ہوئے کاکے کے ''دِیدہ زیب ڈیزائن'' والے سوٹ کو بغور دیکھا اور پھر گویا ہوا۔

''مانا کہ ساوا ایک بہت گندا شخص ہے مگر اِتنا بھی نہیں ہے کہ اِس کے ہاتھ لگانے سے کپڑوں کی حالت ایسی ہوجائے؟''

''شیخ صاحب! میرے خیال میں وہ اِس وقت کسی نالی کے پانی سے غسل فرما کر آرہا تھا جب اِس نے مجھے ''جپھا'' مارلیا۔'' کاکے نے کہا۔ ''دیکھیں' اِس نے میرے نئے نکور کنوارے سوٹ کی کیا حالت کردی ہے۔ کتنے چاؤ سے سلوایا تھا مَیں نے مگر اُس نے اِس کا ستیاناس کردیا۔''

کاکے کی آبدیدگی پر شیخ اکبر بھی دِکھاوے کے طور پر ''سوں سوں'' کرنے لگے اور آزردہ لہجے میں بولے۔ ''صبر کر' کاکے! اللہ صابر لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ ضرور مدد کرے گا تمہاری اور ساوے کو کیفرِکردار تک پہنچانے کے لیے تمہاری راہنمائی کرے گا۔ بے شک ساوے جیسے خبیث شخص کی گردن زنی کارِثواب ہے' کمبخت میری بھی دوکان سے کوئی نہ کوئی چیز ہر روز اُٹھا کر لے جاتا ہے۔'' شیخ صاحب یہ کہہ کر ایک بار پھر تسبیح رولتے ہوئے کاکے سے چلنے کی اجازت چاہنے لگے۔

''شیخ صاحب! جانے سے پہلے یہ تو بتا جائیے کہ آپ نے اِس خبیث کو دیکھا تو نہیں؟'' کاکا بول پڑا۔

''نہیں' دیکھا تو نہیں اور میرا خیال یہی ہے کہ مَیں جدھر سے آرہا ہوں' وہ خبیث اِدھر نہیں گیا۔''

''پھر وہ جا کہاں سکتا ہے---؟'' کاکے نے سوچ کر سمندر میں غرقاب ہوتے ہوئے زیرِلب کہا۔

''کہیں مسجد میں نہ گھس گیا ہو۔''

شیخ صاحب نے اچانک کہا تو ساوا یہ بات سن کر سر سے پاؤں تک کانپ اُٹھا۔

''کیا مذاق کرتے ہو' شیخ صاحب! ساوا اور مسجد میں؟---وہ تو عید کے دِن بھی اِس لیے مسجد میں آتا ہے کہ اِس دِن لوگوں کی جیبیں

وہ آج کل خاموشی سے کام کرنا سیکھ رہا ہے کیونکہ عنقریب اس کی شادی ہونے والی ہے ☺ سید شعبان گیلانی

ہوتی ہیں اور وہ عید ملنے کے بہانے یہ جیبیں خالی کر دیتا ہے---
نا سمجھوں والی باتیں کرتے ہو شیخ جی؟'' کاکے نے حیانگی ظاہر کی
خری فقرہ یوں ادا کیا جیسے کہہ رہا ہو کہ آپ بھی نرے احمق ہیں جو یہ
ہیں کہ ساوا مسجد میں چھپ گیا ہوگا۔

''بات تو تمہاری واقعی ٹھیک ہے۔ ایک دو بار میرے ساتھ بھی جیبیں خالی ہونے والے واقعات پیش آئے تو میَں سمجھ گیا کہ یہ کام ے کا ہی ہے اور اِس کے بعد میَں نے ساوے سے عید ملنے سے مکمل پر اجتناب برتا اور الحمدللہ! تب سے میَں جیب خالی ہونے والے کے سے محفوظ ہی رہا۔'' شیخ صاحب نے کاکے کی تائید کی اور چل ے نکر جاتے جاتے اُنہوں نے یہ کہا۔ ''تم مسجد میں احتیاطاً دیکھ ہی لو' ہے کہ وہ مرنے سے بچنے کے لیے وہاں چھپ ہی گیا ہو۔''

ساوا' شیخ صاحب کی بات سن کر ایک بار پھر لرز گیا اور اِسی لرزہ گیر ت میں اُس نے دِل میں عزمِ مصمم کر لیا کہ اگر خوبی قسمت سے وہ ے کے ہاتھوں مقتول ہونے سے بچ گیا تو شیخ صاحب سے بھرپور م لے گا مگر اُس کی قسمت اچھی تھی کیونکہ کاکے نے شیخ صاحب کو ب دیا تھا۔

''میَں خوب جانتا ہوں ساوے کو' وہ مسجد میں داخل ہونے پر موت رجیح دیتا ہے--- خیر میَں اُسے پیچھے ڈھونڈھتا ہوں۔''

ساوے نے کاکے کی خام خیالی پر مسرت کا اِظہار کیا اور اِس کے ہونے کا اچھی طرح یقین کرنے کے بعد وہیں اِسی اوپن ائیر خانے میں کپڑوں سمیت نہا کر اِس غلاظت کو اپنے بدن پر سے نے لگا۔ یہ اُس کی زندگی کا پہلا موقع تھا کہ وہ ایک دِن میں دوسری ہا تھا لیکن مجبوری میں سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ مرتا کیا نہ کرتا' کے اق اُس نے خوب مل مل کر اپنے نام نہاد پاکیزہ بدن اور کپڑوں کو غلاظت سے پاک کیا اور پھر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ چلنے سے وہ اپنی وہ رقم غسلخانے کی دیوار سے اُٹھانا نہ بھولا تھا جو اِس نے نے سے پہلے کپڑوں میں سے نکال کر وہاں رکھ دی تھی۔ جب وہ گھر تو زوجہ نمبر ایک نے اُس کا خیر مقدم ایک پر جوش گالی سے کیا اور پھر ے کوستے ہوئے بولی۔

''ساویا! تو نہا کر آ رہا ہے---؟''

''میَں نہایا نہیں نہایا' تم چھوڑو اِس بات کو--- مجھے جلدی جلدی کپڑے دو ورنہ کار پردرازی ہائے کریا کرم کرو۔ میَں سردی سے کر آدھا رہ گیا ہوں۔'' ساوے نے مرتی ہوئی آواز میں اِس سے

بڑی مشکل ہے

افسر آیا گرو گھنٹال' بڑی مشکل ہے
چلنی مشکل ہے یہاں چال' بڑی مشکل ہے

شیخ جی کھاتے رہے' کھاتے رہے' کھاتے رہے
چھوڑ دیں کیسے وہ تر مال' بڑی مشکل ہے

ہاتھ کو روکنا دعوت میں ہے کارے دارد
پیٹ اَب ہو گیا فٹ بال' بڑی مشکل ہے

راستے بھر تو کبابوں کی مہک آتی رہی
گھر جو پہنچے تو ملی دال' بڑی مشکل ہے

کھیر وہ مجھ کو ملی' میَں نے چھپائی لیکن
یار ٹپکانے لگا رال' بڑی مشکل ہے

بولا عاشق کہ دَرِ یار پہ جاؤں کیسے
ایک کتّا ہے لیا پال' بڑی مشکل ہے

جیب میں پائی نہیں' سردی لگی بیگم کو
لائیں کیسے وہ نئی شال' بڑی مشکل ہے

آج دعوت ہے نہاری کی مگر کیا کہیے
ہم کو آنے لگے اسہال' بڑی مشکل ہے

بیوی تہمینہ بنی اور ہے بیٹا سہراب
باپ رُستم کا ہوا زال' بڑی مشکل ہے

خواب میں مجھ سے سمرقند و بخارا بولے
اپنی قیمت ہے فقط خال' بڑی مشکل ہے

نیند جب آنے لگی' ہم نے یہ سوچا' سو لیں
جوش میں آ گیا قوال' بڑی مشکل ہے

شدتِ عشق نے عاشق کو کیا دیوانہ
آ گیا حسن کو بھی حال' بڑی مشکل ہے

پھوؔل جی رہتے ہیں گلشن میں' مگر اَے یارو!
یاں ہے کانٹوں نے بنا جال' بڑی مشکل ہے

✿ تنویر پھوؔل
tanwirphool@gmail.com

''تم نے ضرور کوئی ایسا کام کیا ہوگا کہ تم پر نہانا واجب ہو گیا ہوگا--- جلدی جلدی بتاؤ' وہ کون تھی؟'' زوجہ نمبر ایک نے مشکوک نظروں سے اُسے گھورا۔

''عجیب عورت ہے تو--- تیرا حقیقی اکلوتا مجازی خدا سردی کی شدت سے قریب المرگ ہے اور تو کپڑے دینے کی بجائے باتیں بنائے جارہی ہے---''

ساوے نے ایسے کانپتے ہوئے کہا جیسے اِس پر نزع کا عالم طاری ہو۔ زوجہ نمبر ایک سمجھ گئی کہا گر اِسے کپڑے نہ دیئے تو پھر واقعی اِس کے کریا کرم کا بندوبست کرنا پڑے گا۔ آخر وہ ساوے کی بیوی تھی' اگر وہ ساوے کی مزاج آشنا نہ ہوتی تو کون ہوتا؟--- وہ جلدی سے کپڑے اُٹھالائی اور ساوے کو دیئے۔ ساوے نے بے تابی سے وہیں صحن میں کپڑے بدلنے کا اِرادہ ہی کیا تھا کہ زوجہ نمبر ایک چلائی۔

''شرم کرو--- ساری اولاد دیکھ رہی ہے تمہیں---''

بچوں کے ہنسنے پر اور بیوی کے چلانے پر ساوے کو ہوش آیا اور وہ کپڑے بدلنے کے لیے اپنے علیحدہ کمرے میں چلا گیا۔ وہاں بھی تقریباً نصف درجن اولاد ساوا موجود تھی اور محوِ شغل شور مچائی تھی۔ ساوے کی ایک ہی ڈھاڑ سن کر وہ سب باہر نکل گئے اور ساوا آرام سے کپڑے بدل کر بستر میں گھس کر رضائی میں لپٹ کر لیٹ گیا۔ ابھی اُسے لیٹے ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ زوجہ نمبر ایک اندر داخل ہوئی اور اُس سے بکرے کے بارے میں دریافت کیا۔ ساوے نے پہلے تو شرارت کے طور پر اُسے کہا کہ وہ بکرا لے کر جارہا تھا کہ راستے میں ہی بکرا صاحب راہگذارِ زیست پر سفر کر کے منزل اَجل پر پہنچ گئے۔ ایمان سے' قصائی کو بھی بلا کر لانے کی مہلت نہیں ملی۔ چٹ گرا' پٹ مرا--- پھر بیوی کے زور دینے پر آخر کار ساوے کو سچ بولنا ہی پڑا' وہی سچ جو وہ راستے میں سوچ کر آیا تھا مگر ساوے کی خلافِ توقع زوجہ نمبر ایک غصے میں آ گئی اور فرطِ اشتعال سے بید مجنوں کی طرح لرزنے لگی۔

''بکرا بیچ کر آئے ہو یا مرغا؟--- غضب خدا کا! پورا بکرا صرف ڈیڑھ سو روپے میں بیچ دیا--- نہیں' تم نے بکرا مہنگا بیچا ہوگا اور باقی پیسوں کی چرس پی گئے ہو گے یا پھر نہانے کی وجہ پر خرچ کر آئے ہو گے۔'' ساوے کے نہانے پر وہ پہلے ہی مشکوک تھی۔ ''سچ سچ بتاؤ' کتنے کا بیچا ہے بکرا---؟''

حالانکہ زوجہ نمبر ایک کے حلق سے ایسی آوازیں نکل رہی تھیں کہ کمزور دل بندہ ڈر کر قتل کا بھی جھوٹا الزام قبول کر کے اقبالِ جرم کر لیتا اور پھر اس نے زوجہ نمبر دو کو بھی اپنی مدد کے لیے بلوا لیا تھا مگر ساوا تب بھی نہ ڈرا اور اپنے موقف پر ڈٹا رہا۔ مقابل بھی اِس کی بیویاں تھیں جو ا[illegible] رگ رگ سے واقف تھیں۔ اُنہوں نے ساوے کی ایک نہ سنی او[illegible] سے بکرے کی اصل قیمت فروکت دریافت کرنے پر تلی رہیں۔

''اے بیگمان ظالم! تم یقین کرو' بکرا ڈیڑھ سو میں ہی بیچا [illegible] نے---شکر کرو کہ وہ بک تو گیا ورنہ قاسو نے تو یہ کہہ کر انکار کر دیا [illegible] میں اِس بکرے کو لے کر کیا کروں گا' بھلا ہڈیاں بیچوں گا اِس کی؟ گوشت تو اِس پر تھا ہی نہیں اور تم کہہ رہی ہو کہ اِتنی قیمت کم ہے۔ [illegible] سمجھو کہ بکرا لاکھ کا بکا ہے' اِس کی ڈیڑھ سو روپے قیمت لاکھ کے [illegible] ہے۔''

ساوے نے اُنہیں قائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا [illegible] بھی اِسی کی بیویاں تھیں جو اپنے اِسی موقف پر ڈٹی رہیں کہ ہزاروں [illegible] تھا جس کی قیمت لے کر ساوا ڈکار گیا ہے اور اَب اِن کی اشک شو[ئی کے] لیے اِنہیں ڈیڑھ سو روپے دے رہا تھا۔ جب ساوا کسی بھی طور ن[ہ مانا تو] اُنہوں نے متفقہ طور پر ساوے کی دھنائی شروع کر دی۔ اپنی فرضی [illegible] خرد برد کرنے کی سزا کے طور پر ڈنڈے' سینڈل اور چمٹے کا آ[زادانہ] استعمال کرنے کے بعد جب اُنہوں نے دیکھا کہ ساوا اَب بے ہو[ش ہو] گیا ہے زخموں کی تاب نہ لا کر تو وہ فوراً عین غین ہو گئیں۔ اِن کے [جانے] کے کافی دیر بعد ساوے کی آنکھ کھلی تو اُس نے اِردگرد کے ماحول کا [جائزہ] لینے کی کوشش کی مگر اُسے سب کچھ دُھندلا دُھندلا نظر آیا۔ دُھندلا[ہٹ کی] وجہ اِس چہرے پر پڑنے والے زوجہ نمبر دو کے مکے تھے جو بالکل [illegible] اسٹائل میں لڑائی کیا کرتی تھی۔ اپنے جسم پر ہاتھ پھیر کر ساوے کو ا[ندازہ] ہو گیا کہ کوئی جگہ نہ خالی والی بات ہے۔ ہمت کر کے اُس نے [illegible] ہوئے اپنے جسم صد چاک اور جگر لخت لخت کو بلایا' جلایا اور پھر آ[illegible] ہوا سوئے رسوئی چل پڑا۔ رسوئی میں پہنچ کر اُس نے ہلدی لگانی [شروع] کر دی اپنے زخموں پر' اُس کی دِلخراش چیخیں سن کر برخوردار نمب[ر ایک] المعروف منیرا لکڑ معہ آٹھ مزید بھائیوں کے اندر داخل ہوا او[ر] والد ماجد سے دریافتِ حال کیا۔ ساوے نے اُس کے اندازِ پر[illegible] اُسے گالی سے نوازتے ہوئے بتایا کہ وہ بینائی کمزور ہو جانے کی [وجہ سے] پسی ہوئی مرچوں کو ہلدی سمجھ بیٹھا ہے اور لگا بھی چکا ہے۔ منیر[ا] اپنے ابا حضور کی ذہنی حالت پر افسوس کرتے ہوئے دو تین بھائیو[ں کے] ساتھ مل کر ساوے کو اُٹھایا اور کمرے میں چارپائی پر پھینک--- لٹا آیا اور یوں ساوے کا باقی روزِ حماقت اپنے زخموں اور اپنی [بیویوں کی] دشنام طرازی کا نشانہ بناتے ہوئے گزرا۔

کرائے دار
بمقابلہ مکان دار

☆ ظفر ندیم وہرہ

سویرے کا وقت تھا۔ لوگ اللہ، محمد کا نام لے رہے تھے۔ مَیں اپنی موٹر اسپیئر پارٹس کی دوکان پر بیٹھا ڈرائیوروں اور مستریوں سے دو ...کر رہا تھا کہ اچانک مجھے مالکِ دوکان کا منحوس چہرہ دِکھائی دیا۔ وہ ...مسکراتا ہوا اور شب بھر کی نحوست جھاڑتا ہوا دوکان کے اَندر داخل ہوا ...پکڑ کر اِس پر یوں پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا کہ جیسے یہ آٹو اسٹور نہ ہو ...تھرڈ کلاس سڑک چھاپ ہوٹل ہو۔ مَیں نے فوراً شیطان مردود کو ...والی دُعاؤں کا وِرد شروع کر دیا۔ اُس نے جیب سے گھٹیا برانڈ کا ...نکالا اور سرکس کے جوکروں کی طرح ناک اور منہ سے دھواں ...کرنے لگا۔ مجھے اُس کی یہ حرکت ایک آنکھ بھائی، دوسری آنکھ کا ...۔ مَیں نے جلدی جلدی گاہکوں کو نمٹایا اور کام سے فراغت پانے ...اُس کی طرف متوجہ ہوا اور لبوں پر مصنوعی مسکراہٹ سجا کر بولا۔ ...میرا دِل چاہ رہا تھا کہ اُس کے سر میں نو اِنچ کی اینٹ دے ...۔

''کہئے، قریشی صاحب! آج صبح صبح اِدھر کیسے بھول پڑے؟''

''آپ سے ایک کام پڑ گیا تھا۔ سوچا، آپ سے ملتا چلوں۔''

''آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی--- آپ کے مزاج کیسے ...''

''اللہ کا شکر ہے، ہر طرف اَمن ہے۔''

''فرمایئے۔ مَیں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں--- کرایہ تو ...بچہ لے گیا تھا۔'' ہم نے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔

''مَیں نوں ہی (یونہی) چلا آیا تھا۔ سوچا، آپ سے دُعا سلام کرتا ...''

''زہے نصیب--- یہ فرمائیں کہ ٹھنڈا منگواؤں یا گرم یا کچھ ...؟''

ہم نے صدیوں پرانا گھسا پٹا جملہ استعمال کرتے ہوئے کہا۔ وہ ...تو شاید اِسی سنہری موقع کی تاڑ میں تھا، سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے بولا۔

''دیکھو، شیخ صاحب! اپن سالا تو تکلف کرنے والا آدمی نہیں ہے۔ نیکی اور پوچھ پوچھ۔ جو من میں آئے، منگوالو۔ سب چلے گا۔''

''میرا خیال ہے، صبح کا وقت ہے آپ گھر سے چائے وغیرہ تو پی کر آئے ہوں گے، گنے کا شربت مناسب رہے گا؟''

دِل میں خیال آیا کہ پندرہ روپے کی بوتل منگوانے سے بہتر ہے کہ پانچ روپے میں کام چل جائے۔ آخر کفایت شعاری بھی کوئی چیز ہے--- اُنہوں نے ہماری بات کی بھرپور تائید کرتے ہوئے کہا۔

''آپ نے اِس ناچیز کے دِل کی بات کہہ دی--- نوں کریں کہ پہلے شربت منگوالیں، چائے کو بعد میں دیکھ لیں گے۔ اِس طرح آپ کی دونوں فرمائشیں پوری ہو جائیں گی۔''

ہم پیسے بچانے کی فکر میں تھے اور وہ کم بخت ہمارا ڈبل خرچہ کرانے پر تلا ہوا تھا۔ ہم نے چھوٹے کو بوٹے سے دو گلاس شربت لانے کا آرڈر دیا اور اِس شیطان سے جان چھڑانے کی فکر کرنے لگے جو کہ صبح سویرے ہمارے متھے لگ گیا تھا۔ شربت آتے ہی اُس نے اِسے یوں جھپٹ لیا کہ جیسے چیل مرغی کے چوزے کو اچک لیتی ہے۔ اُس نے ندیدوں کی طرح گلاس اپنے دہانے سے لگایا اور بچوں کی طرح غٹاغٹ پینے لگا جیسے ایک ہی سانس میں شربت ختم کرنے کا ریکارڈ قائم کرنا چاہتا ہو۔ شربت کو پیٹ کے تالاب میں اتارنے کے بعد اُس نے ایک زوردار ڈکار لی اور ''مالک تیرا شکر ہے'' کہہ کر اپنی توند کو سہلانے لگا۔ کم بخت کا پیٹ تھا یا سعودی عرب کا تربوز تھا جس کے آگے پیچھے کا پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کہاں سے شروع ہو رہا ہے اور کہاں پر اختتام پذیر ہو رہا ہے؟--- اُس نے ایک اور ڈکار کی فضول خرچی کی اور پالتو طوطے کی طرح چونچ کھولتے ہوئے بولا۔

''شیخ صاحب! آپ کو تو پتہ ہے کہ میرے چھورے خیر سے بڑے ہو گئے ہیں۔ اگر اُنہیں جلد کام دھندے پر نہیں لگایا تو کم بخت مارے

آوارہ ہو جائیں گے، اس لیے آپ سے یہ کہنے آیا ہوں کہ آپ مہربانی فرما کر ہماری دوکان خالی کر دیں۔''

''قریشی صاحب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔۔۔؟''

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میری نظر میں اب اس مسئلے کا یہی حل ہے۔''

''قریشی صاحب! یہ بھی تو سوچیں کہ میں یہ دوکان چھوڑ کر کہاں جاؤں گا؟''

''یہ سوچنا آپ کا کام ہے۔۔۔ ویسے شہر میں بہت سی دوکانیں خالی پڑی ہیں۔ آپ بھی اُن میں سے کوئی ایک پکڑ لو، مقصد تو پیٹ کا دوزخ بھرنا ہے۔''

''آپ یہ کام خود کیوں نہیں کر لیتے۔ میرا مطلب ہے، نیا کاروبار تو کہیں بھی شروع کیا جا سکتا ہے۔''

''آپ سوا سولہ آنے ٹھیک فرما رہے ہو مگر اپنی دوکان کے ہوتے ہوئے ٹکے ٹکے کے آدمیوں کے آگے ہاتھ پھیلانا اچھی بات تو نہیں ہے۔''

''آپ تو جانتے ہیں کہ اس دوکان سے میرے بچوں کی روزی روٹی وابستہ ہے۔ اسے چھوڑ کر میرا دال دلیہ کیسے چلے گا؟''

''اللہ بہت بڑا ہے۔ جس نے چونچ لگائی ہے وہ دانہ پانی بھی دے گا بس ایمان مضبوط ہونا چاہئے۔ وہ ایک در بند کرتا ہے تو سو کواڑ کھول دیتا ہے۔''

''لیکن آپ یہاں کریں گے کیا؟۔۔۔ یہ کوئی تجارتی علاقہ تو نہیں ہے۔ یہاں پر تو مستریوں کے چھوٹے چھوٹے گیراج ہیں یا چند چارپائیاں بنانے والے بیٹھے ہیں۔''

''جناب عالی! آپ کو تو علم ہے کہ میں نے چار پانچ بھینسیں پال رکھی ہیں، دو چار اور پکڑ لوں گا۔ اللہ خیر کرے۔ اِدھر دودھ، دہی اور ماوے (کھوئے) کا کام خوب چلے گا۔''

''قریشی صاحب! آپ بھی بال بچے دار آدمی ہو۔ ذرا یہ تو سوچیں کہ ایک کو برباد کر کے دوسرے کو آباد کرنا کہاں کی شرافت ہے۔ یہ تو جنازۂ دشمن پر شادی کرنے کے مترادف ہے۔''

''شیخ صاحب! انسان کو وقت کے ساتھ لیفٹ رائٹ کرنا پڑتا ہے۔ آپ تیس سال سے یہاں لگے ہوئے ہو۔ ہم نے کبھی آپ کو نہیں چھیڑا مگر اب ہمارے کو مجبوری آن پڑی ہے ورنہ آپ سے سِلا (اچھا) کرایہ دار ہمیں کہاں ملے گا؟''

''آپ کی قدردانی اور بندہ پروری ہے ورنہ بندہ کس
ہے۔۔۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس مسئلے پر میں مکمل
کروں گا، آگے اللہ مالک ہے۔''

''گورنمنٹ کی طرح غور ہی غور، بس ایک دو سال مت نکال
مجھ پر چھوروں کی ماں کا گھنا پریسر ہے۔۔۔''

''آپ تو جانتے ہیں کہ آج کل خالی دوکانیں اتنی آسانی سے
ملتی ہیں۔ اگر دوکان ملتی ہے تو محل وقوع اچھا نہیں ہوتا، اگر علاقہ اچھا
ہے تو مالک فرعون ہوتا ہے۔ چاروں طرف سے دیکھنا پڑتا ہے۔ یہ
ایک دن کا کام تو نہیں ہوتا، عمر بھر کا معاملہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے، روز روز
کی طرح بچے اُٹھا کر اِدھر اُدھر تو نہیں پھرا جا سکتا۔''

''میں آپ کو تین چار مہینے کا ٹائم دے دیتا ہوں۔ آپ تسلی
دوکان تلاش کر لیں۔ جمانت (ضمانت) وغیرہ کی ضرورت پڑے
کھال حاضر ہے۔ آخر آپ ہمارے بھائی ہو۔ آپ کے والد
ہمارے بڈو جی (باپ) میں تو بھائیوں جیسے تعلقات تھے۔''

''آپ درست کہہ رہے ہو، چاچا اللہ دیا بہت بھلے آدمی تھے
ہر سال ہمارا بکرا کاٹنے آیا کرتے تھے اور دونوں ایک ہی گروپ میں
کرنے گئے تھے۔''

''اللہ آپ کو نیکی دے، آپ کو تو پرانی باتیں بھی اب تک یاد ہیں
یہ دوکان بھی آپ کے والد ہی نے کرائے پر اُٹھائی تھی، دونوں میں
خاصی دعا سلام تھی۔''

''بس جی، وقت وقت کی باتیں ہیں۔ وقت گھوڑے کی طرح د
رہتا ہے، یادیں بقایا رہ جاتی ہیں۔'' میں نے کہا۔

اچانک وہ اپنی نشست سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں سمجھا، شاید
نے کاٹ کھایا ہے مگر میرا اندازہ غلط نکلا۔ وہ سگریٹ کا کش لگاتے ہو
بولا۔

''اچھا، تو پھر میں کب ورشن کراؤں؟''

''معاف کیجئے گا، میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟'' ہم نے
بوجھ کر انجان بنتے ہوئے کہا۔

''مطلب یہ کہ دوکان کب تک خالی ہو جائے گی؟'' اُس نے
ڈھلایا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''دیکھئے، میں آپ کو پکی تاریخ تو نہیں دے سکتا۔ کوشش کرو
کہ آپ کا کام جلد تمام ہو جائے۔''

''ٹھیک ہے، اب میں چلتا ہوں۔ مجھے ابھی بھینسوں کے
چارے کا بندوبست کرنا ہے اور بھوری بھینس کو لے کر جانوروں

ہسپتال کا چکر لگاتا ہے۔ سسری بیمار ہے' کہیں لڑھک ہی نہ جائے۔"

"اللہ آپ کی بھینس کو شفا دے' ہماری دُعائیں آپ کے ساتھ ...ہیں۔"

اُس نے جاہلوں کی طرح کرسی پیچھے گھسیٹی اور اِس میں سے راستہ ...تے ہوئے دوکان سے خارج ہوگیا۔ ہم جانے والے کے قدموں کے ...شان دیکھتے رہے اور زیرِ لب یہ گانا گنگناتے رہے---

چوری چوری آگ سی دِل میں لگا کے چل دیئے
ہم تڑپتے رہ گئے وہ مسکرا کے چل دیئے

☆☆

سلامو قریشی کو ہم اچھی طرح جانتے تھے کیونکہ اِس کا اور ہمارا برسوں پرانا ساتھ تھا۔ اگر ہم چولی تھے تو وہ دامن تھا۔ وہ ایک شریف انسان تو نہیں تھا مگر سمجھا ضرور جاتا تھا۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جن کا اندر باہر ایک جیسا نہیں ہوتا۔ وہ کچھوے کے انڈے کی طرح اُوپر سے کچھ اور اندر سے کچھ اور ہوتے ہیں۔ قریشی بھی اُوپر سے جس قدر سیدھا سادا نظر آتا تھا' اندر سے اِس کے اُلٹ تھا۔ افلاطونوں جیسی باتیں کرنا اِس کا خاص مشغلہ تھا۔ جب بولنے پر آتا تو باتوں کے دریا بہا دیتا تھا۔ وہ مخاطب پر ایسا رنگ جماتا تھا کہ وہ اُس کی صداقت' دیانت اور دریا دِلی کا قائل ہو جاتا تھا۔ اُس کے تینوں لڑکے ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ وہ سارے کے سارے آوارہ' بدچلن اور رنگ باز تھے۔ اُس کا سب سے بڑا لڑکا حنیف عرف چمن پرلے درجے کا کبوتر باز تھا۔ وہ سارا دِن چھت پر کھڑا کالے انجن کی طرح سیٹیاں بجاتا رہتا اور کبوتر بازی کی آڑ میں اڑوس پڑوس کے گھروں میں تانک جھانک کرتا۔ اِس قبیح عادت کے طفیل اِس کی کئی مرتبہ مرمت ہو چکی تھی مگر وہ اِس قدر ڈھیٹ تھا کہ اپنی مذموم حرکتوں سے باز نہیں آتا تھا۔ ایک بار اِس کے پڑوس میں رہنے والے ایک ٹیلر ماسٹر ابوشاہ نے اِسے زمین پر بچھا کر اور پانی چھڑک کر خوب اِستری کیا تھا کیونکہ اِس نے اُس کی دُختر نیک اختر بنام ناہید اختر کی طرف ایک چونچ والا پتھر پھینک دیا تھا جس کے ساتھ ایک گھٹیا قسم کا محبت نامہ لپٹا ہوا تھا--- اُس کا دوسرا لڑکا گوگی پرلے درجے کا پرچی باز تھا۔ وہ سارا دِن انعامی بونڈز کی پرچیوں کے چکر میں پڑا رہتا تھا۔ اُسے خواب میں بھی آنکڑے' ٹنڈولے اور پنگھوڑے نظر آتے تھے۔ اِس کھیل میں اَب تک ہزاروں روپے گنوا چکا تھا مگر اِس کے ہاتھ پر انعام کی لکیر ہی نہیں اُبھری تھی' اِس کے باوجود وہ اِس دھندے سے باز نہیں آتا تھا۔ وہ اپنے باپ کا خزانہ لٹانے میں نمایاں کردار ادا کر رہا تھا۔ پرچیاں کھیلنے کی پاداش میں وہ کئی بار پولیس والوں کے ہتھے چڑھ چکا تھا جہاں پر اسے گیدڑ کٹ اور چھتر ول کا سامنا کرنا پڑا تھا--- اُس کا تیسرا لڑکا آفتاب شرابی' کبابی اور موالی تھا۔ اِس کی اُٹھک بیٹھک غنڈے موالیوں کے ساتھ تھی۔ اپنا نشہ پورا کرنے کے لیے وہ بچوں سے پیسے چھین لیتا اور گھر کے برتن تک فروخت کر دیتا تھا۔

خبریں اور تبصرے

☆ "صدر زرداری کشمیریوں کے مضبوط وکیل ہیں، مسئلہ کشمیر پر کبھی یوٹرن نہیں لیں گے۔"---منظور احمد وٹو

○ وفاقی وزیرِ امور کشمیر میاں منظور وٹو نے کہا کہ صدر زرداری نے میرے کان میں بتایا ہے کہ میں نے وکالت میں گولڈ میڈل لے رکھا ہے۔ وعدے توڑنا تو ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ انشاء اللہ اقوامِ متحدہ کی زنجیروں کو بھی وعدے سمجھ کر جلد ہی وہ توڑ کر رکھ دیں گے اور کشمیر کو آزاد کروالیں گے---انہوں نے حکومت کی پالیسی واضح کرتے ہوئے بتایا کہ کسی کو غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔ ویسے بھی غلط فہمی دور کرنے کے لئے ہی تو ایوانِ صدر اور ایوانِ وزیرِ اعظم میں قائدِ اعظم کی تصاویر کی جگہ بی بی کی تصویریں لگا رکھی ہے تا کہ لوگوں کو معلوم ہوتا رہے کہ حکومت پیپلز پارٹی کی ہے۔ ہماری حکومت کبھی بھی یوٹرن لینے کے حق میں نہیں رہی، ہم روزِ اول سے ہی پی ٹرن کے قائل ہیں۔

☆ "نہاری کھانے کی دعوت ہوئی تو طارق روڈ ضرور جاؤں گا۔"---وزیرِ اعظم گیلانی

○ گھر والوں سے ناراض ہونے کے باعث محترم کافی عرصہ سے بھوک ہڑتال کیے ہوئے تھے۔ خفیہ ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ طارق روڈ پر نہاری مفت کھانے کو ملتی ہے۔ اپنے عہدے کی پرواہ کیے بغیر عوام کے لئے اور جمہوریت کی بقاء کیلئے انہوں نے نہاری کھانے کی خواہش کا اظہار کھانے کی دعوت مانگ کر کیا ہے۔ اب ہماری یہی دعا ہے کہ طارق روڈ سے انہیں نہاری ہی ملے۔

☆ "حکومت نے رکشہ میں پیدا ہونے والے بچے کو پانچ لاکھ روپے نقد اور گریجویشن تک مفت تعلیم دینے کا اعلان کر دیا۔"---ایک خبر

○ حکومت کے اس جرات مندانہ فیصلے کو پاکستان بھر میں سراہا جا رہا ہے البتہ کچھ حاسد اور خود غرض قسم کے لوگوں پر سوگ کی کیفیت طاری ہوگئی ہے۔ وہ آج کل اس وقت کو رو رہے ہیں جب وہ گھروں یا ہسپتالوں میں پیدا ہوئے تھے۔ لوگوں نے تو اپنے بچوں کی پیدائش کے لئے رکشے بک کروانے شروع کر دیئے۔ پاکستان ڈرائیور یونین نے چائینہ کو ایسے خصوصی رکشے بنانے کا آڈر دیا جن میں میٹرنٹی ہوم کی ساری سہولت میسر ہو۔ وہ کون بد بخت ہو گا جو حکومت کے اس عوام دوست پیکج سے فائدہ اٹھانے کا نہ سوچے۔ حیرانی اور پریشانی کی بات صرف اتنی ہے کہ اگر رکشے پر پیدا ہونے والے بچے کو پانچ لاکھ روپے دیئے تو جہاز میں پیدا ہونے والے بچے کیلئے تو ایوانِ صدر یا ایوانِ وزیرِ اعظم خالی کروانا پڑے گا۔

☆ "یوسف کی کرکٹ باقی ہے، فیصلے پر نظرِ ثانی کریں۔"---محسن حسن خان

○ پی سی بی کی طرف سے تاحیات پابندی لگنے کے بعد یوسف نے کرکٹ سے ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دیا ہے جس پر pcb کے حکام کو شدید صدمہ پہنچا ہے۔ چیف سلیکٹر نے اپنے بیان میں ریٹائرمنٹ کے فیصلے کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ اس جنم (جہاں) میں نہیں تو اگلے جنم میں یوسف کرکٹ کھیل سکتے تھے لیکن ان مواقع کو گنواتے ہوئے یوسف نے ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دیا ہے جس کا ہمیں بہت دکھ ہے۔ یوسف کو ریٹائرمنٹ کے اعلان کی بجائے ایک اور شادی کرنی چاہیے جیسے شعیب ملک نے کی۔ آخر کو تین بیویوں کی گنجائش تو ہے ہی نا!

سید ممتاز علی بخاری

ایک بار اِس کے باپ نے تنگ آ کر اِسے از خود نوٹس لے کر اندر کروا دیا تھا تا کہ وہ حوالات کی لات کھا کر سدھر جائے گا مگر وہ بھی کُتے کی دُم کی طرح تھا جو کبھی سیدھی نہیں ہوا کرتی۔ اِن تینوں سورماؤں کو دیکھ کر فارسی کی یہ مثل یاد آ جاتی تھی کہ این خانہ ہمہ آفتاب است--- یہ بات عقل و دانش سے بالاتر نظر آ رہی تھی کہ آخر وہ کیا سوچ کر اِن مستند نالائقوں کو کاروبار بنا کر دینا چاہتا ہے۔ جن کے بارے میں اہلِ محلہ کی متفقہ رائے تھی کہ یہ ڈشکرے دوکان ہی بیچ کر کھا جائیں گے۔

اندر کی بات یہ تھی کہ ہم اِس دوکان میں اِس وقت مسند نشین ہوئے تھے جب سونا صرف ڈیڑھ سو روپے تولہ ہوا کرتا تھا۔ حسنِ اتفاق سے ہمارا کرایہ بھی ایک تولے سونے کے برابر مقرر تھا یعنی کل ڈیڑھ سو روپے سکہ رائج الوقت جبکہ ہم نے دس تولے سونے کے برابر ایڈوانس دیا تھا جس کی مالیت کل پندرہ سو روپے تھی۔ اُس کا اصل تکلیف یہ تھی کہ متعدد بار کرایہ بڑھانے کے باوجود کرایہ تین چار سو روپے کی حد پار نہیں کر سکا تھا جبکہ اِس وقت اِس علاقے میں کرائے کی شرح آسمان کو چھو رہی تھی جس کے حسین تصور ہی سے اُس کے منہ میں پانی بھر آتا تھا' چمڑی اور دو کے خیال سے اُسے سرور آنے لگتا تھا۔ ظاہر ہے' وہ بن مانس یہ بات کیسے ہم کر سکتا تھا کہ اِس کے آس پاس کی دوکانوں کا کرایہ تو چار ہندسوں پر مشتمل ہے جبکہ اُس کی دوکان کا بھاڑا تین ہندسوں پر اٹکا ہوا ہو۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ یہ خیراتی کرایہ وصول کرنے خود نہیں آتا تھا بلکہ بیگم کے ذریعے منگواتا تھا تا کہ اِس قدر حقیر کرایہ دیکھ کر وہ اپنے آپ کو فقیر نہ سمجھنے لگے۔

ہم نے یہ بات خصوصی طور پر نوٹ کی کہ جب سے وہ' ہمیں دوکان خالی کرنے کی سمری دے کر گیا تھا' اِس دِن سے دوکان پر کرائے کے خواہشمند اُمیدواروں کی لائن لگ گئی تھی۔ اِدھر ہم صبح سویرے دوکان کھولتے' اُدھر کوئی منحوس چہرہ نمودار ہو جاتا اور ہونٹوں پر زہر خند ہنسی سجا کر استفسار کرنے لگتا کہ کیا یہ دوکان خالی ہونے جا رہی ہے؟ جب ہم سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھتے کہ اُس نے یہ فوری خبر کہاں سے سنی ہے تو وہ بڑے طمطراق سے کہہ دیتا کہ اُسے خفیہ ذرائع سے پتہ چلا ہے۔ جب ہم اُس سے خفیہ ایجنسی کا پتہ پوچھتے تو وہ حکومتی ترجمان کی طرح گنگ ہو جاتا اور صرف اِتنا کہنے پر اکتفا کرتا کہ اُس نے اُڑتی ہوئی خبر سنی ہے۔ ہم سراپا مجسمہ حیرت بن جاتے کہ ہم نے تو اَب تک کسی فرد و بشر سے ذِکر تک نہیں کیا کہ ہم یہاں سے رُخصتی کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ گویا عجب کہانی چل رہی تھی۔ مخبر عجیب و غریب خبریں لاتے اور فسانے بنانے والے بے پر کی اُڑاتے۔ ہم اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ افواہ ساز فیکٹریاں کس کی سرپرستی میں چل رہی ہیں اور اِن کے پسِ پردہ کیا مقاصد کارفرما ہیں مگر ہم جلد بازی میں اعلانِ جنگ کر کے لڑائی کا دائرہ کار بڑھانا نہیں چاہتے تھے۔

ایک دِن ایک موٹے تازے اور کالے کلوٹے حبشی ٹائپ صاحب دوکان پر تشریف لائے۔ اُن کے چہرے سے وحشت اور بربریت ٹپک رہی تھی جبکہ لباس فاخرہ سے خون کی بو آ رہی تھی' لگتا تھا کہ جیسے کوئی تازہ تازہ قتل فرما کر آئے ہیں۔ اُنہوں نے آؤ' دیکھا نہ تاؤ' بڑی شان بے نیازی سے اسٹول کھینچا اور اِس پر فٹ ہو گئے۔ اُن کے تشریف رکھنے پر اسٹول نے چرچرا کر بھرپور احتجاج کیا مگر اُس کی آواز ٹریفک کے شور میں دب کر رہ گئی تھی۔ ہم نے سوالیہ نظروں سے اُن کی طرف دیکھا۔ اُنہوں نے بغیر کسی تمہید کے اپنا مطلب بیان کر دیا گیا کہ یہ دوکان خالی ہے؟

''آپ کو کیا نظر آ رہا ہے؟'' ہم نے اُلٹا سوال داغ دیا۔

''میرا مطلب یہ ہے کہ کیا آپ یہ دوکان خالی کر رہے ہیں؟''

''آپ سے کس چغد نے کہا ہے کہ ہم یہ دوکان چھوڑ رہے ہیں؟''

''وہ جی' اپنا سلامو قریشی ہے نا! اُس کا چھورا گوگی اپنا لنگوٹیا یار ہے۔'' اُنہوں نے مین پوری کی پھکی منہ کی طرف ارسال کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم دونوں مل کر بونٹڑ کی پرچیاں کھیلتے ہیں۔ وہ بتا رہا تھا کہ آپ یہاں سے جا رہے ہیں۔''

نمکین غزل

نہیں ہے اُن کی ہاں میں وہ ہی لذت — جو پائی اُس کی ناں ناں میں حلاوت
سحر سے آنکھ پھڑک کے جا رہی ہے — نحوست آنے والی ہے کہ ثروت!
فقیہہ شہر رنڈوا ہو گیا ہے — وہ ہر بیوہ کو دے شادی کی دعوت
ہوئی ناکام ہر خوش شکل لڑکی — بوقت عقد چیک کی جو ذہانت
لیاقت اتنی ہی کم ہو رہی ہے — بڑھی ہے جتنی بستوں کی ضخامت
ملا ہے جس کا پرمٹ اور وزارت — سیاست بن گئی ہے وہ تجارت
ریکارڈ ہم قیس کا توڑیں گے آخر — ارادے کو الٰہی! استقامت
کہیں گے عشق کو "گڈبائی" اک دن — اگر ہوتی رہی یونہی مرمت
پرندہ اب نہ بچ پائے گا کوئی — بچھے ہیں جال ایسے خوبصورت
یہی عالم ہے گر عصیاں کا اپنے — بگڑ جائے گی انسانوں کی صورت

نعیم نیازی
C/O نیازی ٹریڈرز۔ اڈہ ڈھیوے والا تحصیل کلور کوٹ ضلع بھکر

''وہ جھوٹ بکتا ہے' ہمارا فی الحال ایسا کوئی اِرادہ نہیں ہے---
ویسے بر سبیل تذکرہ' آپ کا کیا اِرادہ ہے؟''

''میرے بڑے بھائی کا مرغی فارم ہے۔ مَیں نے اِدھر کنگال روڈ پر مرغیوں کی دوکان کھول رکھی ہے' تین چار سو مرغیاں روزانہ کاٹ لیتا ہوں۔ اللہ کا بڑا کرم ہے' شام تک ڈیڑھ دو ہزار روپے پیٹ لیتا ہوں۔''

''تو پھر وہاں سے کیوں چھوڑ رہے ہیں؟'' ہم نے سرنگ لگانے کی کوشش کی۔

''ویسے تو اُدھر دھندہ پانی ٹھیک ٹھاک ہے مگر بک بک' جھک جھک بہت ہے۔ علاقہ گندہ ہے' لوگ بے حد لیچڑ ہیں۔ ہیرآباد کا علاقہ سونا ہے' گراہک بھی ایک دَم فشٹ کلاس ہیں۔ منہ مانگی قیمتی دے دیتے ہیں' کوئی بھِٹیک ہی نہیں ہے۔''

''ماشااللہ' آپ کافی تجربہ کار اور چالو آدمی دِکھائی دے رہے ہیں---''

''جی' بس کبھی غرور نہیں کیا ورنہ بندہ کس قابل ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ جب ہمارا دوکان خالی کرنے کا اِرادہ ہوا تو آپ مالک سے مذاکرات کر لیجیئے گا' آگے نصیب اپنا اپنا--- اگر ہمارے لائق کوئی کارِ خدمت ہو تو بتائیں۔''

''آپ ایسا کریں کہ مجھے موٹر سائیکل کا ایک پلگ دے دیں' سالی کل سے بہت گڑبڑ کر رہی ہے۔''

اِس طرح اُنہوں نے ہماری سیل میں نوّے روپے کا اضافہ کیا اور یہ جا' وہ جا--- مزید تین چار ماہ کا عرصہ یوں گزر گیا کہ جیسے ہوا کا جھونکا گزر جاتا ہے۔ اِس دوران مالکِ دوکان نے دوکان کے اِتنے چکر لگائے کہ کسی ٹیڈر نے تربوز کے کھیت کے بھی نہیں لگائے ہوں گے۔ اِس حقیقت کے باوجود کہ تربوز اپنے وقت پر ہی پکتے ہیں' وہ گھن چکر' چکر پر چکر لگا رہا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ دوکان خالی کرانے کے لیے پاگل ہو رہا تھا۔ دراصل وہ اُونٹ کے سیدھی کروٹ بیٹھنے کا اِنتظار کر رہا تھا۔ اَب آپ سے کیا چھپانا۔ صبح سویرے گھر سے نکلتا تو بعد از دُعا سلام پوچھ لیتا کہ اُس کے کام کا کیا بنا؟ دوپہر کو کھانے پر آتا تو استفسار کرتا کہ بات کہاں تک پہنچی ہے؟ رات کو گھر لوٹتا تو پوچھ لیتا کہ کوئی کامیابی ہوئی ہے یا ابھی تک گدھی کیچڑ میں پھنسی ہوئی ہے؟--- ایک روز تو حد ہو گئی۔ وہ صبح سویرے دوکان پر آ دھمکا اور کرسی پر یوں ڈٹ کر بیٹھ گیا کہ جیسے آج دوکان کی چابی لے کر ہی جائے گا۔ ہم نے اخلاقاً چائے پانی کا پوچھا تو خلافِ توقع صاف اِنکار کر دیا۔ ہم سمجھ گئے کہ وہ ہم سے ناراض ہے' اِس لیے نخرے دِکھا رہا ہے--- کچھ دیر بعد بولا۔

''بادشاہو! بات کچھ آگے بھی یا ابھی تک سوئی وہیں اَٹکی ہوئی ہے؟''

''سلام بھائی! مَیں آپ کے کام کے پیچھے لگا ہوا ہوں۔ یقین کریں' اَب دِلّی دُور نہیں ہے۔''

ہماری بات سن کر اُس کے چہرے کا حلیہ بگڑ گیا' اُس پر ٹریفک سگنل کی طرح کئی رنگ آنے جانے لگے۔ اپنی مصیبت کا مختصر ذِکر کرنے کے بعد شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کر بولا۔

''جنابِ عالی! آپ نے میری مجبوری کو نہیں جانا ہے--- اللہ قسم' میرے لیے آپ سے بڑھ کر اچھا کرایہ دار پورے سنسار میں نہیں ہے۔ آپ نے ہمیں کبھی تنگ نہیں کیا اور ہمیشہ وقت پر کرایہ دیتے رہے ہیں مگر اَب مجھے خود دوکان کی ضرورت آن پڑی ہے ورنہ مَیں آپ کو کبھی دوکان خالی کرنے کے لیے نہیں کہتا۔'' وہ چالاک لومڑی کی طرح خوشامد اور چاپلوسی پر اُتر آیا۔

نوٹس داخلہ

قومی ادارے ''کنوارہ کلب'' میں پانچ سالہ کورس کے لئے داخلے کے خواہشمند صرف مرد اُمیدواروں سے درخواستیں مطلوب ہیں۔ جس کے لئے کسی قسم کی تعلیم' قابلیت' اہلیت اور عمر کی قید نہیں ہے۔ مردانیت ہونا لازمی ہے۔ پانچ سالہ کورس میں طلباء کو بذریعہ کمپیوٹر ایسے ٹریننگ دی جاتی ہے کہ وہ ہر جا کر خوشگوار غیر ازدواجی زندگی گزار سکتے ہیں۔ طلباء سے نہ کچھ لیا نہ دیا جائے گا۔ پراسپکٹس کبوتر' طوطا' کوا' لنگور' بھینسا یا نیلے کلر کی کار بھیج کر دفتر ہذا سے منگوائے جا سکتے ہیں۔ آخری تاریخ 2010ء ہے' بعد میں کلاسیں شروع ہو جائیں گی۔

1- اُمیدوار کا مکمل طور پر کنوارہ ہونا ضروری ہے۔ میڈیکل سرٹیفکیٹ لف کریں۔
2- 10 فیصد سیٹیں مظلوم شوہروں کے لئے ہیں۔ 5 فیصد سیٹیں دارالامان برائے مردگان والوں کے لئے ہیں۔
3- دل پھینک نوجوان یا ایسے حضرات جنھوں نے کسی کو دل مول' اُدھار یا ڈپوزٹ کے طور پر دے رکھا ہو زحمت نہ فرمائیں ورنہ ایکسرے چسٹ لف کریں۔
4- اُمیدوار صنفِ نازک کے سایہ تک سے نفرت کرتا ہو۔
5- نازک موقعوں پر چوہے' چھپکلیاں اور مینڈک پکڑنے کا وسیع تجربہ رکھتا ہو۔
6- چال چلن کا سرٹیفکیٹ لف کریں۔ لنگڑے حضرات کے لئے چال خراب ہونے کی صورت میں رعایت ہے جبکہ چلن ٹھیک ہو۔
7- کلین شیو لڑکوں کو داخلہ نہیں ملے گا اس طرح مقصد پورا نہیں ہوتا۔
8- طلباء کو بیلن' چمٹے' برتن اور جوتے سے بچنے کے ٹیکنیکل طریقے سیکھنے پڑیں گے۔
9- پرنسپل کے دونوں ہاتھوں پر بیعت کرنا اور مرید ہونا ضروری ہے۔
10- باقی معلومات اشتہار میں نہیں دی جا سکتیں کیونکہ صنفِ نازک کی ہڑتالوں اور جلوس اور ہنگاموں وغیرہ کا خطرہ ہے۔ لہٰذا باقی خفیہ معلومات اُمیدوار دفتر دستی سے معلوم کریں۔

دفتر پرنسپل کنوارہ کلب

محمد رمضان کھوکھر' ملتان

''قریشی صاحب! مَیں دوکان خالی کرنے سے اِنکار تو نہیں کر رہا---مَیں مانتا ہوں کہ مالک مالک ہوتا ہے اور کرایہ دار کرایہ دار ہوتا ہے لیکن میری بھی کچھ مجبوریاں اور مشکلات ہیں۔'' ہم نے اناڑی ہونے کے باوجود اپنا کیس خوش اسلوبی سے لڑتے ہوئے کہا۔

''مَیں آپ کا مطلب سمجھ رہا ہوں۔ آپ کا جو جائز چائے پانی بنتا ہے' وہ ہم بھگتنے کے لیے تیار ہیں۔''

''میرے لیے چائے پانی یا مٹھائی کی اِتنی اہمیت نہیں ہے' اصل مسئلہ روزگار کا ہے۔ نئی جگہ پر کاروبار سیٹ کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا ہے۔'' ہم نے اُس کی پیشکش پر محتاط ردِعمل ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کے گھر کا ماہانہ خرچ کتنا ہے؟'' اُس نے چینل تبدیل کرتے ہوئے کہا۔

''میری فیملی مختصر ہے' صرف بیس ہزار روپے ماہوار میں کام چل جاتا ہے۔'' ہم نے صرف پر اچھا خاصا زور ڈال کر کہا۔

''یہ ہوئی نا' مردوں والی بات---آپ چار ماہ کا گھریلو خرچ مجھ سے لے لیں اور دوکان کا قبضہ مجھے دے دیں۔''

وہ ہمیں اپنی پسند کی وکٹ پر کھلانے پر تلا ہوا تھا۔ ہم نے غائبانہ طور پر حساب لگایا' جملہ رقم کوئی اَسّی ہزار روپے کے لگ بھگ بن رہی تھی۔ ہم نے لوہا گرم دیکھ کر ایک اور چوٹ لگادی۔

''قریشی صاحب! یہ رقم تو بہت کم ہے' اُونٹ کے منہ میں زیرے کے برابر ہے۔ کم از کم ڈیڑھ دو لاکھ روپے تو ہونے چاہئیں---کیا پتہ دوکان ملتے ملتے سال یا اِس سے زیادہ عرصہ گزر جائے۔''

''آپ تو منہ پھاڑ کر پیسے مانگ رہے ہو' مَیں نے کوئی سعودی بینک لوٹا ہے۔ لو اور سنو---ابھی' یہ آپ کے سامنے والی دوکان خالی ہوئی ہے۔ خواجہ صاحب نے میڈیکل اسٹور والے کو صرف بیس ہزار روپے لگائے ہیں۔''

''اُنہیں یہاں پر آئے ہوئے صرف دو ہی سال ہوئے تھے جبکہ ہم تو تیس سال سے یہاں بوریہ نشین ہیں۔ پھر میڈیکل اسٹور کا کام کون سا مشکل ہے' یہ تو گلی کوچے میں بھی چل جاتا ہے۔ ہمارا کاروبار تو سانپ اور سیڑھی کا کھیل ہے۔ جب تک دوکان کے اِردگرد آٹھ دس گیراج نہ ہوں اِس کے بارے میں سوچنا بھی اوّل درجے کی حماقت ہے۔''

''تو آخر آپ کا کہاں تک اِرادہ ہے'' کچھ پتہ تو چلے؟'' اُنہوں نے ہارے ہوئے کمانڈر کی طرح ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

''قریشی صاحب! مَیں تو آپ سے بالکل جائز اور مناسب پیسے مانگ رہا ہوں---ذرا سوچیں۔ اگر مَیں سال چھ مہینے بیکار پھرتا رہا تو میری ساری رقم ہوا میں اُڑ جائے گی۔ آپ کو تو پتہ ہے' آج کل مہنگائی کے دیو نے کس قدر آفت اور وحشت مچا رکھی ہے۔''

''ٹھیک ہے مَیں اپنے چھوروں سے مشورہ کر کے آپ کو بتاؤں گا' فی الحال مجھے اجازت دیں۔''

''قریشی صاحب! بیٹھیں تو سہی لسّی پانی تو پیتے جائیں---''

''نہیں' اِس کی کوئی ضرورت نہیں۔ مَیں گھر سے پُر باش ہو کر آیا تھا---''

''حکم کریں تو گلاب پان ہاؤس کا پان منگوا دوں؟''

''نہیں' اِس وقت موڈ نہیں ہے۔''

''جیسے آپ کی مرضی---ہم ہر طرح سے حاضر ہیں۔''

اِسی اُدھیڑ بُن اور کشمکش میں دس پندرہ دِن اور بیت گئے۔ بڑی عجیب بات یہ ہوئی کہ قریشی صاحب گدھے کے سینگوں کی طرح نجانے کہاں غائب ہو گئے ورنہ پہلے تو اُن کا اخبار کی طرح روزانہ دیدار ہوتا تھا کیونکہ اُنکا نشیمن دوکان کے اُوپر والے حصے میں تھا جہاں وہ اپنے مبلغ پانچ بھائیوں کی فوج ظفر موج کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ ہم نے جب اُن کی پُر اسرار گمشدگی کے بارے میں انکوائری کرائی تو یہ رپورٹ ملی کہ وہ بھینسوں کی خریداری کے لیے ملتان شریف گئے ہوئے ہیں اور جلد واپس آجائیں گے۔ آخر کار وہ نامبارک گھڑی آگئی جب وہ بھینسوں کی چار رُکنی ٹیم کے ہمراہ واپس حیدر آباد پہنچ گئے۔ اُن کی چستی اور پھرتی ملاحظہ ہو کہ اپنی آمد کے ایک ہی گھنٹے بعد وہ بن سنور کر ہمارے آستانے پر جلوہ افروز ہو گئے۔ ہم سمجھ گئے کہ وہ وہاں پر بھی اَمن وسکون سے نہیں رہے ہوں گے بلکہ اُنہیں ہر دَم دوکان کی فکر دامن گیر رہی ہوگی۔ اُن کی لال آنکھیں اُن کے شب و روز کا افسانہ سنا رہی تھیں۔ اُنہوں نے دوکان پر بیٹھے بیٹھے موبائل پر ایک نمبر ملایا اور مخاطب کو فوراً دوکان پر آنے کے لیے کہا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک کالے کوٹ والے صاحب اپنی پھٹیچر پھٹ پھٹی پر وہاں پہنچ گئے۔ اُنہوں نے رونق لی وکیل کی حیثیت سے اپنا تعارف کرایا اور ہم سے ہاتھ ملا کر کرسی میں دھنس گئے۔ ہم سمجھ گئے کہ قریشی صاحب کے اَندر چھپا ہوا شیطان ایک بار پھر باہر آ گیا ہے۔ دراصل وہ ہمیں قانونی کارروائی کا ہوّا دِکھا کر ڈرانا چاہتے تھے' ہم بھلا کہاں اُن کی گیدڑ بھبکیوں سے مرغوب ہونے والے تھے۔ ہم نے اُن کی ہر ممکن کارروائی کو ناکام بنانے کے لیے حکمت عملی تیار کر رکھی تھی۔ اِس مقصد کے لیے ہم نے اپنے دوست وکیل منیر احمد شیخ عرف بمباٹ سے رابطہ قائم کر رکھا تھا۔ اُنہوں نے ہمیں پختہ یقین دلایا تھا کہ اگر فریق

مخالف نے کوئی گڑ بڑ کرنے کی کوشش کی تو وہ ایسا خاص الخاص پوائنٹ استعمال کریں گے کہ موصوف کو نانی کے ساتھ پڑنانی بھی یاد آ جائے گی۔ اُن کا دعویٰ تھا کہ اِس کیس میں جان ہی نہیں ہے' اِس لیے یہ چند پیشیوں کے بعد خارج ہو جائے گا--- ہم نے مہمانوں کے لیے سبز چائے عرف گلابی چائے کا آرڈر دیا کہ گھر آئے دُشمن کی بھی خاطر تواضع کرنا پڑتی ہے۔ چائے پیتے ہی دونوں اصحاب کی بیٹری چارج ہو گئی اور وہ بے چینی سے پہلو بدلنے لگے۔ وہ دراصل یہ فیصلہ ہی نہیں کر پا رہے تھے کہ بات چیت کہاں سے شروع کی جائے؟ آخر کار یہ مشکل وکیل صاحب نے آسان کر دی' اُنہوں نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''قریشی صاحب نہ صرف ہمارے مؤکل ہیں بلکہ ہمارے مٹ مائٹ (عزیز) بھی ہیں۔ اِن کی خواہش ہے کہ یہ مسئلہ بھائی بندی اور مذاکرات سے طے ہو جائے لہٰذا بہتر یہی ہے کہ آپ بھی اپنے مؤقف میں کچھ لچک پیدا کریں اور کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر یہ قضیہ نمٹا لیں کیونکہ قانونی گورکھ دھندوں اور موشگافیوں میں اُلجھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ آپ کا بھی خرچہ ہو گا اور اِن کی بھی جیب ڈھیلی ہو گی' خجل خواری الگ ہو گی۔''

''ٹھیک ہے' یہ مجھے ڈیڑھ لاکھ روپے ادا کر دیں۔ میں ایک ہفتے میں دوکان خالی کر دیتا ہوں۔''

''کچھ خدا کا خوف کریں۔ ڈیڑھ لاکھ روپے تو اچھی خاصی موٹی رقم ہے' بندہ گنتے گنتے تھک جاتا ہے۔ آپ کی بات ماننے لینے سے ہماری کھاٹ کھڑی ہو جائے گی۔'' یہ قریشی صاحب کی آواز تھی۔

''کسی کو لنچ مفت میں نہیں مل جاتا' اِس کے لیے کچھ نہ کچھ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ میں نے اپنی ڈیمانڈ بتا دی ہے۔ اِس میں کمی بیشی خارج از امکان ہے۔''

''یہ جناب کا آخری فیصلہ ہے؟''

''آپ ایسا سمجھ سکتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے' تو اَب ہم چلتے ہیں۔ دو چار دِن میں سوچ بچار کر کے آپ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیں گے۔''

''ہم اِنتظار کریں گے تیرا قیامت تک' خدا کرے کے قیامت ہو اور تو آئے۔'' ہم نے دِل ہی دِل میں کہا--- دوسرے روز ہم دوکان پر پہنچے تو وہاں کا منظر نامہ ہی بدلا ہوا دِکھائی دیا۔ ہمارے برابر والی دوکان قریشی صاحب کے بھائی مجد الوری کی ملکیت تھی جو کہ کافی عرصے سے بند پڑی تھی۔ اِس میں دُنیا جہان کا کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا۔ ایک کالا کلوٹا شخص کہ جس کی شکل باگڑ بلے سے ملتی جلتی تھی' اِن کے ساتھ کھڑا کھسر پھسر کر رہا تھا۔ اُس نے ایک کان میں بندہ اور دونوں ہاتھوں میں سلور کے کڑے پہن رکھے تھے۔ بادی النظر میں وہ کوئی بندر نچانے والا لگ رہا تھا۔ اُن کی مشکوک حرکات وسکنات سے ظاہر ہو رہا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ ہم نے قریشی صاحب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اُنہوں نے روٹھی ہوئی بیوی کی طرح منہ پھیر لیا اور یوں انجان بن گئے کہ جیسے جانتے نہیں' پہچانتے نہیں مگر اُن کی رازداری زیادہ دیر تک قائم نہیں رہی اور بلی جلد ہی تھیلے سے باہر آ گئی۔ مخبر نے خبر دی کہ اُنہوں نے بھائی سے ساز باز کر کے یہ دوکان کسی مرغی فروش کو پانچ ہزار روپے ماہوار کرائے پر دے دی ہے اور وہ کل اپنا ساز و سامان لے کر یہاں وارد ہو جائے گا۔ دراصل اُنہوں نے جب سیدھی اُنگلیوں سے گھی نکلتے نہ دیکھا تو کمینگی پر اُتر آئے کہ جنگ اور محبت میں سب جائز ہوتا ہے۔ یہ

پرچہ ریاضی

وقت: آپ کی پیدائش سے لے کر وفات تک کا۔

نوٹ: کوئی سوال لازمی نہیں ہے البتہ اِس پورے پرچے کی جگہ ''مولا جٹ اِن لندن'' کی سٹوری معہ گانوں کے لکھنے والوں کو بھی پورے نمبر دیئے جائیں گے۔

سوال نمبر 1-ایک شخص جس کی ماہانہ آمدنی 5000 روپے ہے مگر وہ ہر سال اپنی بیوی اور سسرال والوں پر ایک لاکھ روپے سے زیادہ کا خرچہ کرتا ہے۔ اِس کی ماہانہ رشوت بتائیں؟

سوال نمبر 2-ایک قلعے میں موجود 200 سپاہیوں کے لئے 100 دِن کی خوراک موجود ہے مگر اِن میں سے 50 افسروں کے سالے بھی وہاں پہنچ جاتے ہیں جس سے وہ خوراک 10 دِن میں ختم ہو جاتی ہے۔ آنے والے سالوں کی تعداد بتائیں؟

سوال نمبر 3-ایک گوالا روانہ ایک سیر دودھ میں پانچ سیر پانی ملا کر 200 روپے کماتا ہے بتایئے اگر وہ 5 سیر دودھ میں ایک سیر پانی ملائے تو کتنا کمائے گا؟

سوال نمبر 4-ایک آدمی کے چھ سالے اور پانچ سالیاں' آٹھ دِن اِس کے گھر پر رہنے کے بعد اِس کا 5000 روپے کا خرچہ کرواتے ہیں۔ بتایئے کہ اگر اس آدمی کی ساس اور سسر بھی اِن کے ہمراہ ہوتے تو وہ کتنا خرچہ کرواتے؟

(حصہ الجبرا)

سوال نمبر 1-الجبرا کے لغوی اور ڈکشنری معنی بتائیں اور الجبرا اور جبری مشقت میں کیا مشابہت ہے' دونوں کے فرق کو واضح کریں؟

سوال نمبر 2-اگر آپ کو الجبرا ایجاد کرنے والے خوش قسمت اِنسان کا پتہ چل جائے تو آپ اپنے خیال میں اِس کے جسم کو کتنے حلقوں میں تقسیم کر کے اُسے اِس دُنیا سے منفی کریں گے؟

(حصہ جومیٹری)

سوال نمبر 1-مسئلہ ''عورت'' بیان کریں؟ اگر آپ کے سامنے 3 مختلف جگہوں پر 3 لڑکیاں بیٹھی ہوں تو آپ کن کن زاویوں سے بیک وقت اِن تینوں کو دیکھ رہے ہوں گے؟

سوال نمبر 2-بس کا ڈرائیور سامنے لگے شیشے کو کس زاویے پر رکھ کر پچھلی سیٹ پر بیٹھی خواتین کو دیکھ سکتا ہے جبکہ اِسے دائیں بائیں دیکھنے کی بھی بالکل فرصت نہیں ہوتی۔

• عمران نور' پشاور

خبر جہاں ہمارے لیے غیر متوقع اور تشویشناک تھی، وہاں ہمارے اِس مؤقف کا منہ بولتا ثبوت تھی کہ اُنہیں ذاتی استعمال کے لیے دوکان کی بالکل ضرورت نہیں بلکہ وہ محض دوکان کا قبضہ چھڑانے کے لیے ڈرامہ بازی کر رہے تھے۔ یہ بات کس قدر حیرت انگیز تھی کہ ایک طرف تو وہ ہم سے صلح صفائی کی باتیں کر رہے تھے اور دوسری طرف وہ اوچھے ہتھکنڈے اختیار کر رہے تھے۔ ہم اپنے تجربے کی بنا پر اِس حقیقت کو پا چکے تھے کہ مرغی فروش کو پڑوس میں لانے کا مقصد اِس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ ہم مرغی خانے کے ناخوشگوار ماحول اور ناگوار بدبو سے تنگ آ جائیں اور دوکان چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں لیکن یہ اُن کی خام خیالی اور بچگانہ پن تھا۔ اُنہیں شاید اِس بات کا علم نہیں تھا کہ ہم اِتنی آسانی سے بھاگنے والے نہیں ہیں بلکہ بُرے کو اُس کے گھر تک پہنچا کر دَم لینے والوں میں سے ہیں۔ اَب چونکہ اُنہوں نے خود ہی جنگ کا طبل بجا دیا تھا، اِس لیے اُن کے گنجے سر پر طبلہ بجانا ہمارا فرض بن گیا تھا۔

ایک دِن دوکان کی صفائی، ستھرائی اور دھلائی میں گزر گیا۔ دوسرے دِن وہ دُشمنِ جاں، برادر شیطان مرغیوں کی بارات لے کر ہمارے دروازے پر آن ٹپکا۔ وہ اپنے ہمراہ مرغیوں کے پنجروں اور متعلقہ ساز و سامان کی بہت بڑی کھیپ لے کر آیا تھا جسے دیکھ کر یہ گمان گزرتا تھا کہ جیسے پورا پولٹری فارم اُٹھا کر لے آیا ہو۔ اِس کے ساتھ آئے ہوئے بالغ و نابالغ افراد نے بڑی تیزی سے اور پھرتی سے ٹرک میں سے سامان اُتارنا شروع کر دیا۔ اِس موقع پر مرغیوں نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ اِس کے ورکر مرغی کو کریٹ میں سے باہر نکالتے اور بازوؤں سے پکڑ کر اِتنے زور سے پنجرے کے اَندر ڈالتے کہ جیسے دستی بم پھینکا جاتا ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ اگر اِس موقع پر محکمہ اِنسدادِ بے رحمی جانوراں والے موجود ہوتے تو وہ اِن کا چالان کر دیتے۔ اِس موقع پر اُنہوں نے ایک اشتعال انگیز شرارت کی جس سے نقضِ اَمن کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ اُنہوں نے جان بوجھ کر اپنا کنگ سائز اور بلند پنجرہ اِس جگہ پر نصب کیا کہ جہاں سے ہمارا کاؤنٹر بالکل قریب تھا۔ یہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ تھا جس کا مقصد ہم پر نفسیاتی دباؤ ڈالنا اور ہمیں ذہنی ایذا پہنچانا تھا تاکہ ہم سارا دِن بدبو اور مکھیوں کی زد میں رہیں اور کسی پل چین سے نہ بیٹھ سکیں۔ یہی نہیں، اُنہوں نے اپنا کاؤنٹر بھی باہر سڑک پر لگا دیا تاکہ اِس کی آڑ میں ہماری دوکان چھپ جائے اور ہمارا کاروبار تباہ ہو جائے مگر وہ جو کسی نے کہا ہے کہ اور سچ کہا ہے کہ جو کسی کے لیے گڑھا کھودتا ہے، وہ خود اِس میں گرتا ہے۔ ہوا یوں کہ اُنہیں پہلے ہی دِن شادت کا ایک بہت بڑا آرڈر مل گیا جس سے اُن کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ اِس آرڈر کی مالیت 25 ہزار روپے کے لگ بھگ تھی۔ چونکہ وہ لوگ یہاں نئے نئے پدھارے تھے اِس لیے رات کو وہ رقم ساتھ لے جانا بھول گئے اور دوکان ہی میں چھوڑ گئے۔ جب ہم صبح دوکان کھولنے کے لیے وہاں پہنچے تو ہماری نظر اچانک اُن کے شٹر پر پڑی جو کہ کبڑا ہوا پڑا تھا اور ایک طرف سے تقریباً ایک فٹ اُوپر اُٹھا ہوا تھا۔ ہمیں یہ سمجھنے میں کوئی دیر نہیں لگی کہ رات کو یہاں پر کوئی واردات ہو گئی ہے۔ ہمارا خدشہ ایک سو ایک فیصد دُرست نکلا۔ رات کے پچھلے پہر ہیرونچیوں کے کسی گروہ نے جیک کے ذریعے شٹر کو اُوپر اُٹھا کر راستہ بنایا اور جملہ رقم لے کر فرار ہو گئے، گویا اُڑنے بھی نہ پائے تھے کہ گرفتار ہوئے۔ کچھ ہی دیر بعد جب موٹے بھائی نے دوکان کھولی اور کاؤنٹر کے دراز پر نظر ڈالی تو وہ اُن کے ہوش اُڑ گئے۔ حکومتی خزانے کی طرح دراز خالی پڑا اُن کا منہ چڑا رہا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہوئی کہ چور نہ صرف تمام مال پر ہاتھ صاف کر گئے بلکہ جاتے جاتے اُن کی درجنوں مرغیاں اور ایک عدد بکری کا بچہ اغواء کر کے لے گئے کہ آئے ہیں تیرے دَر پر تو کچھ لے کے جائیں گے۔ اِس میجر کارروائی نے موٹے بھائی کی کمر توڑ دی۔

یہ ایک روشن حقیقت تھی کہ جب سے ہمارے پڑوس میں مرغی کی دوکان کھلی تھی اُس دِن سے ہمارے لیے مسائل کا رجسٹر کھل گیا تھا۔ سارا دِن بدبو کے بادل اُٹھتے رہتے جو کہ سیدھے دِماغ کا رُخ کرتے، مکھیوں کی یلغار اِس کے علاوہ تھی۔ صبح تا شام اُن کے غول کے غول بارڈر پار کر کے ہماری حدود میں داخل ہوتے اور کاؤنٹر پر آ کر اُتر جاتے جس سے اِس کا فارمیکا یوں چھپ جاتا کہ جیسے کسی نے اِس پر کالی چادر ڈال دی ہو۔ اِس پر ستم بالائے ستم یہ کہ جب وہ دوکان کی صفائی کرتے تو مرغیوں کی بیٹ کا پاؤڈر اُڑ اُڑ کر چاروں طرف پھیل جاتا جس سے آس پاس کے دوکانداروں کو کھانسی کا دورہ پڑ جاتا اور وہ ٹی بی کے مریض کی طرح کھانسنا شروع کر دیتے اور کھانس کھانس کر بے حال ہو جاتے۔ اِن متاثرین میں ہم چونکہ قریب ترین پڑوسی تھی، اِس لیے ہم کھانسی میں سب پر سبقت لے جاتے۔ اِس پریشان کن صورتِ حال نے جہاں ہماری صحت کا کباڑہ کر دیا، وہاں ہمارے اِنتظامی اخراجات میں بھی غیر معمولی اضافہ کر دیا۔ خدا جھوٹ بولنے کی توفیق نہ دے تو عرض کریں کہ ہم صبح سے شام تک اگربتیوں کے کئی بنڈل پھونک ڈالتے مگر بو پھر بھی برقرار رہتی۔ اُدھر مکھیوں کو بھگانے کے لیے ہمیں بار بار آپریشن کلین اپ شروع کرنا پڑتا جس سے ہم زچ ہو کر رہ جاتے۔ یہ بات تو زید، بکر، ظفر بشر سبھی جانتے ہیں کہ مکھی سے بڑھ کر دُنیا میں کوئی ڈھیٹ حشرات الارض نہیں۔ اِسے جتنی مرتبہ بھگاؤ، اِس سے دوگنی مرتبہ واپس آ جاتی

ہے چنانچہ اِن کی ہلاکت کے لیے ہمیں بار بار مکھی مار پاؤڈر اور اسپرے کا استعمال کرنا پڑتا' تب جا کر کہیں سکون کا لمحہ نصیب ہوتا لیکن یہ فائر بندی عارضی ثابت ہوتی اور کچھ ہی دیر بعد اِن کے تازہ دَم دستے آ جاتے اور تو اور' اَب تو بلیوں کی آمد و رفت بھی شروع ہوگئی۔ پڑوس میں پرورش پانے والے بلوں کو جب بھی موقع ملتا' وہ آنکھ بچا کر ہماری دوکان میں گھس آتے اور عقبی الماریوں کے خانوں میں لیٹ کر میٹھی نیند سو جاتے۔ اُنہیں مار بھگانے کے لیے ہمیں بار بار لاٹھی چارج کرنا پڑتا لیکن اُن پر کوئی اثر ہی نہ ہوتا۔ اِدھر ہم اُنہیں باہر بھگاتے' اُدھر کچھ ہی دیر بعد وہ دوبارہ نازل ہو جاتے اور جگہ جگہ پر گندگی پھیلا کر رفو چکر ہو جاتے۔ کبھی کبھار وہ مقتول مرغیوں کے پر منہ میں دبا کر دندناتے ہوئے اَندر آ جاتے اور اُن کے ساتھ چمٹا ہوا گوشت مزے لے لے کر کھاتے۔ اِس طرح چند ہی دِنوں میں دوکان کے اَندر جا بجا پروں کے ڈھیر لگ جاتے جنہیں اُٹھاتے اُٹھاتے ہمارے بازو شل ہو جاتے۔ اِس صورتِ حال سے جہاں ہم پریشان ہوتے' وہاں ہمارے مستقل گاہک بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتے۔ وہ جتنی دیر تک دوکان میں کھڑے رہتے' ناک پر رومال جمائے رکھتے۔ چونکہ ہمارے گاہکوں میں زیادہ تر تعداد کار سواروں کی تھی' اِس لیے دوسرے گاہکوں کی نسبت وہ بہت بیزار ہوتے اور کم بخت مرغی والوں کو خوب جلی کٹی سناتے اور آخر میں یہ کہہ کر دِل کی بھڑاس نکالیتے کہ ہمارے ملک میں کوئی قاعدہ قانون ہی نہیں ہے' ہر شخص من مانی کر رہا ہے۔ ایک مرتبہ تو حد ہوگئی۔ ایک کار نشین پر اِس بدبو کا اِتنا اثر ہوا کہ اُنہیں اُبکائیاں آنا شروع ہوگئیں اور وہ یہ کہہ کر دوکان سے خارج ہوگئے کہ وہ آئندہ اِدھر کا رُخ کرتے وقت سو مرتبہ سوچیں گے۔ ہم اُنہیں لاکھ سمجھاتے کہ اِس بدانتظامی میں ہمارا کوئی قصور نہیں بلکہ یہ سب کیا دھرا اِس شیطان کے بھائی مالکِ دوکان کا ہے' کہ جس نے محض ہمیں پریشان کرنے کے لیے یہاں پر چکن سینٹر کھلوایا ہے تاکہ وہ اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کر سکے۔

کچھ دِن اِسی کشمکش میں گزر گئے۔ تقاضے اور تکرار روزمرہ کا معمول بن گئے۔ قریشی صاحب کو اپنے قدم زمین میں دھنستے ہوئے دِکھائی دے رہے تھے۔ اُنہوں نے ہمیں تنگ کرنے کے لیے جو چکر چلایا تھا' وہ کوئی زیادہ موَثر ثابت نہیں ہوا تھا۔ اِس بات کو ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اُن کی اِس کارروائی سے ہمیں کچھ مالی نقصان اُٹھانا پڑا تھا کیونکہ گاہکوں کی کم آمد و رفت سے ہماری آمدنی پر بُرا اثر پڑا تھا مگر ہم بھی تندی بادِ مخالف سے گھبرانے والے نہیں تھے۔ یہ سوچ کر ہماری ڈھارس بندھ جاتی تھی کہ کاروبار میں نفع نقصان تو ہوتا رہتا ہے۔ رات کی تاریکی کے

مصنوعی کھال

ہمارے ہاں پوٹھوہار زبان کی مَثل ہے کہ جب اللہ تعالیٰ دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے اور جب لیتا ہے تو چمڑی بھی ادھیڑ لیتا ہے--- حالانکہ چمڑی اِنسان کی ادھیڑی نہیں جاتی۔ چمڑی جسے ہم کہتے ہیں--- وہ جسم کا ایک حصہ ہے البتہ کھال ادھیڑی جا سکتی ہے--- کھال حیوانات رکھتے ہیں اور چمڑی اِنسانوں کی ہوا کرتی ہے۔ لہٰذا مَیں اپنے کالم نگار بھائیوں سے اپیل کروں گا کہ اِنسان و حیوان میں تمیز روا رکھیں۔ ایسا نہ ہو کہ چمڑی کو کھال سمجھ کر یورپی ممالک اور امریکہ کو برآمد ہونے کا سلسلہ شروع ہو جائے اور پھر آپ آزادیِ صحافت اور آزادیِ تجارت کو لے بیٹھیں۔ آج کے دور میں کھال کی اِس قدر قدر قیمت ہوگئی ہے کہ اِس کے بنے ہوئے جوتے غریب عوام کی پہنچ سے باہر ہیں--- صرف اور صرف امراء کو کھال کے بنے ہوئے جوتے میسر ہیں۔ غرباء تو صرف امراء کے جوتے سنبھالنے کی استطاعت رکھتے ہیں--- باقی غرباء کو کسی قسم کا اختیار نہیں ہے--- کہ وہ اِن جوتوں میں دال ڈال کر بانٹنا شروع کر دیں۔ بانٹنے کا بھی اختیار امراء کا استحقاق ہے۔ کھال اُتارنا ایک ایسا محاورہ ہے جس کے کئی ایک معنی نکلتے ہیں--- ہر ظالم شخص جو ناجائز طرزِ عمل سے مخلوقِ خدا پر ظلم کرے۔ مثال کے طور پر ناجائز منافع خوری' سٹاک کرنا تاکہ زیادہ منافع حاصل کیا جا سکے۔ سود خوری' اپنی ذات کی خاطر دوسروں کی زندگیوں سے کھیلنا۔ ویسے کھال ہمارے ہاں قصاب اُتارنے کے ماہر سمجھے جاتے ہیں--- باقی اناڑی لوگ تو ادھیڑتے ہیں۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ فلاں نے شیر کی کھال پہن رکھی ہے حالانکہ اندر سے وہ گیدڑ ہے۔ بات دراصل کھال کی نہیں ہوتی بات اِس اشتباہ کی ہوتی ہے جو اِنسان کے دِل کے اندر جنم لیتا ہے۔ اصیل کو مصنوعی کھال پہننے کی کیا ضرورت ہے جبکہ وہ ہے ہی اصیل--- بھلا وہ کیونکر کسی کو اضلال کر کے شیطان کے زمرے میں آئے گا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ کھال اُتارنے کا پیشہ صرف قصاب کا ہے اور بعض کا خیال ہے کہ کھال اُتارنے کا پیشہ مصلی کا ہے۔ عربی میں مصلی نمازی کو کہا جاتا ہے لیکن یہاں مصلی جو استعمال میں لایا گیا ہے--- یہ وہ لوگ ہیں جو مردار جانوروں کی کھالیں اُتارنے کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ کھال کی افادیت صرف اور صرف وہ سمجھتے ہیں جن کا کاروبار ہے کھالیں خریدنے اور فروخت کرنے کا--- کھال پر نمک لگانے کے بعد اِسے دھوپ میں رکھ دیتے ہیں تاکہ اِس کے اندر جو معمولی سا خون اور پانی ہو وہ خشک ہو جائے مگر اُتری ہوئی کھال لہٰذا آپ محتاط رہیں کہ زندہ کھال پہ نمک نہ کہیں لگا بیٹھیں ایسا نہ ہو کہ یہ کھال کسی کے لئے جنجال بن جائے--- ویسے کھال کے شیدائی ہمارے علمائے کرام بہت زیادہ ہیں--- جو قربانی عید کے دو تین مہینے پہلے ہی بینرز آویزاں کر دیا کرتے ہیں کہ قربانی کی کھال کا استحقاق ہمارا ہے--- لیکن جب سے امریکی دہشتگردی کا چکر چلا ہے--- اِس نے اپنے بچونگڑوں کی بدولت دُنیائے عالم میں دہشتگردی پھیلا کر احکامات صادر فرما دیئے کہ ایسی ملکی تنظیموں پر پابندی عائد کی جائے جو کھالیں اکٹھی کرتی ہیں--- حالانکہ کھال و دہشتگردی کا کسی قسم کا رشتہ ناطہ نہیں ہے۔ مَیں مزید اِس طوالت میں نہیں جانا چاہتا--- لیکن اتنی بات ضرور کروں گا کہ جامعہ حفصہ والے اندر ہی اندر یا تو کھال اُتارنے کے چکر میں ہیں یا کھال خریدنے کے چکر میں یا پھر کھالیں اکٹھی کرنے کے چکر میں ہیں--- اِس موقع پر جب کہ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس صاحب جناب چوہدری افتخار محمد کا کیس چل رہا ہے--- اِس موقع سے فائدہ اُٹھانے کے لئے ہر سیاسی جماعت محوِ پرواز ہے--- اور ہر گدھ ماس اور کھال نوچنے کی کوشش میں مصروفِ عمل ہے۔ وکلاء بےچارے اِس گرمی میں بوجہ مجبوری کالے کوٹ پہن کر صرف اور صرف ماتم ہی کر سکتے ہیں۔ سب سے اچھا عمل یہ ہوگا کہ مصنوعی کھال کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ کر سب کے دِلوں میں جو شکوک و شبہات ہیں انہیں دور کیا جائے--- اور امن سے رہیں--- اِسی میں ہمارا بھلا ہے۔ مخلوقِ خدا کا بھلا ہے۔

(منظور بھٹی آف کنگال)

انتخاب: کے ایم خالد

بعد ایک بار پھر صبح طلوع ہونے کی اُمید بہر حال برقرار رہتی ہے۔

اِس دوران ایک اور عجیب و غریب واقعہ رونما ہوا۔ قریشی صاحب کے بڑے بھائی عزیز جلالی کو اچانک دِل کا دورہ پڑا اور وہ ہسپتال کا رُخ کرنے سے پہلے ہی فوت ہو گئے۔ اِس افسوسناک حادثے نے اُن کی طنابیں ڈھیلی کر دیں۔ اَب وہ گم صم اور کھوئے کھوئے سے رہنے لگے۔ غالباً اُن کا ضمیر اُنہیں ملامت کر رہا تھا کہ انہوں نے ایک کرایہ دار کو ستا کر اچھا نہیں کیا بلکہ اپنے خدا کو ناراض کر دیا ہے۔ اِس واقعے کے کچھ روز بعد وہ ہم سے ملے تو کچھ بجھے بجھے اور خوفزدہ دِکھائی دے رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اُنہوں نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا ہو۔ اُنہوں نے اپنے طرزِ عمل پر معذرت خواہی کی اور طوطے کی طرح مہین آواز میں بولے۔

''شیخ صاحب! ہم نے آپ سے دوکان خالی نہ کرانے کا اِرادہ کر لیا ہے۔ اَب آپ بے شک کشمیر کی آزادی تک یہاں بیٹھے رہیں' یہ گناہگار آپ کو کچھ نہیں بولے گا۔''

''لیکن' قریشی صاحب! ہم نے تو دوسری جگہ دوکان تلاش کر لی ہے اور جلد کاغذی کارروائی مکمل ہونے والی ہے۔''

ہم نے فضا میں تیر چھوڑتے ہوئے کہا۔ دراصل ہم یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ کہیں وہ ہمیں بیوقوف تو نہیں بنا رہے ہیں؟--- ہماری پیشکش سن کر اُن کے تنِ مردہ میں جان آ گئی اور وہ بلبل کی طرح چہکنے لگے۔ اُنہیں اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ جو کچھ سن رہے ہیں' وہ حرف بحرف دُرست ہے۔ وہ حیران تھے کہ انگور اِتنی جلدی میٹھے کیسے ہو گئے؟--- اُنہوں نے اپنی بے پایاں خوشی چھپاتے ہوئے کہا۔

''تو' سرکار! مَیں کب تک رقم لے کر جناب کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں۔''

''ایسی بھی کیا جلدی ہے؟'' ہم نے ڈرامے کا ٹیمپو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ''جب آپ کو سہولت ہو' تشریف لے آئیے گا۔ چشم ما روشن' دِل ما شاد--- لیکن ہماری کچھ شرائط ہیں۔''

شرائط کا ذِکر سن کر اُن کے ہاتھوں کے میاں مٹھو پرواز کر گئے۔ وہ برہم ہو کر بولے۔

''اَب یہ کمبخت شرائط کہاں سے بیچ میں ٹپک پڑیں؟''

''آپ تو جانتے ہیں کہ ہر مچھلی کے ساتھ کانٹے ہوتے ہیں جو کہ کھانے والے کو چبانے پڑتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے' آپ اپنی شرائط کھولیں۔'' وہ زچ ہو کر بولے۔

''اوّل یہ کہ آپ مجھے پورے ڈیڑھ لاکھ روپے بطورِ معاوضہ ادا کریں گے۔ دوم یہ کہ آپ بجلی کے تمام بقایاجات خود ادا کریں گے۔ سوم یہ کہ اَب تک کا جو کرایہ ہے' وہ آپ کو چھوڑنا پڑے گا۔ جب کہ آخری شرط یہ ہے کہ دوکان تین ماہ کے اَندر خالی کی جائے گی۔''

ہمارے چار نکاتی مطالبات سن کر اُن کی سٹی گم ہو گئی جو کوشش کے باوجود بازیاب نہیں ہو سکی۔ اُنہوں نے جب دیکھا کہ بھینس پانی میں جا رہی ہے تو تھک ہار کر بولے۔

''شیخ جی! آپ نے تو قرض دینے والے ساہوکاروں کی طرح بہت کڑی شرائط لگا دی ہیں۔ آپ کی تمام شرائط ماننا ہمارے بس میں نہیں' یہ تو پلِ صراط سے گزرنے والی بات ہے۔''

''لیکن یہ سب تو معمول کی شرائط ہیں' آپ جیسے سیٹھ کے لیے اِنہیں ماننا کوئی مشکل کام نہیں۔''

''نہ جی نہ' آپ تو ہمیں زنجیروں میں باندھنا چاہتے ہیں۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔''

ہم نے جب چڑیا کو اُڑتے ہوئے دیکھا تو آخری جال پھینکا۔ ہم نے کاؤنٹر کا دراز کھولا اور اِس میں سے ایک ٹائپ شدہ کاغذ نکال کر اُن کی طرف بڑھا دیا۔ اُنہوں نے کاغذ کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا مگر کم علمی کی وجہ سے اُن کے پلے کچھ نہیں پڑا۔ وہ جھنجھلا کر بولے۔

''یہ سارا تو انگریجی میں لکھا ہوا ہے۔ مجھے تو کوئی سرکاری کاغذ دِکھ رہا ہے۔''

''آپ بالکل ٹھیک سمجھے' یہ سرکاری کاغذ ہی ہے۔ ہمارے وکیل نے کورٹ سے تین سال کے لیے سٹے آرڈر لے لیا ہے۔ اَب آپ تین سال سے پہلے ہم سے یہ جگہ خالی نہیں کرا سکتے۔''

اُن کا چہرہ آنے والے خطرے کے خیال سے سفید پڑ گیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کاغذ کو دیکھنے لگے۔ یہ سٹے آرڈر نہیں تھا' اُن کے لیے موت کا پروانہ تھا۔ اُن کی ناقص عقل میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دیں گویا اگر گوئیم مشکل' نہ گوئیم مشکل والی صورتِ حال درپیش تھی۔ اُونٹ خیمے میں گھسنے کی بجائے پہاڑ کے نیچے آ گیا تھا۔ اَب اُس کے پاس اپنی پسند کی کروٹ بیٹھنے کا اختیار باقی نہیں رہا تھا۔ اُنہوں نے بے بسی سے عدالتی حکم نامے کو دیکھا۔ اَب چوں چرا کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ کچھ کہے سنے بغیر اُٹھے اور وہاں سے رُخصت ہو گئے۔ ہمارا پلان نہ صرف کامیاب ہو گیا تھا بلکہ ہمارے تمام تیر نشانے پر بیٹھے تھے--- دوسرے ہی روز مطلوبہ رقم کا چیک ہماری میز پر پڑا تھا' قریشی صاحب نے اپنی شکست تسلیم کر لی تھی۔

☆☆

شوخیاں لکھ سنگھ کی

☆ ممتاز احمد تسنیم

(لکھ سنگھ کی خفیہ ڈائری، جس کو اُس نے کرسٹل کے پردوں میں چھپا رکھا ہے، بہت ہی ذاتی ہے جس میں لکھ سنگھ کی شوخیاں، بونگیاں، بدحواسیاں، سکھا شاہی عقل، پریشانیاں، پشیمانیاں اور پے شانیاں کا ڈھکے چھپے، کھلے ڈلے عام عوامی انداز میں واقعات، حوادثات اور اتفاقات کا ذِکر ہے۔ پڑھیں، سر دھنیں اور دانتوں کی نمائش کریں)

ایک روز میرا دوست ترپال سنگھ میرے پاس آیا اور بولا۔

''اوئے، لکھ سنگھ! کیا تو رَبّ پہ یقین رکھتا ہے؟''

مَیں پھوٹا۔ ''آہو، کیونکہ گورونانک کا فرمان ہے کہ رَبّ ہے، پھر مَیں کیسے نہ مانوں؟''

وہ بولا۔ ''اگر مَیں یہ کہوں کہ مَیں رَبّ ہوں تو تُو کیا کہے گا؟''

''میں یہی کہوں گا کہ تو جھوٹا ہے۔''

''اگر مَیں تجھے گواہی دلا دوں تو پھر تو مجھ پہ رَبّ ہونے کا یقین کرلے گا؟''

مَیں لکھ سنگھ اپنے سارے گوروؤں کی سوگند کھا کر کہتا ہوں کہ مَیں اُس کی بات سن کر ایک بار تو سوچ میں پڑ گیا، آخر مَیں سکھ ہوں، نا! پھر بولا۔

''چل تو گواہی دلا دے تو شاید مَیں یقین کرلوں۔''

''تو چل میرے ساتھ......''

اور مَیں ترپال سنگھ کے ساتھ پیدل ہی چل پڑا۔ آدھے گھنٹے کے بعد ترپال سنگھ نے ایک دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلا تو اندر سے بڑی سندر ناری نکلی۔ اُس نے پہلے مجھے دیکھا اور جب اُسکی نظر ترپال سنگھ پر پڑی تو وہ چونک کر بولی۔

''ہائے وے رَبا، توں فیر آ گیا ایں......؟''

یہ سنتے ہی ترپال سنگھ مجھے لے کر واپس مڑا اور بولا۔ ''اب تو کیا کہتا ہے؟''

مَیں لکھ سنگھ نے کیا کہنا تھا، ماننا پڑا کہ اُسے لوگ رَبّ کہتے ہیں اور میرا اعتقاد بھی لڑکھڑا گیا اور مَیں آج بھی سوچتا ہوں کہ اُس سندر ناری نے ترپال سنگھ کو ''ہائے میریا رَبا!'' کیوں کہا تھا۔ اِس کا جواب آج تک مجھے نہیں ملا۔

☆☆

مَیں، لکھ سنگھ نے اپنے جلندھر کی ایک نئی کالونی میں مکان بنوایا۔ وہاں ابھی ٹاویں ٹاویں (کہیں کہیں) مکان بنے ہوئے تھے۔ مَیں اپنی بے بے کے ساتھ نئے مکان میں منتقل ہوگیا۔ اُس کالونی میں دو چار بار چوری ہوئی تو مَیں، یعنی لکھ سنگھ سوچ میں پڑ گیا کہ گارڈ رکھنے کا میں متحمل نہیں ہوسکتا تو پھر کیا کروں؟ میرے دوست بھگندر سنگھ نے کہا۔

''لکھا! زیادہ سوچا نہ کر، میرے پاس والے مکان میں ایک بندہ ہے اور وہ کُتے بیچتا ہے تُو ایک کتا خرید لے۔''

چنانچہ مَیں نے اِس کے مشورے پر عمل کیا اور ایک خوفناک کتا خرید لیا اور گھر میں باندھ دیا۔ رات کو اُسے کھول دیتا۔ اِس کے باوجود ایک رات چور آئے اور میری سائیکل لے گئے۔ یہ اچھا ہوا کہ سائیکل کی گدی اور ہینڈل مَیں نے احتیاطاً اُتار کر رکھ لئے تھے اور جان بوجھ کر سائیکل کے ٹُتے فیل کر دیئے تھے۔ پھر بھی نقصان ہوگیا مگر گدی اور ہینڈل بچ گئے۔ وہ کتا، پورا کُتے کا بچہ ثابت ہوا۔ چور اپنا کام کر گئے اور وہ کُتے کا بچہ سوتا ہی رہا...... مَیں بھگندر سنگھ کے پڑوسی کے پاس گیا۔

''تم نے کیسا خبیث کُتے کا بچہ مجھے بیچا ہے، گھر میں چوری ہوگئی اور وہ سوتا رہا؟ مَیں اِسے واپس کرنے آیا ہوں۔''

وہ بولا۔ ''سردار جی! ہمارا اصول ہے کہ ہم بیچی ہوئی چیز واپس نہیں لیتے۔''

''تو پھر اِس کا علاج ہے تمہارے پاس؟'' مَیں، یعنی لکھ سنگھ نے پوچھا۔

وہ بولا۔ ''آہو جی! ہم سکھ تھوڑے ہیں کہ ہمارے پاس اِس کا علاج نہ ہوگا۔''

''وہ کیا علاج ہے؟''

''وہ یہ ہے جی کہ آپ یہ چھوٹا کتا خرید لیں۔ جب بھی آپ کے گھر میں چور داخل ہوگا' یہ چھوٹا کتا آپ کے جھبرے کُتے کو جگا دیا کرے گا...... کیسا ہے علاج؟''

مَیں لکھ سنگھ اُس کے مشورے پر عش عش کر اُٹھا اور چھوٹا کتا خرید لایا۔ اِس کے باوجود گھر میں چور آ گئے اور میری سائیکل کی گدی اور ہینڈل لے گئے مگر نہ چھوٹے کُتے نے بڑے کو جگایا اور نہ چوروں کو بھگایا۔ اب میرے پاس دو کُتے ہیں اور مَیں سوچ رہا ہوں کہ آئندہ چوروں سے بچنے کے لئے کیا ترکیب استعمال کروں مگر میری عقل کام نہیں کر رہی۔ آپ مشورہ دیں کہ مَیں کیا کروں۔

☆☆

میرا ایک دوست گلدار سنگھ ہے اور پولیس میں سب انسپکٹر ہے۔ ایک روز معلوم ہوا کہ وہ ہسپتال میں ہے۔ مَیں اُسے دیکھنے گیا۔

''اوئے' گلدارا! کیا ہوا ہے تجھے؟''

''کیا بتاؤں' لکھ سنگھا! مجھے کُتے نے کاٹ لیا ہے۔''

مَیں بولا۔'' بکواس نہ کر اوئے' گلدارا! اپنے جلندھر کے کتوں کی کیا مجال کہ وہ پولیس یا فوج والوں کو کاٹ سکیں...... ویسے اُس نے کاٹا کیسے تھا؟''

گل دار سنگھ نے جھپٹ کر میری کلائی پکڑی اور اُس میں اپنے دانت گاڑ دیئے کہ ''ایسے کاٹا تھا۔''

مَیں لکھ سنگھ درد سے بلبلا اُٹھا۔ کلائی چھڑا کر اُس کے منہ پہ تھپڑ مارا اور روتے ہوئے پوچھا۔

''اُس کم بخت کُتے کے بچے کو ہمت کیسے ہوئی کہ گل دار سنگھ سب انسپکٹر کو کاٹ لے' اُس کُتے کو اپنی موت نظر نہ آئی؟''

''یار' لکھ سنگھ......!'' میرا دوست گل دار سنگھ بولا۔''یار! اُس میں اُس کُتے کا قصور نہیں تھا۔ جب اُس نے کاٹا تو مَیں بغیر وردی کے تھا۔''

مجھے' یعنی لکھ سنگھ کو اِس سے کوئی غرض نہیں کہ گل دار سنگھ وردی میں تھا یا بغیر وردی کے تھا لیکن میری شامت ہی آئی تھی۔ جب مَیں ڈریسنگ کروانے گیا تو ہسپتال کے ڈاکٹر نے مجھے روز آ کر پیٹ میں سات ٹیکے لگوانے کو کہا اور مجھے یہ ٹیکے لگوانے پڑے۔ ڈاکٹر کا خیال تھا کہ مجھے کُتے نے کاٹ لیا ہے۔

☆☆

میرا ایک اور دوست ہے اور وہ بھی میری ہی طرح پورے کا پورا سکھ ہے پر ہے وہ بڑا سوہنا اور نام بھی اُس کا سوہنا سنگھ ہے۔ ایک روز میرے پاس آیا اور بولا۔

''یار! مجھے ایک چھوکری سے پیار ہو گیا ہے۔''

مَیں بہت حیران ہوا کیونکہ سکھ کا کسی چھوکری سے پیار ہو جانا' سات عجائبات میں سے ایک عجوبہ ہو سکتا ہے۔''

''اوئے! کبھی تیرے باپ نے بھی چھوکری سے پیار کیا ہے؟''

وہ ساڑھے تین کلو کا سر (پگڑی سمیت) ہلا کر بولا۔''نہیں' اُس نے صرف ویاہ کیا تھا۔''

''اوئے' تو جانتا ہے کہ سکھوں میں چھوکری کس کو کہتے ہیں؟''

وہ کسی بندر کی طرح منہ کھولے میری طرف دیکھتا رہا۔ مَیں' یعنی لکھ سنگھ بولا۔

''ہمارے مذہب میں دس سال سے چھوٹی بچی ''چھوکری'' کہلاتی ہے۔''

وہ بہت ہی حیران ہوا اور اِس کی حیرانی پہ مَیں پریشان سا ہوا۔

''یار......!'' وہ سوہنا سنگھ بولا۔''جس سے مَیں پیار کرتا ہوں' وہ تو جوان ہے۔''

''تو پھر تو نے اُس کو چھوکری کیوں کہا؟''

سوہنا سنگھ شرمندہ سا ہو گیا۔''بس' یار! مجھ سے غلطی ہو گئی ہے۔''

''کیا وہ بہت سوہنی ہے؟''

''آہو......''

''تو پھر مسئلہ کیا ہے؟'' مَیں نے پوچھا۔

سوہنا سنگھ بولا۔''یار! دو سال پہلے وہ مجھے ملی تھی۔ مَیں نے اُس سے محبت کا اظہار کیا' وہ بہت خوش ہوئی اور پھر اُداس ہو گئی۔ مَیں نے اِس سے اُداسی کی وجہ پوچھی تو وہ بولی کہ سوہنیا! تو بڑا سوہنا ہے' میری تیری جوڑی خوب بجتی پر ایک مسئلہ ہے اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ میں تجھ سے دو سال بڑی ہوں اس لئے تیرا میرا ویاہ نہیں ہو سکتا۔''

''پھر کیا ہوا؟'' مَیں نے پوچھا۔

سوہنا سنگھ بولا۔''مَیں یہ کہتے ہوئے واپس آ گیا کہ مَیں دو سال بعد آؤں گا تب ہم دونوں ہم عمر ہو جائیں گے' پھر ہم ویاہ کر لیں گے...... مَیں دو سال بعد پھر اُس کے پاس گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر خوش ہوئی اور پھر اُداس ہوئی اور بولی کہ سوہنیا! مَیں تجھ سے دو سال بڑی ہوں' تیرا میرا ویاہ نہیں ہو سکتا۔ مَیں مایوس ہو کر واپس آ گیا' اب بتا' لکھ سنگھ! کہ مَیں کیا کروں؟''

مجھے اُس کی پریشانی پہ رونا آ گیا اور بہت سوچ بچار کے بعد مَیں نے اُس کو مشورہ دیا کہ وہ دو سال بعد پھر اظہارِ مدعا کرے' شاید اُس وقت تک وہ اِس کی ہم عمر ہو جائے...... آپ بتائیں کہ مَیں نے اِس کو صحیح مشورہ دیا ہے یا غلط؟

☆☆

جس دفتر میں کام کرتا ہوں وہاں چرن سنگھ بھی کام کرتا ہے۔ اِس کے بال بچے امبرسر میں رہتے ہیں۔ اِس کی عقل عموماً گھاس چرنے جایا کرتی

ہے۔

ایک روز وہ دفتر میں بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا بہت آہستہ آہستہ اور سوچ سوچ کر۔ مَیں یعنی لکھ سنگھ نے اُسے ایک فائل لانے اور پیش کرنے کو کہا تو چرن سنگھ بولا۔

''سردار جی! مَیں یہ فائل ایک گھنٹہ سے پہلے آپ کی خدمت میں پیش نہیں کرسکوں گا۔''

مجھے، یعنی لکھ سنگھ کو اُس کے جواب پہ حیرانی کے ساتھ غصہ بھی آیا۔ مَیں نے پوچھا۔

''کون سا ایسا ضروری کام کر رہے ہو کہ ایک گھنٹہ سے پہلے وہ فائل نہیں لاسکتے حالانکہ وہ فائل تمہاری میز پر ہوگی یا الماری میں ہوگی؟''

وہ بولا۔ ''سر جی! مَیں اپنے بالک کھڑن سنگھ کو خط لکھ رہا ہوں اور آپ جانتے ہیں کہ وہ امبر سر کے پنڈ میں رہتا ہے۔''

''کیا ایک گھنٹہ تک اُسے اتنا لمبا خط لکھو گے کہ اُسے پڑھنے میں بھی ایک گھنٹہ لگے گا؟''

''نہیں، جی......'' وہ بولا۔ ''خط تو صرف کاپی کے ایک صفحہ پر لکھوں گا۔''

''کاپی کے ایک صفحہ پر خط لکھنے میں ایک گھنٹہ تو نہیں لگتا، چرن سنگھا؟''

''سر جی......!'' وہ بولا۔ ''مَیں جی اُس کو آہستہ آہستہ خط لکھوں گا۔''

''مگر وہ کیوں؟''

''سر جی! بات یہ ہے کہ میرا بالک کھڑن سنگھ ابھی صرف چوتھی جماعت میں پڑھتا ہے۔ مَیں آہستہ آہستہ خط لکھوں گا تو وہ آہستہ آہستہ پڑھ سکے گا۔ اگر مَیں اُسے تیز تیز خط لکھوں گا تو آپ خود سوچیں کہ چوتھی کلاس کا لڑکا اِس خط کو تیز تیز کیسے پڑھ سکے گا...... آئی بات سمجھ میں؟''

چرن سنگھ کی بات میری سمجھ میں آگئی مگر ایک گھنٹہ کی تاخیر کی وجہ سے جو مجھے اپنے باس سے گالیاں سننا پڑیں، مجھے اِس کا دُکھ بالکل نہیں ہے کیونکہ باس نے مجھے ''بونگا، نکما، نااہل'' وغیرہ کہا تھا۔

☆☆

''تم جانتے ہو کہ ہمیں بجلی کے انجینئر کی ضرورت ہے؟''

''ہاں جی، مجھے معلوم ہے۔''

''مَیں، یعنی لکھ سنگھ نے جواب دیا۔ دراصل مَیں اُن دِنوں دِلی گیا ہوا تھا اور وہاں میرے پیسے کسی نے جیب سے نکال لئے۔ اگر مَیں جلندھر اپنے ابے کو پیسے بھیجنے کا لکھتا تو وہ پیسوں سمیت دِلی آکر میرا دھڑن تختہ کر کے نئی نئی اور ون سونی گالیوں سے نوازتا۔ چنانچہ اِس سے بچنے کے لئے مَیں نے سوچا کہ چند دِن نوکری کرلوں تو واپسی کا کرایہ بنا کر اپنے جلندھر چلا جاؤں گا ورنہ مقررہ وقت سے پہلے واپسی پر ''چھترول'' اور ''لترول'' ہونے کا خدشہ تھا۔

اخبار میں اشتہار پڑھا تو مَیں انٹرویو دینے چلا گیا۔ وہ تین سکھ بیٹھے انٹرویو لے رہے تھے۔

پہلے انہوں نے نام پوچھا، پھر باپ کا نام پوچھا، شہر کا نام پوچھا اور میری تعلیم پوچھی۔ مَیں نے سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔ ایک بولا۔

''ہمیں بتاؤ کہ بجلی کی موٹر کیسے چلتی ہے؟''

مَیں بولا۔ یہ کوئی مشکل سوال نہیں ہے۔ پہلے سوئچ کو پلگ میں لگایا جاتا ہے پھر بٹن آن کر دیا جاتا ہے اور اِس بٹن کے آن کرنے سے موٹر چلنا شروع ہوتی ہے۔ ایسے گھرررر گھرررر......''

انہوں نے مجھے ملازم رکھ لیا۔ تین دِن بعد اِن کا ہندو مالک بالک رام ممبئی سے آگیا۔ اُس نے مجھے تین دِن کی تنخواہ دے کر فارغ کر دیا حالانکہ موٹر چلنے کا زبانی مظاہرہ مَیں اُس کے سامنے بھی کر چکا تھا مگر پھر بھی اُس نے مجھے نوکری سے نکال کر میری بےعزتی خراب کر دی مگر چونکہ میرا کرایہ بن گیا تھا، مَیں واپس اپنے شہر جلندھر آگیا۔ بڑوں نے سچ کہا ہے کہ اپنا شہر اپنا ہی ہوتا ہے۔

☆☆

وہ مقدمہ ہی بڑا زبردست تھا۔ سارے جج سکھ تھے۔ وہ کئی بار اکٹھے بیٹھے مگر کسی فیصلہ پر نہ پہنچ سکے۔ سوال یہ تھا کہ کمپنی کی طرف سے ملنے والی پندرہ لاکھ کی رقم اِن تینوں کی بیواؤں کو برابر ادا کی جائے یا کسی اور طرح تقسیم کی جائے کیونکہ جان ہارنے والوں کی بیواؤں کے بیانات سے عجیب صورت حال پیدا ہوگئی تھی۔

قصہ یوں ہے کہ ہمارے جلندھر میں ایک دس منزلہ عمارت تعمیر ہو رہی تھی۔ آٹھ منزلوں کے بعد نویں منزل پہ کام ہو رہا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے وقفہ میں تین دوست، جو تینوں بلڈنگ سپروائزر تھے اور آپس میں بھائی بھی بنے ہوئے تھے، وہ سب کھانا اکٹھا کھاتے تھے۔ اپنا اپنا ٹفن کھولتے اور مل بانٹ کر کھاتے۔ ایک تو تھا مرلی دھر جو بنگالی تھا، دوسرا تھا موہن مرالی جو مرہٹہ تھا اور تیسرا تھا مان سنگھ جو سکھ تھا۔ مرنے سے ایک روز پہلے کھانے پہ بیٹھے تو مرلی دھر کے ڈبے میں سے مچھلی نکلی۔

''اوئے، مرلی! آج پھر موشلی ہے؟''

''ہاں، بابو! کیا کروں......''

''کل اگر تیرے ٹفن سے موشلی نکلی تو تو نویں منزل سے چھلانگ لگا دینا۔''

''منجور ہے، بھائی مان سنگھ! منجور ہے......''

''اب تو اپنا ٹفن کھول، مرالی!''

مرالی کے ٹفن میں سے دال نکلی۔ ''آج پھر دال...... اوئے، مرلی! کل اگر تیرے ٹفن سے دال نکلی تو تو بھی چھلانگ لگا دینا۔''

''بروبر لگائے گا' ہمارا جبان پہ بھروسہ کرو۔''

اب مان سنگھ کی باری تھی۔ اُس کے ٹفن سے حسب معمول تین پراٹھے نکلے۔

اب بول کہ تیرا کیا بنے گا' اگر کل بھی پراٹھے نکلے؟'' مرلی دھر نے پوچھا۔

''میں بھی چھلانگ لگا دوں گا...... سونہہ گورو کی' ضرور' چھلانگ لگاؤں گا۔''

اگلے روز تینوں نے نویں منزل سے چھلانگ لگائی اور تینوں کے تینوں مر گئے۔ کمپنی والوں کو مصیبت پڑ گئی۔ اگلے روز مردے جلانے کے بعد اِن کی عورتوں سے پوچھ گچھ کی گئی۔ مرلی دھر کی بنگالن بی بی بولی۔

''اگر مجھے پتہ ہوتا کہ مچھلی اِس کی مت کا باعث بنے گی تو میں کچھ اور سالن بنا دیتی...... ہائے......''

موہن مرالی کی مراٹھی بیوی نے کہا۔ ''مجھے کیا پتہ تھا کہ دال کی وجہ سے مرے گا ورنہ میں بھرتہ بنا دیتی۔''

مان سنگھ کی بیوی کا بیان بڑا چونکا دینے والا تھا۔ ''ہائے' ہائے...... واہ گورو کی قسم! میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں اپنے مان کو صبح ناشتے میں رات کی باسی روٹی اور سالن دیتی تھی لنچ کے لئے پراٹھے سردار جی خود بناتے تھے۔ میرا کوئی دوش نہیں ہے۔''

ججوں نے مسئلہ کی ٹیڑھ دیکھتے ہوئے لوگوں (سکھوں) سے رائے مانگی۔ پرائے پھٹے میں ٹانگ صرف میں' یعنی لکھ سنگھ ہی اڑا سکتا تھا۔ میں جیوری کے سامنے پیش ہوا اور دلیل سے ثابت کیا کہ مرلی دھر اور موہن مرالی کی بی بیاں قصور وار ہیں۔ نہ وہ موشلی دال پکاتیں اور نہ وہ دونوں مرتے۔ لہٰذا اُن دونوں کو قصور وار ٹھہرایا جائے اور کمپنی کی رقم اِنہیں نہ دی جائے۔ چونکہ مان سنگھ کی جورو پوری پوری بے قصور ہے اِس لئے سارے کے سارے پندرہ لاکھ اُس کو دے دیئے جائیں...... واہ گورو کی کرپا سے میری' یعنی لکھ سنگھ کی دلیل کام کر گئی اور مان سنگھ کی بیوہ کو پندرہ لاکھ مل گئے۔ (ویسے آپس کی بات ہے کہ مان سنگھ میرے چاچے کا پتر تھا...... ہیں' جی!)

☆☆

مارا ہم تینوں نے مل کر اِن تینوں کو تھا مگر یقین نہیں تھا کہ وہ مر ہی جائیں گے اور وہ بدبخت سچ مچ مر بھی گئے۔ ہم تینوں پکڑے نہ جاتے مگر میں' یعنی لکھ سنگھ پکڑا گیا اور میرا پکڑا جانا ہم تینوں کا پکڑا جانا تھا۔ چنانچہ تینوں پکڑے گئے۔ حکم ہوا کہ اِن تینوں کو باری باری پھانسی پہ لٹکا دیا جائے۔ چنانچہ ہم تینوں' یعنی کرم دین' کرتو رام اور لکھ سنگھ سے پوچھا گیا۔

''بتا تیری رضا کیا ہے؟''

ہم نے آپس میں مشورہ کیا۔ مقدمہ چلا' نہ اپیل ہوئی' بس پکڑے گئے اور سیدھی سیدھی پھانسی کی سزا سُنا دی گئی۔ ہائے' ہائے کیا اندھیر ہے۔ داد ہے' نہ فریاد ہے۔ نہ کوئی کسی کو یاد ہے۔

''یار! اِن لوگوں نے ہمیں پھانسی دے کر ہی رہنا ہے تو کیوں نہ کوئی انوکھا رستہ اختیار کیا جائے۔''

''مثلاً' کیا طریقہ ہو؟'' کرم دین نے پوچھا۔

میں بولا۔ ''یار! جیل کے اندر پھانسی چڑھنے کا مزہ نہیں آئے گا' اِن سے آخری خواہش بیان کی جائے کہ ہمیں کسی سرسبز اور شاداب جگہ پر پھانسی لگائیں۔''

''تیرا مطلب ہے کہ ہمیں گاندھی گارڈن میں لٹکا دیں۔'' کرتو رام بولا۔

''نہیں' یار......!'' میں بولا۔ ''اگر ہم خواہش ظاہر کریں کہ جمنا دریا کے اوپر پھانسی گھاٹ بنا کر ہمیں چڑھا دیں تو یارو بہت ہی مزہ آئے گا۔''

''چلو' یہ بھی کر کے دیکھتے ہیں۔'' کرتو رام کی دھوتی گیلی ہو گئی۔

یہ سرکار کے کارندے بڑے تیز ثابت ہوئے۔ فوراً ہی دریا کے عین اوپر کنارے پر پھانسی گاڑ دی اور ہمیں وہاں لے گئے۔

''اوئے' پہلے کس کو چڑھایا جائے؟''

آپس میں بولے اور پھر خود ہی فیصلہ کیا کہ کرم دین چونکہ مسلا ہے' اِس کو پہلے چڑھا دو۔ جب کرم دین کے گلے میں رسہ ڈال کر لیور دبایا گیا تو رسہ ٹوٹ گیا' کرم دین دریا میں گر پڑا اور وہ تیرتا ہوا جمنا پار چلا گیا...... اُسی رسّے کو پھر ٹھیک کیا گیا۔ اب کے باری تھی کرتو رام کی جسکی دھوتی بار بار گیلی ہو رہی تھی۔ رسہ اِس کے گلے میں ڈالا گیا' لیور دبایا گیا تو رسہ پھر ٹوٹ گیا۔ کرتو رام کی جان بچی' وہ بھی تیرتا ہوا جمنا پار چلا گیا...... اب کے میری باری تھی' میں اکڑ گیا۔

''میں پھانسی نہیں چڑھوں گا' سمجھے!''

''اوئے' تیرا ابا بھی پھانسی چڑھے گا۔''

''مترو تے ساتھیو! میری بنتی ہے کہ پہلے تم دونوں جلادوں میں سے ایک پھانسی پر چڑھ کر رسّے کی مضبوطی کا جائزہ لو۔ اگر رسہ مضبوط ہوگا تو میں پھانسی چڑھ جاؤں گا' سمجھے!''

اُن کو بات سمجھ آ گئی کیونکہ دونوں جلاد بھی سکھ تھے۔ ایک پھانسی پر چڑھا' دوسرے نے لیور دبایا' اب کے رسے نے ٹھیک کام کیا۔ وہ دونوں اُس طرف معروف تھے اور میں وہاں سے اپنی دھوتی' پگڑی' کچھے' کڑے' کرپان اور کنگھے سمیت دوڑ پڑا۔ راستے میں بڑا سا کھال آیا' میں نے چھلانگ لگائی مگر دھوتی آڑے آئی اور میں گر پڑا۔ ہوش آئی تو میں پلنگ سے نیچے گرا ہوا تھا اور میری دھوتی بھی کرتو رام کی طرح گیلی ہو چکی تھی۔

☆☆

ایک اچھی لڑکی

☆ فائزہ شکور

بی اے کرنے کے بعد خیر سے ہم بھی ڈگری یافتہ کہلوانے لگے تھے اور جب خود کو ڈگری یافتہ کہلوا کہلوا کے ہمارا دِل بھر گیا تو سوچا کہ کوئی چھوٹا موٹا کمپیوٹر کورس ہی کر ڈالیں۔ ایک سیکنڈ ہینڈ' تھرڈ یا شاید فورتھ ہینڈ (خیر اِس بحث کو جانے دیں) کمپیوٹر خرید لیا اور اِس کے کی بورڈ کی کیز پر ٹھکا ٹھک شروع کر دی' کچھ پروگرام اِنسٹال کرنا سیکھ لیے اور تھوڑی ٹائپنگ بھی --- اَب ہم اپنے سی وی پر لکھ سکتے تھے کہ کمپیوٹر آتا ہے۔ یہ نہ لکھتے کہ کتنا آتا ہے' یہ ہماری چالاکی تھی۔ جب جاب کے لیے اپلائی کیا تو ہم نے سی وی دِکھایا۔ اُنہوں نے کمپیوٹر خواندہ ہونے کا سرٹیفکیٹ پوچھا تو ہم نے دانت نکال کے دِکھا دیئے اور ہم ماشاءاللہ سے اِنٹرویو میں ناکام ٹھہرے۔ سرٹیفکیٹ کی ضرورت محسوس ہوئی تو مقامی کمپیوٹر سنٹر میں داخلہ لے لیا۔ کورس کا پاس کرنا تھا کہ ایک مقامی ادویہ ساز کمپنی میں فون آپریٹر کی نوکری مل گئی جو بعد میں کمپیوٹر آپریٹر کی ثابت ہوئی۔ یہاں پر اُنہوں نے ہمارا سرٹیفکیٹ (جو ہم نے بڑی مشکلوں سے کڑی جھلتی دوپہروں میں کلاسز اٹینڈ کر کر کے حاصل کیا تھا) دیکھنا تک گوارا نہ کیا۔ ہمارا اِتنی جلدی جاب کرنے کا کوئی اِرادہ نہ تھا کہ ہم ہر کام دو چار سال سوچ بچار کر کے ہی سرانجام دیتے تھے لیکن اِس دفعہ سوچنے کا موقع نہ مل سکا۔ پھوپھو نے اشتہار دیکھا اور دوسرے روز ہمیں اِنٹرویو کے لیے لے گئیں' اِنٹرویو ہمارے بجائے پھوپھو نے ہی دیا۔ ہمیں اپنی اہلیت پر اَب بھی اعتبار نہ آیا تھا کہ ہم نوکری کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ تھے' جسمانی طور پر تھے کہ کالج میں اِنٹرن شپ کے دوران ہم نے لپ اسٹک لگانا اور مس کہلوانا شروع کر دیا تھا۔

نوکری کا پہلا سعد دِن بھی آن پہنچا۔ ہم نئے نئے دین میں داخل ہوئے تھے۔ اِس کا مطلب یہ نہ لیجئے گا کہ ہم نئے نئے مسلمان ہوئے تھے' مسلمان تو ہم ماشاءاللہ سے باپ دادا کے طفیل پیدائشی تھے لیکن پردے کا رجحان اَب ہوا تھا۔ اِن دِنوں ہم پردے کے سخت پابند ہو چکے تھے۔ آپ پوچھیں گے کہ اَب نہیں ہیں؟ تو اَب نرم پابند ہیں' ہم لوگوں نے اپنی سہولت کے لیے گنجائشیں نکال لی ہیں --- اپریل کا مہینہ تھا یعنی موسم اچھا تھا۔ اِس کمپنی میں دو سیکشنز تھے۔ ایک سیکشن میں دوائیاں بنتیں اور دوسرا سیکشن ہمارا یعنی کمپیوٹر سیکشن تھا۔ دونوں سیکشنز میں ہمارے علاوہ ایک ہی فی میل (اپنی تمام تر جسامت کے ساتھ) ہم سے پہلے موجود تھیں۔ کمپیوٹر سیکشن چھوٹا سا تھا۔ ہمیں چھوڑ کر چار لوگ اور تھے جن میں سے دو آ چکے تھے۔ مشرف اور سلطان --- مشرف صاحب عمر رسیدہ تھے۔ ویسے وہ عمر رسیدہ کہلوانا پسند نہیں کرتے تھے' اولڈ بوائے چاہے کہہ لو کیونکہ اِس میں بوائے تو آتا ہے۔ دوسرے ہمارے ہی عمر کے شیطان --- ہمارا مطلب' سلطان تھے۔ دونوں حضرات باریش تھے اور ہم نقاب شدہ۔ بڑا اِسلامی ماحول ہے ماشاءاللہ' ہم نے دِل میں سوچا --- ہم پھوپھو کے ہمراہ تھے۔ لاریب بھی تشریف لے آئیں' وہ DHMS یعنی ہومیو پیتھک ڈاکٹرنی تھیں اور یہاں ادویہ سازی (فارمیسی) کے لیے آئی تھیں لیکن ادویہ کی پیکنگ کرتی تھیں۔ اُنہیں دونوں موجود حضرات بڑی خوشدلی سے "ڈاکٹر صاحبہ' ڈاکٹر صاحبہ" کہہ کر پکار رہے تھے اور لگتا تھا کہ ڈاکٹرنی کی آمد سے ہی اِن کو خاصا افاقہ ہوا' مشرف صاحب کے چہرے پر تو زیادہ رونق آ گئی تھی۔ لاریب جس بے تکلفی سے دونوں حضرات سے باتیں کر رہی تھی' دیکھ کر ہم بوکھلا گئے اور فوراً احساسِ کمتری کا شکار ہو گئے کیونکہ اِس طرح تڑ تڑ کی بہ تر کی صنفِ مخالف کو جواب دینا ہمارے بس کا کام نہ تھا اور ہم تو اُردو میں بھی جواب نہ دے سکتے تھے۔ ہم پچھتائے کہ اگر "کوایجوکیشن" میں پڑھے ہوتے تو آج یوں کھڑے --- مطلب' سر جھکائے بیٹھے نہ ہوتے۔ خیر اللہ اللہ کر کے نو بجے سے دفتر کا وقت شروع ہوتا تھا۔ لاریب اور پھوپھو چلے گئیں اور ہم خود کو میلے میں "گواچا" محسوس کر رہے تھے۔ سیکشن کے باقی ماندہ دو حضرات بھی رونق افروز ہو چکے تھے۔ اِن میں سے ایک داڑھی یافتہ تھا اور دوسرا اِس کا مخالف یعنی کلین شیو --- کلین شیو منان صاحب اِس سیکشن کے اِنچارج تھے اور دوسرے نام نہاد مولوی جاوید --- ہم سر

جھکا کر بلکہ کمپیوٹر پر نظریں جما کر بیٹھے ہوئے تھے' اِدھر اُدھر یا کسی کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ کر پا رہے تے۔ بظاہر ہم کمپیوٹر کی سکرین کو گھور رہے تھے لیکن نظر ہمیں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ دِل دھک دھک کا بیک گراؤنڈ میوزک بجا رہا تھا اور خود گراؤنڈ میں بھی یہی تھا۔ وحشت سی ہونے لگی تھی' بس دِل چاہ رہا تھا کہ فوراً اُٹھ کر گھر کو بھاگ جائیں۔ ذہن کے بلب کا فیوز اُڑ گیا تھا' نہ کچھ بھائی دے رہا تھا اور نہ سنائی دے رہا تھا۔ اِس کیفیت کا شکار ہم دوپہر کے کھانے کی بریک تک رہے یہاں تک کہ لاریب نے ہمیں آ کر ہلایا جلایا اور ہم اُس کے ساتھ کھانے کو چل دیئے۔

لاریب جتنی جسیم تھی' اِتنی ہی خوبصورت (بعد از میک اَپ) تھی۔ بریک ٹائم میں کھانے اور میک اَپ کو برابر وقت دیتی۔ میک اَپ کے دوران بات کر لیتی تھی البتہ کھانے کے دوران بات کرنے کا ٹائم نہ نکال پاتی۔ زیادہ وقت آئینہ دیکھتے گزرتا۔ ہمارے سیکشن میں آتی تو اکثر آئینے کی فرمائش کرتی۔ ہم آئینہ نہ رکھتے تھے' معذرت کرتے تو کہتی۔

''کبھی اپنی شکل آئینے میں دیکھی ہے۔''

ہم کہتے ''صبح دیکھ کر آئے تھے---''

''اَب اُتر گئی ہے۔'' سلطان کا تبصرہ ہوتا--- ہماری شکل لاریب کے آتے ہی اُتر جاتی تھی۔

کام ہم نے سمجھ لیا تھا اور سر جھکا کے' کان بند کر کے کرتے رہتے تھے۔ تمام سٹاف ممبرز سے باضابطہ تعارف کا ذریعہ مشرف صاحب تھے اور بعد میں بھی وہ تمام سٹاف کے جذبات کی ترجمانی کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ ہماری اِس عادت سے لاریب کو سخت نفرت تھی۔ کہتی کہ آفس کے لوگوں کے ساتھ تم گھر کے افراد سے زیادہ وقت گزارتی ہو' پورے دس گھنٹے اِس لیے اِن کو اپنے گھر کے ممبرز کی طرح سمجھو لیکن وہ ہم سمجھ نہیں سکتے تھے' شاید ہماری سمجھ میں اِتنی بڑی بڑی باتوں کی گنجائش نہ تھی۔ فیکٹری کی سائیڈ پر لاریب کے علاوہ تین میل ڈاکٹرز اور بھی تھے۔ سب سے سینئر چراغ دین' اِس سے چھوٹا راشد اور دونوں کا مشترکہ چیلا بمیر--- ہمارے سیکشن والے اِنہیں سائنسدان کہتے تھے۔ تینوں بیچارے ہمیشہ جلدی میں اور فیکٹری کے مالک کے آس پاس منڈلاتے رہتے تھے۔ لاریب اِن سب سے جونیئر تھی اور اِن کی دُم کی طرح تینوں کے پیچھے پیچھے ہوتی کہ شاید اِسے بھی اِن شعبدہ بازوں سے کوئی گر کی بات پتہ چل جائے مگر وہ بھی اِتنے پکے تھے کہ اپنی خفیہ میٹنگز اور فارمولوں کی بھنک تک نہ لاریب کو پڑنے دیتے۔

فیکٹری کی سائیڈ پر ڈاکٹروں کو چھوڑ کے باقی تمام سٹاف کا منیجر بہلو تھا' اکاؤنٹس بھی وہی دیکھتا اور کبھی کبھار جمع تفریق لاریب سے بھی کروا لیتا اور حساب میں غلطی نکلنے پر مجھ سمیت تمام خواتین کو مزے لے لے کر لاریب کی غلطیاں بتاتا۔ خواتین سے بات کرنے کا شوقین تھا اور اِس کے علاوہ کتنا شوقین تھا' ہم نہیں جانتے تھے۔ ہم سے پہلی فون آپریٹر کے ساتھ نہایت اچھے تعلقات کی وجہ سے بے چاری کو اپنی نوکری سے ہاتھ دھونا پڑے' بہلو کی تھوڑی بہت اپنی بیگم سے بھی تواضع ہوئی۔ لاریب تو ایک طرف سائنسدانوں کے ٹولے کی ہدایات پر عمل کرتی اور دوسری طرف بہلو کا جاری کردہ ہدایت نامہ بھی اُسے سننا پڑتا۔ بہلو نام کا ہی بہلو تھا' طبیعت اِس کی ہٹلر اور چنگیز خان سے ملتی تھی۔ جب حساب کتاب کر رہا ہوتا' اِس دوران لاریب کا اِس کے پاس بیٹھنا ضروری تھا۔ وہ ایک طرف جمع تفریق کرتا رہتا' ساتھ ساتھ ورکرز کی چغلیاں کھاتا رہتا جیسے کوئی چیونگم چبائی جاتی ہے۔ لاریب کو کچھ نہیں کرنا ہوتا تھا' بس ہاں میں ہاں ملانا ہوتی ویسے بھی وہ اِس جیسے کئیوں کو ہینڈل کر سکتی تھی' ہونہار تھی نا!

ہماری تعیناتی کے بعد کمپیوٹر سیکشن میں لاریب کا آنا جانا کافی سے زیادہ اور قابلِ غور ہو گیا تھا۔ اِس کی آمد سے ہماری چاروں کولیگز گوبھی کے پھولوں کی طرح کھل جاتے۔ ہر کوئی آگے ہو ہو کے لاریب کا حال چال دریافت کر رہا ہوتا اور ہمیں حیرت ہوتی کہ ہم صبح سے بیٹھے ہیں۔ ہمارا کسی نے پھوٹے نہ سہی' جھوٹے منہ بھی حال دریافت نہیں کیا؟--- لاریب سب کو فرداً فرداً اپنا حال بتا کر' اِن کی فکر رفع کر کے منان صاحب کی میز پر جا بیٹھتی۔ دونوں کی گفتگو کا مرکز زیادہ تر گانے ہوتے۔ ہم سن رہے ہوتے تھے اور جو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے ہوتے' وہ ہم سن نہ سکتے تھے۔ کبھی وہ منان صاحب کا کیمرے اور ایف ایم والا موبائل لے کر ہینڈز فری لگا کر فیکٹری کی سائیڈ پر چلے جاتی اور آرام سے بیٹھ کر گانے سنتی۔ اِس دوران بہلو اور بقیہ اسٹاف جلے پیروں کی بلی کی طرح اِس کے آس پاس چکر لگاتے رہتے مگر لاریب' منان صاحب کے گانوں میں مگن رہتی۔

ہم لاریب کے پاس فیکٹری سائیڈ پر صرف لنچ کرنے جاتے تھے' سائنسدان سے ہماری سلام دُعا تک نہ تھی البتہ ادویات کی پیکنگ پر مامور خواتین کے ساتھ ہماری گاڑھی چھنتی۔ ہم خواتین مل کر باتیں کرتیں اور مرد حضرات کن سوئیاں لینے کے لیے ہمارے آس پاس ہی منڈلاتے رہتے۔

لاریب کی ہمارے سیکشن میں زیادہ آمد و رفت کا نوٹس سب نے لیا۔ سائنسدانوں کی طرف سے لاریب کو ایک تازہ حکم نامہ جاری ہوا کہ آپ کمپیوٹر سیکشن کے کم چکر لگایا کریں' اگر آپ نے کچھ سیکھنا ہے تو ہماری

طرف توجہ دیں۔ لاریب نے حسب معمول ترکی بہ ترکی جواب داغا کہ آپ کچھ سکھائیں گے تو سیکھوں گی' نا؟--- اَب ہوتا یہ کہ لاریب علی الاعلان کہہ کر آتی کہ بلو صاحب مَیں ذرا کمپیوٹر سیکشن جا رہی ہوں اور سائنسدانوں کے خلاف دِل کا غبار تیزی سے لاریب کے سر میں ڈالنا شروع کر دیا لیکن لاریب اتنی بے وقوف نہ تھی کہ جواباً بلو کو شریک راز کرتی۔ اُس نے اپنے دِل کا غبار دِل میں ہی محفوظ رہنے دیا لیکن جھکاؤ بلو کا اپنی طرف ہی رکھا۔

لاریب کو کسی (یقیناً منان) نے اِس کا ایک حل (حل تھا یا جل) بتایا تھا۔ لاریب نے بلو کے آگے اکھیوں میں موٹے موٹے آنسو بھر کے کہا کہ مَیں نے گھر پہ ایک کمپیوٹر خریدا ہے پر اُسے چلانا نہیں آتا۔ جب کا آیا ہے' بے چارہ بند ہی پڑا ہے۔ کیا مَیں کمپیوٹر سیکشن میں جا کر کمپیوٹر سیکھ لیا کروں؟--- بلو نے ہم سے اور منان صاحب سے الگ الگ بات کی کہ لاریب کو تھوڑی دیر کمپیوٹر پہ بیٹھنے دیا کریں۔ ہمارا کام سکھانا تھا اور منان نے اجازت دینا تھی۔ ہم نے منان صاحب سے پوچھا کہ کیا کریں تو اُنہوں نے کہا کہ ساری ذمہ داری آپ پر ہے' مجھے نہ تو اعتراض ہے اور نہ ہی مَیں منع کر سکتا ہوں۔ یعنی پھنسے ہم تھے' اِسی لیے ہم نے دُشمن سے مدد مانگ لی۔ ہم نے بلو سے پوچھا کہ کیا یہ ہو سکے گا' ڈیوٹی ٹائم میں وہ ہمارے کمپیوٹر سیکشن میں آ سکے گی؟--- بلو نے کہا کہ مَیں موقع دیکھ کر ہی لاریب کو بھیجا کروں گا۔ ہم نے دِل میں سوچا کہ وہ اَب بھی موقع دیکھ کر ہی آتی ہے--- نئے کمپیوٹر کا سن کر ہمارے سٹاف نے مٹھائی کے لیے منہ کھول دیا' لاریب نے وعدوں پہ بہلایا اور سب کو خالی ہی منہ بند کرنا پڑے۔ لاریب کمپیوٹر سیکھنے کے لیے آنے لگی لیکن ہمارا صرف نام تھا' کام تو منان صاحب کا تھا۔ پانچ منٹ ہمارے پاس بیٹھ کر وہ منان صاحب کے پاس یوں چلی جاتی۔ جیسے اُنہوں نے ڈور کھینچی ہو (ویسے اِس کی جسامت کے حساب سے رسّی کہہ سکتے ہیں) بہت دیر بعد جا کے ہمیں پتہ چل ہی گیا کہ ہم قربانی کا بکرا--- سوری' بکری ہیں۔ اَب ہمیں چھریاں بھی نظر آنا شروع ہو گئی تھیں۔ مشرف صاحب' منان صاحب کی خوشامد میں بڑا ٹہل ٹہل کر لاریب کی حوصلہ افزائی کرتے کہ ضرور آپ کمپیوٹر سیکھیں اور کیوں نہ آپ شعبہ تبدیل کر کے اِس سیکشن میں آ جائیں؟--- منان صاحب کی تعریف تو لاریب کے دِل سے نکلتی تھی اور دوسروں کی مجبوراً کرنا پڑتی۔

ایک دِن اُس نے منان صاحب سے کہہ دیا کہ آپ پہ پینٹ شرٹ بہت سوٹ کرتی ہے' آپ پینٹ شرٹ ہی پہنا کریں۔ دوسرے روز سے ہی منان صاحب پینٹ شرٹ میں پائے جانے لگے حتیٰ کہ جمعہ والے روز بھی پینٹ شرٹ سے جدا نہ ہوتے۔ جمعہ کے دِن تمام میل اسٹاف جمعہ کی نماز پڑھنے مسجد جاتا تھا' ہم لیڈی ورکرز ہی پوری بلڈنگ میں رہ جاتیں۔ جمعہ کے روز کا ہم پیر سے ہی اِنتظار شروع کر دیتے تھے کہ اِس روز بریک دو گھنٹوں کی ہوتی تھی۔ منان صاحب چونکہ جمعہ پڑھنے نہ جاتے تھے' اِس لیے لاریب کو دو دفعہ میک اَپ کرنا پڑتا۔ کمپیوٹر سیکشن کا سٹاف اَب منان صاحب کے جمعہ کی نماز پر خاصا اصرار کرنے لگا تھا۔ منان صاحب اِن کے ساتھ ایک دو دفعہ گئے بھی' پھر سب کو مسجد چھوڑ کر خود دروازے سے

رُخسارِ دوست

ایک پڑیا لے کے رکھ لی دیکھ کر اصرارِ دوست
سہہ نہیں سکتے کسی صورت بھی ہم تکرارِ دوست
مجھ کو بائیک سے گرا کر وہ رفوچکر ہوا
مَیں سڑک پر دیکھتا ہی رہ گیا رفتارِ دوست
اُس نے اِک غوطہ لگایا اور پھر اُبھرا نہیں
چھوڑ دوں ساحل پہ یا گھر لے چلوں شلوارِ دوست
مہ وشوں کو چیز کہتے ہیں مرے اِک مہرباں
اِس رعایت سے ہوئی ریشم گلی بازارِ دوست
اُس کے ابا' تایا' چاچا' خالو' ماموں ساتھ ہیں
ایسا حلقہ ہے کہ ممکن ہی نہیں دیدارِ دوست
منہ چڑانے لگتے ہیں سب لوگ مجھ کو دیکھ کر
رنگ پر ہے میرے دَم سے اِن دِنوں بازارِ دوست
آنے جانے کے لیے دَر کا تکلف ہے غلط
آیئے' بل ڈوز کر دیں مل کے ہم دیوارِ دوست
مَیں تو کوئے یار سے چپکے سے واپس آ گیا
جب سنا مَیں نے کہ اپنے چل بسے بیمارِ دوست
آج تو پٹ وٹ کے جوتے چھوڑ کے بھاگا ہوں مَیں
آج مجھ کو پونے چھے سو میں پڑا دیدارِ دوست
سائے میں خوش باش بیٹھا ہے عدو درباں کے ساتھ
یاخدا! ایسے میں اِن پر آ پڑے دیوارِ دوست
کیوں جلائیں بلب عاصی کیوں کریں بجلی کا صرف
روشنی جب دے رہا ہے بزم کو رُخسارِ دوست
✿ مرزا عاصی اختر' میرپور خاص

ہی واپس آ گئے۔

لاریب اِن دِنوں بہت خوش تھی' خوش تو منان صاحب بھی تھے اور اِن کی خوشی دِن بہ دِن بڑھتی جا رہی تھی اور جب وہ فیکٹری کی سائیڈ سے آتے تو زیادہ خوش ہوتے' اِس طرف باتھ رومز تھے اور لاریب بھی تو تھی۔ تمام کولیگز تاڑ گئے تھے۔ پوچھتے کہ منان صاحب! آپ فیکٹری کی طرف سے جب بھی آتے ہیں تو بہت خوش ہوتے ہیں؟ منان صاحب کا جواب سمپل ہوتا کہ باتھ روم سے اِنسان خوش ہی لوٹتا ہے۔ پہلے منان صاحب دِن میں ایک یا پھر دو مرتبہ باتھ روم جاتے تھے وہ بھی کھانے کے لیے ہاتھ دھونے کی خاطر' اَب چار پانچ مرتبہ جانے لگے اور مصر بھی تھے کہ اِن کا پیٹ خراب نہیں ہے۔ مشرف صاحب نے کہا البتہ نیت خراب ہے۔

ایک روز منان صاحب فیکٹری کی جانب سے سخت غصے میں آئے (آئے تو اَب بھی باتھ روم کی سائڈ سے تھے) پوچھنے پر پتہ چلا کہ راشد نے کہا ہے' فیکٹری کے باتھ رومز میں کمپیوٹر سیکشن کے افراد کا داخلہ ممنوع قرار دیا جانا چاہیے--- کھڑے لاریب سے خوش کن باتیں کر رہے ہوں گے اور حقیقت بھی یہی تھی لیکن ہمارے استفسار پہ لاریب نہ مانی تھی۔ یہ دونوں سیکشنز کے درمیان رنجش کا ابتدائیہ تھا--- مقبولیت بڑھ جائے تو پرستاروں کی تعداد میں اضافہ ہو ہی جاتا ہے اور فون کالز اور ایس ایم ایس کی تعداد میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ لاریب کا فون سننا تو بلو کو پہلے ہی کھٹکتا تھا' اَب تو اُس کی حالت دیواروں سے ٹکریں مارنے والی ہو گئی تھی۔ جب لاریب کا موبائل بجتا' بلو کا کالا چہرہ کچھ اور سیاہ ہو جاتا۔ لنچ ٹائم پر بھی لاریب دفتر کے فون سے منان کے سیکشن فون کرتی' آواز اِتنی نیچی ہوتی کہ ہمیں دو تین فٹ دُور بیٹھے ہونے کے باوجود سنائی نہ دیتی۔ بلو کو شک ہوا تو بیس ہزار روپیہ خرچ کر کے نئی ٹیلی فون ایکسچینج خرید لایا' اِس میں سی ایل آئی بھی تھی۔ لاریب کچھ محتاط ہو گئی' اَب اپنے موبائل سے ہی فون کرتی۔ ہم نے بھی احساسِ کمتری سے پیچھا چھڑانے کے لیے ایک موبائل خرید لیا تھا لیکن وہ بجتا کم ہی تھا۔ لاریب ہمارے پاس آ کر بیٹھتی تو بڑی شان سے ٹھپ کر کے موبائل ہماری میز پر رکھتی تھی۔ لاریب کے موبائل کے ساتھ شرمندہ شرمندہ سا' خاموش خاموش سا ہمارا موبائل پڑا ہوتا۔ لاریب اکثر چھیڑتی کہ تمہارا تو سو والا موبائل کارڈ دو تین مہینے چل جاتا ہوگا اور ہم شرمندہ ہوتے کہ واقعی ایسی ہی بات تھی۔

کمپیوٹر سیکشن اور فیکٹری کے حالات کشیدہ سے کشیدہ تر ہوتے جا رہے تھے۔ دونوں فریقین نے ایک دوسرے سے بات کرنا ترک کر رکھا تھا۔ بلو نے ایک دِن ہمیں بٹھا کر لاریب کی خوب بُرائیاں کیں اور کہا کہ اُسے سمجھاؤ' سنبھل جائے اور کمپیوٹر سیکشن سے ناتا توڑ لے۔ ہم سر ہلا ہلا کر آ گئے۔ لاریب کوئی بچی نہ تھی' ہم سے زیادہ سمجھدار تھی۔ ہم نے بلو کا پیغام من وعن لاریب کو دے ڈالا۔ فائدہ تو کوئی نہ تھا' بین بجانا تو فرض تھا۔

ہم تو تھے ہی اَزل سے بزدل' اُوپر سے شریف اِس لیے لاریب کی بجائے ہم نے فیکٹری کی جانب جانا کم کر دیا البتہ لاریب کی وہی روٹین تھی۔ اَب جمعہ والے روز ہمارے اُٹھنے سے پہلے ہی لاریب ہمارے سیکشن میں آ جاتی۔ منان صاحب بال بچوں والے تھے۔ ہم نے لاریب کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن لاریب نے ہمیں جھٹلایا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے جیسا کہ تم سوچ رہی ہو۔ ہم نے کہا کہ ہم نے تو اَب سوچا ہے جب سب نے کہنا شروع کر دیا ہے۔ اَب تم سوچو اور اپنے بڑھتے قدم سٹاپ کر لو--- مشرف صاحب سے مدد مانگی' نہ ملی۔ کہنے لگے کہ لاریب آپ سے ملنے آتی ہے' آپ اُسے روکیں۔ ہم سے تو وہ ملنے نہیں آتی--- ہم پلکیں جھپکا کر رہ گئے اور سوچا کہ ہر مشورہ تو آپ سے کرتی ہے۔

بلو کے اچھے رویے سے کوئی سویپر بھی نہیں ٹک رہا تھا' باقی ورکرز تو بدلتے رہتے تھے۔ ایک نیا سویپر آیا' بڑا نروس تھا۔ بلو نے اُسے ہدایات دی تھیں کہ باتھ رومز کی ہر چیز کو تیزاب سے دھونا۔ اُس نے لوٹوں میں بھی تیزاب ڈال دیا۔ مشرف صاحب سونگھنے کی تیز حس کی وجہ سے بچ گئے اور سویپر سے پوچھا کہ لوٹے میں کیا ہے؟ جواب ملا' تیزاب--- ہمارے سیکشن کو تو اطلاع ہو گئی تھی۔ اَب پتہ نہیں' فیکٹری والوں کا کیا حال تھا لیکن راشد نے اِس دِن کے بعد چار چھٹیاں کی تھیں اور چلا بھی جلدی گیا تھا۔

بلو اور لاریب کی آپس میں اَب جب بھی باتیں ہوتیں' بڑی گرم گرم ہوتیں اور ساری فیکٹری کے اسٹاف کو آنچ پہنچتی۔ بلو' لاریب سے کھری کھری سن کے بھی اِس کے لیے دِل میں نرم گوشہ رکھتا تھا۔ منان کے ہاں اِن دِنوں آبادی بڑھانے کا کام آخری مراحل میں تھا۔ ہسپتال میں منان کی بیگم کو خون کی ضرورت تھی۔ اُنہوں نے ہسپتال سے فون کیا کہ دو بوتل خون کی ضرورت ہے' دفتر یا فیکٹری میں سے کسی کا بھی خون O+ve ہو تو وہ ہسپتال پہنچ ائے۔ اِس وقت لاریب ہمارے ہی سیکشن میں موجود تھی' پیغام سن کر لاریب بے قرار ہو گئی اور کہنے لگی کہ مَیں بھی خون دینا چاہتی ہوں--- بڑی ٹائمنگ سیٹ ہے' ہم نے سوچا--- سلطان ڈرائیونگ کے علاوہ خون بھی او پازیٹو رکھتا تھا۔ ایک اور ڈونر

فیکٹری سے مل گیا۔ خصوصی ڈونر یعنی لاریب کو اپنا گروپ معلوم نہ تھا۔ لاریب' بلو سے اجازت لے کر آ گئی۔ بلو کو اِس روز شہر سے باہر جانا تھا اِس لیے اُس نے جلدی سے لاریب کی طویل منت سماجت سے بچنے کے لیے اجازت دے دی۔ بلو اِتنا ہوشیار نہ تھا جتنا وہ بنتا تھا یا پھر وہ لاریب کو موقع دے رہا تھا۔ خیر' سلطان دونوں ڈونرز کو لے کر ہسپتال چلا گیا--- سائنسدان تشویش سے پھر رہے تھے ہم فیکٹری کی سائڈ پر گئے تو سائنسدانوں میں غیر معمولی اضطراب پایا۔ سلطان دوپہر کو صورتِ حال سے آگاہ کرنے آیا کہ سب خیریت ہے' لاریب ہسپتال میں تھی اور اُس کا خون نہیں میچ کیا تھا۔ لاریب اور سلطان کی شام کو واپسی ہوئی۔ تاخیر کی وجہ لاریب سے کسی نے نہ پوچھی۔ ہم نے بھی اِتفاقاً نہ پوچھا تو خود ہی بتانے لگی کہ راستے میں گاڑی کا ٹائر پنکچر ہو گیا تھا۔ سلطان نے کہا تھا کہ سب کو یہ بات مت بتانا' سب شک کریں گے۔ سب کو یہی کہنا کہ ہسپتال میں دیر لگ گئی تھی--- بلو اِس شام لاریب کے گھر جانے کے بعد فیکٹری لوٹا تھا۔

دوسرے روز سائنسدانوں نے بلو کو اِس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ بلو ویسے تو عام حالات میں لاریب کے خلاف ایک لفظ نہ سنتا لیکن آج کل تو وہ خود ہی لاریب کی نگاہ التفات سے دور تھا۔ سائنسدانوں کی باتوں نے جلتی پر تیل گرا دیا۔ سائنسدانوں نے کہا کہ لاریب اور منان یا سلطان باہر اچھا وقت گزار رہے ہیں اور ہم فیکٹری میں کام کر کر کے مرے جا رہے ہیں۔ بلو نے لاریب کو بڑا اِنقلابی مشورہ دیا کہ کمپیوٹر سیکشن سے ناتا توڑ لو اور یہ آخری وارننگ ہے۔ لاریب نے اُس کے پُرخلوص مشورے اور ساتھ ہی سائنسدانوں کے تجربے کے مراحل سے گزرتے فارمولے (پتہ نہیں کون کون سی جڑی بوٹیوں کو مرتبان میں دس سالوں سے اِن کے گلنے سڑنے کا اِنتظار فرمایا جا رہا تھا) دونوں کو ٹھوکر رسید کی اور بولی کہ میں جانتی ہوں' آپ کے منہ میں کن لوگوں (سائنسدانوں) کی زبان ہے--- ہم نے سوچا کہ کتنی ذہین ہے' فوراً سمجھ گئی ہے کہ کس کے منہ میں کس کی زبان لگی ہوئی ہے البتہ بلو نے کہا کہ غور سے دیکھو' میں بول رہا ہوں۔ بلو دبئی پلٹ' لاریب نے یقین نہیں کیا اور بولی کہ میں ابھی کمپیوٹر سیکشن جا رہی ہوں۔ جو کر سکتے ہو' کر لو۔ بلو نے کہا کہ دیکھ لو' بعد میں نقصان کی ذمے دار تم ہو گی۔ لاریب نے کہا کہ دیکھتی ہے میری جوتی اور پھر اِسی مذکورہ بالا نایاب فارمولے کو دوسری ٹھوکر رسید کی۔ بلو نے سر پکڑ لیا' اِتنا نقصان--- امکان تھا کہ وہ دیواروں سے ٹکریں مارنا شروع کر دے لیکن اِسی وقت اُس کی بیوی کا فون آ گیا اور وہ بھی اپنی زن مریدی والی جون میں واپس چلا گیا۔

دوسرے روز لاریب کو موجود نہ پا کر ہمیں تشویش ہوئی تو مشرف صاحب نے جیو کا رول ادا کیا اور بتایا کہ مالک نے بڑی زیادتی کی ہے' بغیر وجہ بتائے کوئی کسی کو سروس سے جواب نہیں دے سکتا لیکن اُنہوں نے ایسا ہی کیا ہے۔ فیکٹری کے کسی سائنسدان نے مالک کو فون کیا تھا کہ

لکی ورڈز

☆ لڑکیوں سے فون پر دس دس گھنٹے باتیں کرنے والوں کے پاس نماز کے لئے ٹائم نہیں ہوتا---3N

✪ آپ کس مسجد سے بول رہی ہیں' محترمہ؟

☆ سیما جان--- آج کل کے لڑکوں کی بگڑی شکل---3N

✪ نہیں جی' بے تحاشہ فیشن نے اُنہیں یہاں تک پہنچایا ہے۔

☆ یہ دُنیا ایک امتحان ہے اور عورت اِس کا مشکل ترپرچہ--- عاشر نثار احمد

✪ اور اِس امتحان میں شادی شدہ افراد کی ہمیشہ کمپارٹ ہی آئی ہے۔

☆ فرضی ناموں سے لڑکیاں بن کر لکھنے والے مرد کہلانے کے مستحق ہیں کیا؟---3N

✪ لڑکیوں کے نام سے لکھ کر مرد لڑکیوں کا پلڑا بھاری کرنے کی کوشش کرتے ہیں آپ کو تو خوش ہونا چاہئے۔

☆ وہ کل تک بہت خوش تھا۔ افسوس! آج اُس کی شادی ہو گئی--- سید بدر سعید

✪ اور کل جنازہ بھی اُٹھے گا کیونکہ موت کا سامان وہ گھر لے آیا ہے۔

☆ اُس کے موٹر سائیکل کے پلگ میں اکثر گرلز کالج کے سامنے ہی کچرا کیوں آتا ہے---3N

✪ کیونکہ گرلز کالج کے ساتھ ہی ورکشاپ ہے۔

☆ پہلے اُستاد کان پکڑواتے تھے' اب بیگم--- محمد عباس

✪ تو ''ہوم ورک'' صحیح طریقے سے کیا کرو نا!

☆ مردوں کے کرتوت دیکھ کر آج کی عورت میں شعور بڑھ رہا ہے---3N

✪ شکر ہے آپ نے مان تو لیا کہ عورتوں میں شعور مردوں کی بدولت بڑھ رہا ہے۔

☆ ڈارون نے غالباً کسی آج کے لڑکے کی حرکتوں کو دیکھ کر کہا تھا کہ اِنسان پہلے بندر تھا---3N

✪ نہیں' اِس نے جنس کی وضاحت نہیں کی تھی' ہو سکتا ہے کسی عورت کو ناچتے دیکھ لیا ہو۔

☆ آئندہ الیکشن میں ہم اُس کو ووٹ دیں گے جو اِن لفنگے لڑکوں کے خلاف ایکشن لے---3N

✪ غالباً ''ایکشن'' سے آپ کی مراد سکالرشپ ہے۔ ہے نا؟

☆ لڑکی لڑکی اور صرف لڑکی' آج کے ہر نوجوان کا خواب---3N

✪ غلط بالکل غلط' آج کل ہر نوجوان کا یہی خواب ہے کہ اُس کے گھر لڑکی نہیں بلکہ لڑکا پیدا ہو۔

☆ پہلے ماں باپ کی خدمت' پھر شوہر کی' پھر اولاد کی--- آہ بے چاری کی ساری عمر تابعداری میں گزر جاتی ہے---3N

✪ واقعی عمر ڈھل جائے تو اِس قسم کے خیالات تو آتے ہی ہیں۔

☆ سوتیلا باپ--- مرد کا ایک ظالم روپ---3N

✪ باپ کی بجائے اگر سوتیلی ماں کے بارے میں سوچا ہوتا تو ایک خوفناک چڑیل نظر آتی۔

عرفان شہزاد کلی

موبائل فون پر گھنٹہ پیکیج آنے کے بعد لڑکیوں کی شرح تعلیم حیران کن طور پر کم ہوگئی ہے---(وزارتِ تعلیم) ☺ ڈاکٹر بی کے بلوچ

لاریب اور منان صاحب کچھ اور ہی ہواؤں میں ہیں' اِن کی ہوا تبدیل کردو۔ ہوائیں ہمارے خیال میں وہی تھیں اور اِن میں موبائل سگنل بھی آتے تھے اِس لیے مجبوراً سائنسدانوں کو اپنے تعلقات استعال کر کے لاریب کی سم بند کروانا پڑی تھی۔ دوسرا وار یہ ہوا کہ لاریب کے گھر میں فون کر کے اطلاع دی گئی کہ لاریب اور منان دونوں ٹھیک نہیں ہیں ایک دوسرے کے ساتھ اِس لیے آپ بھی اِن کے ساتھ غلط ہو جائیں۔ گھر والے کیسے غلط ہوئے' اِس کی تفصیل تو ہمیں معلوم لاریب کی زبانی ہی ہو سکتی تھی--- جہاں مشرف صاحب نے ہمیں اِتنی مفید معلومات بہم پہنچائی تھیں' وہاں اُنہوں نے ایک اور مفید مشورہ بھی دیا کہ آپ لاریب کے گھر یہاں دفتر سے فون مت کریں اور موبائل تو اِس کا بند ہے۔ ہم دفتر سے گھر آئے تو لاریب کا فون آیا ہوا تھا اور وہ پھوپھو کی ہمدردیاں سمیٹ رہی تھی۔ میں لاریب نے تمام بات بتائی جو ڈائیلاگ بول کر مالک نے اِسے نوکری سے برخاست کیا تھا۔ باقی سب تو شاک میں تھے' بس بڑا بھائی زیادہ پھدک رہا تھا۔ بلو اور سائنسدانوں کو جھولیاں بھر بھر کے بددُعائیں دے رہی تھی کہ اُن کا ککھ نہ رہے۔ اُنہیں کیڑے پڑیں' اُن کا بیڑہ غرق ہو وغیرہ وغیرہ--- دفتر میں بھی اُس کا فون آتا تو آواز اِتنی دھیمی ہوتی کہ ہم ہی نہ سن پاتے۔ یہ مکار آدمی کی نشانی تھی لیکن ہماری آنکھوں پہ ہمدردی کی پٹی چڑھی ہوئی تھی۔ ہمارے نزدیک اِس وقت روئے زمین پر لاریب سے زیادہ ہمدردی کا مستحق کوئی نہ تھا۔ ہم بہت جذباتی جو ہیں' اللہ ہم پہ رحم کرے--- لاریب نے کہا کہ اُن لوگوں نے میرے ساتھ ٹھیک نہیں کیا ہے۔ ہم نے سوچا کہ تم نے خود اپنے ساتھ کون سا ٹھیک کیا ہے۔ کیا ملا تم کو رُسوائیاں؟--- بعد کے حالات اور خود سائنسدانوں کی زبانی بھی ہم نے سن لیا کہ اُس کو تو بس ڈیکوریشن کے لیے رکھا ہوا تھا کہ باہر سے کوئی اِنسپکشن کرنے آتا ہے تو لیڈی ڈاکٹر کے ہونے سے اچھا امپریشن پڑتا ہے۔ اُس کو کام سکھانا یا اُس کو پریکٹس کا سرٹیفکیٹ دینے کا اُن لوگوں کا کوئی اِرادہ نہ تھا۔ لاریب کے جانے کے چند دِن بعد ہی ایک اور خوبصورت سی لڑکی وہاں پریکٹس کے لیے آگئی تھی۔ بلو اور سائنسدان پھر اپنے مشن پر تھے۔ منان صاحب بحال ہیں اور لاریب بے حال--- لاریب کے دفتر میں فون آنا شروع ہو گئے تھے اور اِس کی خبر بھی مالک کو مل جاتی تھی۔ پھر پتہ نہیں' مالک نے منان سے کیا کہا کہ وہ ہر وقت اپنی پندرہ سالہ سروس کا رونا روتا ہوا پایا جانے لگا۔ ہمیں حالات کی سنگینی کا اِتنا علم نہ تھا اور ہم لاریب کی واپسی کے اِنتظار میں تھے کہ اگر اُس پر الزامات غلط ثابت ہو جائیں تو اُس کو بلو باعزت طریقے سے بلا لے لیکن الزامات ٹھیک ہی تھے سو فیصد سے بھی ایک فیصد بڑھ کے--- لاریب کی سم کچھ ماہ بعد خود بخود ہی کھل گئی اور منان صاحب کے میسجز اور فون کالز اُسے بالکل روانی سے پہنچنے لگ گئے۔ ہم کبھی کبھار فون کر کے لاریب سے حال چال دریافت کر لیتے۔ پھر پتہ چلا کہ منان صاحب کے میسجز کبھی کبھار آتے ہیں اور اَب سلطان کے میسجز بہت آنا شروع ہو گئے تھے۔ ایک اور سم بھی لاریب نے خرید لی تھی شاید سلطان کے لیے---!

☆☆

شغل + مغل

✿ محبوبہ سے بیوی بننے کا سفر بہت ہی حسین ہے مگر آگے منزل بہت خطرناک ہے--- توصی

☆ اِن کے لیے آسان ہے' خطرناک تو شوہر حضرات کے لیے ہے۔

✿ مرد کو عظیم بنانے والی ہستی اِس کی بیوی ہی ہوتی ہے--- نازیہ ناز نازی

☆ نام کی حد تک تو ہمیں تسلیم ہی ہے۔

✿ "مَیں تمہارے بغیر مر جاؤں گا"--- ہر لڑکے کا پسندیدہ جملہ--- غزل رانی

☆ اور بعد از شادی ساتھ رہ کر مر جاتا ہے۔

✿ جتنی محبت شوہر محبوبہ سے کرتا ہے' اگر اِتنی ہی محبت بیوی پر نچھاور کرے تو ہر گھر جنت نہ بن جائے--- نازیہ ناز نازی

☆ پس ثابت ہوا کہ کسی بھی گھر کو دوزخ بنانے میں عورت کا ہی ہاتھ ہوتا ہے۔

✿ کاکیو! اگر اِن لڑکوں کی کمینگی سے بچنا چاہتی ہو تو "بھائی جان" تکیہ کلام کے طور پر بنالو--- نازیہ ناز نازی

☆ پھر شادی کے بعد تو کافی پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا کیونکہ شادی بھی تو کسی لڑکے سے ہی ہوگی؟

✿ اگر کاکوں نے اِسی طرح بال بڑھانا شروع کر دیے تو اُسترا آثارِ قدیمہ کے پاس چلا جائے گا--- نازیہ ناز نازی

☆ جی نہیں' لڑکیوں نے بھی تو اِسی اُسترے سے اپنی ٹنڈیں بنانا شروع کر رکھی ہیں۔

✿ لڑکیوں کا پیچھا کیے بغیر شاید اِن چھچھوروں کا کھانا ہضم نہیں ہوتا--- نازیہ ناز نازی

☆ آپ روزانہ کتنے چھچھوروں کا کھانا ہضم کرواتی ہیں؟

✿ آج کل کی لڑکی شکل دیکھ کر ہی بتا دیتی ہے کہ اُس کی جیب میں کتنے پیسے ہیں--- محمد عباس

☆ جب لڑکیوں کو پتہ چلتا ہوگا کہ آپ کی جیب میں اِک پائی نہیں تو آپ کو کافی شرمندگی ہوتی ہوگی؟

✿ فیشنی کاکوں کو دیکھ کر مجھے تو سرکس کا جوکر یاد آجاتا ہے--- نازیہ ناز نازی

☆ لیکن آپ کے سامنے فیشنی کاکے نہیں بلکہ آئینہ رکھا ہوا ہے۔

✿ فی زمانہ شاعروں کو لڑکوں کے لمبے بالوں پر اشعار لکھنے چاہیے--- نازیہ ناز نازی

☆ اور لڑکیوں کی ٹنڈوں پر بھی---!

✿ عاشق اور رقیب کو دیکھئے' مرد ہی مرد کا دُشمن ہے--- نازیہ ناز نازی

☆ اور وجہِ دُشمنی بھی دیکھیے--- لڑکی اور صرف لڑکی---!

✿ تاریخ گواہ ہے کہ محبت میں گھاٹا عورت نے' نفع مرد نے پایا ہے--- نازیہ ناز نازی

☆ واقعی رانجھے کی شوگر مل تھی' مجنوں کی بسیں چلتی تھیں اور فرہاد اِمپورٹ ایکسپورٹ کا کام کرتا تھا۔

محمد صابر مغل عبدو پوری

قلم قبیلہ

☆ خادم حسین مجاہد

جب معاشرے کی زمین زیادہ ناہموار ہو جائے اور اس ظلم و ناانصافی، استحصال اور فرعونیت کے بیج پھلنے پھولنے لگیں تو جہاں ایک طرف چور ڈاکو شرافت کے لباس میں پولیس کی زیرِ نگرانی کارہائے نمایاں سرانجام دینے لگتے ہیں، وہیں ایک مدافعتی طبقہ خنجر سے بھی زیادہ تیز قلم لے کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے جس کا کاٹا پانی نہیں مانگتا۔ اس طبقے کو رائٹر طبقہ کہتے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ ایک طبقہ ہے مگر اس کی بہت سی اصناف ہیں۔ شاعر، ادیب (نثر نگار) ہر صنف میں بھانت بھانت کے نمونے پائے جاتے ہیں جن کے ساتھ ہم باری باری ہاتھا پائی کریں گے لیکن گھر کا بھیدی، لنکا ڈھانے سے قبل تمام رائٹرز سے بصد ادب اجازت کا خواستگار ہے۔

شاعر

تعارف: کسی دلی یا دماغی چوٹ کے باعث منہ اور قلم کے راستے موزوں کلام اگلنے والی ''توپ'' کو شاعر کہتے ہیں۔ تاریخ کے ہر دور میں اس کا وجود ثابت ہے اور یہ وہ واحد پیداوار ہے جس کا کبھی قحط نہیں پڑا، ہمیشہ افراط ہی رہی ہے۔ سقوط غرناطہ، مغلوں کے آخری دور اور عربوں کے زمانہ جاہلیت اور سکھوں کے آخری دنوں پر نظر دوڑائیں تو یہ بات ٹیوب لائٹ کی طرح روشن ہو جاتی ہے کہ جب بھی کوئی قوم تباہی کے دہانے پر پہنچی اس میں شاعر حد سے زیادہ بڑھ گئے جنہوں نے کارپردازان سلطنت کو شاعری میں لگا کر کاروبار سلطنت سے غافل کر دیا اور دشمنوں کا کام آسان کر دیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انگریزوں نے جنگ آزادی کے بعد دوسرے درباریوں کو تو پھانسی دی مگر مرزا غالب اور دوسرے شاعروں کو انعامات سے نوازا۔

اسباب: کوئی انسان اچانک شاعر کیسے بن جاتا ہے، اس بارے میں محققین میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ بہر حال، اس بات پر ان کا اتفاق ہے کہ دماغ چلنے کی طرح اس کے بھی کئی مختلف اسباب و عوامل ہو سکتے ہیں۔۔۔ یہ بھی طے ہے کہ ہر انسان زندگی میں ایک بار ضرور شاعر بنتا ہے جب وہ دل کا تبادلہ کرتا ہے، بعد میں بے شک بندہ بن جائے۔

پہچان: یوں تو اہل نظر شاعر کو دور سے اور باادب گفتگو سے پہچان لیتے ہیں، پھر بھی آسانی کے لئے موٹی موٹی نشانیاں بتائے دیتا ہوں۔ شاعر بننے کے بعد یہ اپنے نام میں کسی عجیب و غریب لفظ کا اضافہ کر لیتا ہے جسے کہ تخلص کا نام دیتا ہے۔ بعض دور اندیش شاعر بننے سے قبل ہی کوئی تخلص الاٹ کرا لیتے ہیں مبادا کوئی دوسرا قبضہ نہ کر لے۔ یہ تخلص عموماً ایسا ہوتا ہے کہ پہلی بار سننے والا چونک اٹھتا ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ وہ بھولا بھالا لڑکا جسے آپ عبدالرشید کے نام سے جانتے ہیں اور وقتاً فوقتاً اسے شیدا کہہ کر سگریٹ بھی منگواتے رہتے ہیں، اچانک پتہ چلتا ہے کہ وہ عبدالرشید اب بھولا بھالا شیدا نہیں رہا بلکہ عبدالرشید آزردہ ہو گیا ہے۔ آپ لاکھ اس کی آزردگی کا سبب جاننے کی کوشش کریں مگر وہ وضاحت نہیں کرتا۔

کسی کے شاعر ہونے کی دوسری بڑی نشانی یہ ہے کہ یہ جو کہے گا، وہ کرے گا نہیں اور جو کرے گا، وہ کہے گا۔ یہ عملی زندگی میں انتہائی بے عمل ہونے کے باوجود شاعری میں انتہائی باعمل ہوتا ہے۔ اس کے ارادے خواہشات اور مقاصد عموماً ممکنات کی سرحد سے پار واقع ہوتے ہیں مگر جب قلم قرطاس اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے تو وہ اس کو صحیح معنوں میں خنجر کی طرح استعمال کرتا ہے اور وہ کارنامے سرانجام دیتا ہے کہ بڑے بڑے سورما چیں بول جاتے ہیں۔ یہ چاہے تو آہ سے آندھی چلوا دے، جنگل جلا کر راکھ کر دے، پوری دنیا آنسوؤں کے سیلاب میں غرق کر دے اور اس میں تیراکی کرتا اور محبوب تک پہنچ جائے۔ چاہے تو محبوب کا جلوہ دکھائے اور صور پھونک دے، محبوب کی جھلک دکھائے اور مرتے ہوؤں کو قبر سے کھینچ لائے۔ موڈ میں آجائے تو سمرقند و بخارا بادشاہ سے پوچھے بغیر محبوب کے ایک تل کے بدلے ہدیہ کر دے اور بعد میں سزائیں بھگتا پھرے۔ چاہے تو محبوب کی کمریوں غائب کر دے جیسے ممبران اسمبلی سے شائستگی، دل چاہے تو محبوب کے ماتھے پر صرف

ستارے ہی نہیں، پورا نظام شمسی سجا دے اور چاہے تو محبوب کو باغ میں پھرا کر پھولوں کو احساس کمتری میں مبتلا کر دے--- بڑے سے بڑا عالمی تنازعہ جب ایک شاعر کے سامنے آتا ہے تو وہ محض ایک شعر یا نظم میں حل ہو کر رہ جاتا ہے۔

حلیہ/ عادات: پرانے زمانے میں شاعروں کا حلیہ خاندان والوں سے کم اور نفسیاتی مریضوں سے زیادہ ملتا تھا۔ مہینوں غسل خانے، نائی اور آئینے کا منہ نہ دیکھتے تھے جس کی وجہ سے ان کی داڑھی، مونچھوں اور سر کے بالوں میں خط علیحدگی کھینچنا کارے دار ہوتا تھا۔ وہ عموماً صرف دانت خراب کرنے کے لئے پان کی خدمات حاصل کرتے تھے اور میسر ہو تو انگور کی بیٹی سے بھی چھیڑ چھاڑ کر لیا کرتے تھے۔

آج کل شاعر، شاعر کم اور بیوروکریٹ زیادہ لگتے ہیں۔ اکثر گورنمنٹ سروسز کے شوقین ہوتے ہیں کہ افسری کے ساتھ ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت مشق سخن جاری رہے۔ یہ دانت معدہ اور دل تباہ کرنے کے لئے سگریٹ، پائپ، کافی اور چائے کا استعمال تھوک کے حساب سے کرتے ہیں۔

معاشرتی مقام: معاشرے میں شاعر کو جو مقام حاصل ہے، اسے معزز تو کیا، عام بھی نہیں کہا سکتا۔ اکثریت شاعر کو چور ڈاکو سے بھی زیادہ مشکوک سمجھتی ہے کیونکہ ان کے خیال میں چور ڈاکو پھر بھی کنبہ پالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور تو اور افلاطون نے اپنی خیالی جمہوریہ میں بھی شاعروں کو فالتو مخلوق گردانتے ہوئے نمائندگی نہ دی۔

عمومی رویہ: شاعر ایک شریف جانور--- سوری، انسان ہے اور اس کا مشق سخن کرنے تک کا عمل نہایت پرامن ہے۔ نقص امن کا مسئلہ تو اس وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ یہ شاعری سنانے پر تل جائے۔ اس وقت اسے شاعری سنانے سے روکنا کسی طوفان کو روکنے کی حماقت کرنے کے برابر ہے۔ یہ صورتحال اس وقت مزید گھمبیر ہو جاتی ہے جب شاعر نیا نیا ہو اور آس پاس نہ کوئی مشاعرہ ہو اور نہ سامع۔ اس وقت اس کی حالت اس مرغی کی سی ہوتی ہے جس نے انڈہ دینا ہو اور اسے مناسب جگہ نہ مل رہی ہو۔ اس وقت کچھ تو پتھروں کو غم دل سنا لیتے ہیں۔ کچھ کا نروس بریک ڈاؤن ہو جاتا ہے۔

دماغ اور شاعری: شاعر دماغ رکھتے ہیں یا نہیں، یہ قصہ بحث طلب ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ دماغ کے بغیر کوئی شاعری کیسے کر سکتا ہے جبکہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ کوئی دماغ کے ہوتے ہوئے شاعری کیسے کرے گا؟

خوراک: شاعروں کی خوراک کے بارے میں بھی پہلوانوں کی طرح خاصی مبالغہ آمیز حکایات مشہور ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاعروں کی خوراک محض ''داد'' ہے۔ یعنی واہ واہ، سبحان اللہ--- اگر ایک شاعر سے آپ تین ٹائم اس کی شاعری سن کر ''واہ واہ'' کہتے رہیں تو وہ لمبا عرصہ کھائے پیئے بغیر زندہ رہ سکتا ہے لیکن اگر آپ اس کو دنیا جہاں کی ہر چیز کھلا دیں لیکن داد نہ دیں تو بھوکا رہے گا--- اگر آپ کسی شاعر سے انتقام لینا چاہتے ہیں تو اکثر و بیشتر اس کی شاعری سنتے رہیں لیکن داد نہ دیں، کسی نہ کسی دن اسے ضرور اختلاج قلب ہو جائے گا۔ ویسے، ہم نے چند ایسے شاعروں کو دیکھا ہے جنھوں نے ''واہ واہ، سبحان اللہ'' کی آوازوں سے کیسٹ ریکارڈ کی ہوئی ہیں جنھیں وہ تنہائی میں داد کی بھوک مٹانے کے لئے سنتے ہیں۔

اقسام: دنیا میں مخلوق لاتعداد اقسام میں پائی جاتی ہے۔ شاعر بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ مزاج، انداز اور طریقہ واردات میں اختلاف کے تحت ان کی کئی اقسام ہیں جن میں چند ایک کا خیال آپ کی عبرت کے لئے دیا جا رہا ہے۔

نرا شاعر: جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، یعنی سوائے شاعری کے اور کچھ نہیں کر سکتا۔ چونکہ اسے اکثر و بیشتر فاقے سے لطف اندوز ہونا پڑتا ہے اس لئے اس کی شاعری میں بلا کا سوز اور درد پایا جاتا ہے۔ یہ با آسانی کوئی بھی شاعرہ لوٹ لیتا ہے لیکن محلے کے دکاندار سے ادھار تک حاصل نہیں کر سکتا۔ بعض اوقات انہیں شاعری بیچنا بھی پڑتی ہے۔ ان کی ازدواجی زندگی مرثیوں سے بھرپور ہوئی ہے۔ غالب، ساغر صدیقی اور اقبال ساجد اس قسم کے نمائندہ شاعر ہیں۔

عاشق کم شاعر: یہ عموماً بے روزگار ہوتے ہیں اور پارٹ ٹائم عشق سے ٹائم پاس کرتے ہیں۔ عشق کی منازل طے کرتے کرتے جب یہ رانجھے یا مجنوں کے انجام کے قریب پہنچتے ہیں تو ترقی کر کے شاعر بن جاتے ہیں--- ان کی شاعری عموماً بے وزن ہونے کے باوجود کلو گراموں میں ہوتی ہے۔ یہ نوکری یا چھوکری کے پلے پڑنے کے بعد تائب ہو جاتے ہیں اور ادب کو بخش دیتے ہیں۔

سمگلر شاعر: عام سمگلروں کی طرح سمگلر شاعروں کے بھی کئی گروہ ہیں۔ ان کا ایک گروہ کسی انتقال شدہ گمنام شاعر کے اہل خانہ سے اس کی شاعری ردی کے بھاؤ خرید کر صاحب دیوان ہو جاتا ہے۔ دوسرا گروہ پرانے شعرا کے کلام کے الٹ پھیر سے کام چلاتا ہے۔ تیسرا گروہ کسی دوسری زبان کی شاعری سے خیالات اڑا کر اپنی زبان میں باندھ لیتا ہے۔ چوتھا اور آخری گروہ کسی لمبے جھنجٹ میں پڑے بغیر شارٹ کٹ استعمال کرتا ہے اور کسی بھی نرے شاعر سے شاعری خرید لیتا ہے۔ اچھی

سے اچھی تیار غزل پندرہ دس روپے میں مل جاتی ہے۔ اس چوتھے گروہ میں عموماً بیوروکریٹ اور سماجی شخصیات ہوتی ہیں جو اس طریقے سے خود کو سمارٹ ثابت کرتے ہیں۔

عظیم شاعر: اس گروہ کی عظمت میں ان کی دولت، عہدے اور پریس پروری کے علاوہ ان کے کاسہ میں خوشامدی مضامین کا بھی دخل ہوتا ہے۔ یہ اپنے تئیں غالب سے کم عظیم نہیں ہوتے اور اسی زعم کی بنا پر اساتذہ کے کلام پر خصوصی شفقت فرماتے ہیں۔ وہ انہی کا پڑھتے اور انہی کا کھاتے ہیں۔ علاوہ ازیں ایسے عظیم شعراء ان خواتین شاعرات کی سرپرستی بھی فرماتے ہیں جو شاعری بے شک نہ کر سکتی ہوں لیکن شاعرہ بننا چاہتی ہوں۔ یہ ایسی شاعرات کے مجموعے اپنے خرچ اور مواد پر چھپوا کر اپنی عظمت کا ثبوت دیتے ہیں۔

سیاسی شاعر: ان کے دو گروہ ہیں۔ پہلا گروہ ساحر، فیض، جالب اور شورش کاشمیری جیسے شاعروں پر مشتمل ہے۔ یہ کلمہ حق جابر سلطان کے سامنے کہہ کر قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے ہیں۔ دوسرا گروہ عوامی ہے جو سیاسی جلسوں خصوصاً انتخابی جلسوں میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا اور فولاد منواتا ہے۔ یہ کسی امیدوار یا پارٹی کے ساتھ منسلک ہو جاتے ہیں اور پھر اس کے جلسوں میں اس کے قصیدے اور مخالفین کی ہجو پڑھتے ہیں، یوں یہ عوامی شہرت کے ساتھ ساتھ شاعروں کے سب گروہوں سے زیادہ کماتے ہیں۔

موبائل شاعر: ان کے بھی دو گروہ ہیں۔ پہلے گروہ والے شہر میں گلی گلی گھومتے رہتے ہیں۔ کہیں کسی شادی، منگنی، مہندی، ختنہ یا سالگرہ کی تقریب کی بھنک ملتی ہے، وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ عموماً معززین کا لباس زیب تن کئے ہوتے ہیں اس لئے تقریبات میں با آسانی گھس جاتے ہیں۔ پھر وہیں مہمانوں سے باتوں باتوں میں تقریب کے مرکزی کرداروں کے نام معلوم کر کے پہلے سے تیار شدہ سہرے اور دعا وغیرہ میں فٹ کر لیتے ہیں۔ حاضرین کی بڑی تعداد تب تک انہیں معزز مہمان ہی سمجھ رہی ہوتی ہے کہ اچانک یہ بلائے ناگہانی کی طرح تقریب کے مرکزی کردار کے سر پر پہنچ کر اپنا راگ الاپنا شروع کر دیتے ہیں اور تمام شرکاء کا موڈ خراب کر دیتے ہیں۔ یہ تب تک چپ نہیں ہوتے جب تک پیسے یا کسی اور چیز سے ان کا منہ بند نہ کر دیا جائے۔ دوسرا گروہ چھوٹے چھوٹے پمفلٹ کی صورت شاعری چھاپ کر بسوں اور تعلیمی اداروں میں گا گا کر فروخت کرتے ہیں۔

پینٹر شاعر: اکثر پینٹر شاعرانہ ذوق کے حامل ہوتے ہیں جس کا ثبوت وہ گاڑیوں کی پینٹ اور ڈیکوریٹ کرتے وقت دیتے ہیں۔ آپ نے اکثر بسوں، ویگنوں کے اندر اور رکشوں کے پیچھے کبھی غالب اور اقبال کو بغل گیر ہوتے دیکھا ہوگا تو کبھی فیض اور جوش کو اور کبھی ایسے ذاتی اشعار بھی پڑھے ہوں گے جن میں ایک مصرعہ دوسرے مصرعے سے متعلق نہیں ہوتا۔ یہ سب کارنامے اور شاہکار پینٹرز کے ہوتے ہیں۔ اگر ان پینٹروں کے ہتھے ہوائی جہاز بھی چڑھ گیا تو یہ وہاں بھی اپنے فن کے جوہر دکھائیں گے اور شاعری کا نیا بین الاقوامی انداز دیں گے۔ پینٹر شاعروں کی اتنی خدمات کے برعکس آج تک کسی ادبی جائزے میں ان کا ذکر نہیں کیا گیا اور نہ ہی ایسی عوامی شاعری پر ان کو کوئی ایوارڈ دیا گیا ہے حالانکہ یہ لوگ تو اس قابل ہیں کہ ان پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کرنا چاہئے لیکن یہ صابر شاکر لوگ ان تمام حق تلفیوں کے باوجود شکوہ کناں ہوئے بغیر فرائض منصبی نہایت دیانت داری، محنت اور مہارت سے انجام دے رہے ہیں اور شاعری میں نت نئے تجربے کر رہے ہیں۔ ایک شنید یہ بھی ہے کہ آزاد شاعری کے اصل موجد بھی یہی لوگ ہیں۔

آزاد شاعر: یہ آزادی پسند ہوتے ہیں۔ شاعری میں بھی کسی قسم کی پابندی کے قائل نہیں ہوتے۔ نثری عبارتوں کو اوپر تلے مبہم انداز میں لکھ کر آزاد شاعری کا نام دیتے ہیں اور لہو لگا کر شہیدوں میں ملنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کو بھی ابھی تک باقاعدہ شاعر تسلیم نہیں کیا گیا۔ بعض غضبناک بزرگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ آزاد شاعری کرنے کا حق صرف اور صرف پابند شاعری کرنے والوں کو ہونا چاہئے لیکن ان کے غضب کے باوجود مارکیٹ آزاد شاعری کے مجموعوں سے بھری پڑی ہے اور کوئی طوفان نہیں ٹوٹا۔ جہاں تک سیل کی بات ہے تو یہ بھی پابند شاعری کی طرح ردی میں سیل ہو رہی ہے۔ یوں نتیجے کے لحاظ سے ان میں زیادہ فرق نہیں۔

فوائد: ''نہیں ہے نکمی چیز زمانے میں'' کے مصداق شاعروں کے بھی کچھ فوائد ہیں۔

☆ شاعر کے حال سے کسی بھی وقت ٹنوں کے حساب سے عبرت حاصل کی جا سکتی ہے۔

☆ شاعری سننے کے وعدے پر شاعر سے ہر کام کرا سکتے ہیں۔

☆ ضرورت پڑنے پر ان سے اپنی محبوبہ کا قصیدہ لکھوا کر درجات عشق بلند کئے جا سکتے ہیں۔

☆ شادی کے مواقع پر سہرا وغیرہ لکھوایا جا سکتا ہے اور بیگم کے مرنے پر قطعہ تاریخ وفات بھی لکھوا کر لوح مزار پر لکھوائی جا سکتی ہے۔

☆ شاعر کی موجودگی میں گھر میں چوکیدار کی قطعاً ضرورت نہیں۔

☆ شاعر گھر میں ہو تو کسی بھی وقت اس کی ردی جلا اور بیچ کر ہاتھ اور

جیب گرم کئے جاسکتے ہیں۔

☆ کسی بھی دشمن شاعر کو مسلط کر کے اس سے بدلہ لے سکتے ہیں۔

☆ شاعروں کو ٹارچر سیلوں میں ملازمت دینے سے کم وقت میں آسانی سے مطلوبہ مقاصد حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

☆ ایک شاعر کو دوست بنا کر سب دوستوں پر رعب رکھا جاسکتا ہے۔

☆ ضخیم شعری دیوان اچھے ہتھیار کا کام دے سکتا ہے۔

نقصانات:

☆ یہ گھر یا باہر کا کوئی عملی کام نہ کر سکنے کے باعث والدین کی بدنامی کا باعث بنتے ہیں۔

☆ ان کے اشعار بعض اوقات خاندان کی لڑائی کا باعث بن جاتے ہیں۔

☆ شاعر کے رات دیر تلک جاگنے سے محلے والے خواہ مخواہ مشکوک ہو جاتے ہیں۔

☆ شاعر جہاں بھی رہتا ہے، کباڑ خانہ قائم کر دیتا ہے۔

☆ گھر میں موجود کوئی بھی صاف کاغذ، حساب کتاب کی کاپیاں حتیٰ کہ ٹوائلٹ کی دیواریں اور بستر کی چادریں بھی اس کے مشق سخن سے محفوظ نہیں ہوتیں۔

☆ شاعر اور اس کے دوستوں کو چائے پلا پلا کر گھر کا بجٹ غیر متوازن ہو جاتا ہے۔

☆ شاعر زیادہ تر مالی طور پر تنگدست رہتے ہیں اس لئے اول تو کوئی لڑکی ان سے شادی پر تیار نہیں ہوتی اور اگر شادی ہو جائے تو تمام عمر قسمت کو روتی ہے۔

☆ اگر آپ کے حلقہ احباب میں کوئی شاعر ہے تو آپ کا موڈ ہو یا نہ ہو، اس کی شاعری سے محفوظ ہونا ہی پڑے گا۔

ادیب (نثر نگار)

تعارف: خود کو جینئس سمجھنے والا ایک کھسکا ہوا انسان جو اس خوش فہمی کا شکار ہوتا ہے کہ معاشرے کو بذریعہ قلم سدھار لے گا لیکن یہ بیچارہ خود کو بھی ساری عمر سدھار نہیں سکتا۔

اسباب: احساس کمتری یا کسی اور نفسیاتی مسئلے کی وجہ سے اچھا بھلا انسان ادیب بن جاتا ہے۔

پہچان: اس کی پہچان یہ ہے کہ بولتا بولتا سوچوں میں کھو جائے گا اور جب بولے گا تو آفاقی مسائل پر بات کرے گا لیکن بیچارے سے اس کے ذاتی مسائل بھی حل نہ ہو رہے ہوں گے۔

نمایاں خصوصیت: یہ اپنی تحریروں میں جس چیز کا درس دے گا، اس کی ذاتی زندگی اس کے بالکل برعکس گزر رہی ہوگی بعض منہ پھٹ اس کو منافق کہنے سے نہیں چوکتے۔

حلیہ: ان کا کوئی مخصوص حلیہ نہیں، ہر طرح کے حلیات (حلیہ کی جمع) میں پائے جاتے ہیں۔

معاشرتی مقام: ان کا معاشرتی مقام شاعر کے پڑوس میں "واقع" ہوتا ہے۔

اقسام

اصلی ادیب: یہ عموماً متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا ابتدائی دور نہ صرف معاشی بلکہ معاشرتی طور پر بھی خاصا آشوب گزرتا ہے۔ ہر عظیم آدمی کی طرح ان کو بھی ان کے اپنے گھر یا شہر میں نہیں سراہا جاتا حتیٰ کہ بعض اوقات ان کے پڑوسی تک ان کے ادبی مقام سے نابلد ہوتے ہیں جس کی وجہ سے وہ ان کی توہین کے مرتکب بھی ہوتے رہتے ہیں لیکن ملک اور ملک سے باہر دور دراز حصوں میں لوگ ان کے گن گاتے ہیں کیونکہ ویسے بھی دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں--- یہ اپنی صلاحیتوں کی بدولت ایک نہ ایک دن معزز مقام حاصل کر کے دنیا والوں کی چھاتی پر مونگ دلنے میں کامیاب ہو ہی جاتا ہے۔

قزاق ادیب: ان کے کئی گروہ ہیں۔ کچھ پرانے رسائل کی تحریروں پر اپنی دکانداری چمکاتے ہیں۔ جو زیادہ دلیر یا بے وقوف ہوتے ہیں، وہ دوسروں کی تحریر ہو بہو نقل کر لیتے ہیں۔ بعض جو ذرا چالاک ہوتے ہیں، وہ کرداروں کے نام اور تحریر کا عنوان بدل دیتے ہیں۔ بعض گھاگ تحریر نقل کرنے کے دوران جگہ جگہ اپنی طرف سے بھی کچھ مواد ٹھونس دیتے ہیں، یوں ایسا ملغوبہ بنتا ہے کہ اگر تحریر ان کی نہیں بھی بنتی تو اصلی مصنف کی بھی نہیں رہتی۔ بلاشبہ اس گروہ کو نقال ثابت کرنا از حد مشکل ہوتا ہے مگر یہ "ساجھے کی ہنڈیا" کبھی نہ کبھی "چوراہے" میں ضرور پھوٹتی ہے۔

طفیلیئے ادیب: یہ دوسروں کے کندھے پر رکھ کر بندوق چلاتے ہیں۔ ساری عمر دوسروں کی تحریروں کے انتخاب چھپواتے رہتے ہیں۔ کوئی بھی کمرشل رسالہ، ڈائجسٹ یا اخبار اٹھائیں تو اشعار، اقوال زریں، لطائف اور سوال و جواب وغیرہ کے کالموں میں براجمان ہوں گے۔ اگر ان کا کوئی بڑا مضمون چھپا بھی ہوگا تو وہ کسی مذہبی، سائنسی یا معلوماتی کتاب سے ماخوذ ہوگا۔ بعض اوقات یہ دوسروں کا کلام یا مضامین بھی مرتب کر کے چھپواتے ہیں اور یوں صاحب کتاب کہلاتے ہیں--- اپنی وجوہات کی بنا پر یہ اصلی ادیبوں سے زیادہ مشہور ہوتے ہیں۔ ان کا ایک گروہ تہواروں، عیدین، میلوں، قومی دنوں اور معروف شخصیات کی برسیوں یا سالگرہوں کے لئے مختلف کتابوں سے مواد اخذ کر کے

بھی مضامین لکھتا ہے اور اس طرح ادبی خیمے میں گھسنے کی کوشش کرتا ہے۔

انعامی ادیب: یہ صرف ریڈیو اور رسائل کے انعامی مقابلوں میں شرکت کرتے ہیں۔ طریقہ واردات ان کا یوں ہے کہ کسی بھی سوال کا جواب یا پزل کا حل کئی مختلف انداز میں لکھ کر اپنے، دوستوں، رشتہ داروں حتیٰ کہ شیر خوار بچوں تک ناموں سے بھجوا دیتے ہیں اور یوں کوئی نہ کوئی انعام بٹورنے میں کامیاب رہتے ہیں۔

صحافی ادیب: یہ وہ خوش نصیب ادیب ہوتے ہیں جن کے ہتھے کسی اخبار یا رسالے کی ملازمت چڑھ جاتی ہے۔ادیبوں کی یہ قسم ہمیشہ فائدے میں رہی ہے۔اس کو ادیبوں میں وہی مقام حاصل ہے جو پولیس میں تھانے دار کو۔اس کی دوستی دشمنی دونوں نقصان دہ ہیں۔ادیبوں کی اس قسم کی چند ذیلی اقسام بھی ہیں۔

فلمی صحافی: یہ صحافیوں کی سب سے زیادہ مقبول قسم ہے۔ہیروئنیں اتنا ہدایتکاروں فلمسازوں اور ہیروز کے پیچھے نہیں بھاگتیں جتنا ان کے پیچھے کہ یہ ان کو اپنے اخبار یا رسالے میں کوریج دیں۔یہی وجہ ہے کہ یہ صحافی عموماً راجہ اندر محسوس ہوتے ہیں۔محرم راز درون خانہ ہونے کے باعث بڑی بڑی نک چڑھی ہیروئنیں ان کو وقت دینے پر مجبور ہوتی ہیں۔ان کی بدولت بعض اوقات بالکل غیر معروف اداکار اور اداکارئیں شہرت کی پہاڑیوں پر چڑھ جاتی ہیں۔فلموں کے موجودہ معیار (اگر وہ کوئی معیار ہے تو) کے ذمہ دار یہ لوگ بھی ہیں۔

سیاسی صحافی: یہ عموماً تجزیہ نگار یا کالم نویس ہوتے ہیں۔ کچھ کالم نویس چڑھتے سورج کے پجاری ہوتے ہیں، بعض کالم نویس حکومت کے اور بعض اپوزیشن کے تنخواہ دار ہوتے ہیں۔یہ ہر دو اپنے مخالفین کے اچھے کاموں میں کیڑے نکالنے اور خامیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔نقد حق خدمت کے علاوہ اچھی کارکردگی پر ان کو بیرون ملک سیاسی و سرکاری دوروں میں بھی شریک کیا جاتا ہے۔

بلیک میلر صحافی: یہ صحافیوں کی گھٹیا ترین قسم ہے۔یہ ارباب اختیار، اہم مشہور شخصیات، اداکاروں، اور مجرموں کے جرائم اور دیگر زیر زمین سرگرمیوں کے ثبوت حاصل کر کے ان کو افشاء نہ کرنے کا معقول معاوضہ وصول کرتے ہیں۔ بعض اعلیٰ درجے کے بلیک میلر پوری حکومت کو بلیک میل کرتے ہیں اور معاوضے کے طور پر گرانٹ اور اشتہار وغیرہ حاصل کرتے ہیں۔ بعض اخبار چلتے ہی صرف بلیک میلنگ پر ہیں۔

فرضی صحافی: یہ رقم یا تعلقات کے بل پر کسی غیر معروف یا ڈی اخبار کا پریس کارڈ حاصل کر لیتے ہیں اور پھر ہر جگہ اس سے ناجائز فوائد اٹھاتے ہیں۔کبھی کوئی جرم کرتے پکڑے جائیں یا ٹریفک کی خلاف ورزی پر ان کو روکا جائے تو پریس کارڈ کی دھمکی سے جان بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔یوں چند لوگ پوری صحافی برادری کو بدنام کرتے ہیں۔

فحش نگار ادیب: ادیبوں کی یہ سب سے گھٹیا اور سب سے مقبول قسم ہے۔ان کے تخلیق کردہ شاہکار آپ کو بڑے سے بڑے بکسٹالوں کے علاوہ چھوٹے سے چھوٹے پھٹوں اور فٹ پاتھوں پر باآسانی مل جائیں گے۔ بہت زیادہ قیمت کے باوجود یہ شاہکار سب سے زیادہ فروخت ہوتے ہیں جن کو پڑھ کر بچے جوان، جوان مزید جوان اور بابے دوبارہ جوان ہو جاتے ہیں--- بکسٹالوں اور فٹ پاتھوں کے علاوہ ہر پبلک لائبریری کے نچلے خانوں میں بھی موجود ہوتے ہیں جو صرف مخصوص گاہلوں کو جاری کئے جتے ہیں۔حکومت جو ارباب اختیار کے خلاف ایک لفظ شائع ہونے پر نہ صرف مذکورہ کتاب ضبط کرتی ہے بلکہ مصنف اور پبلشر کو بھی سرکاری مہمان بناتی ہے، اس نے آج تک نہ تو ایسے کسی فحش نگار ادیب کو گرفتار کیا ہے، نہ کوئی ایسا چھاپہ خانہ سیل ہوا ہے اور نہ کسی ایسے بک سنٹر کے کاروبار میں دخل اندازی کی گئی ہے۔ہاں، کبھی کبھار اگر ہمارے جیسا کوئی ''شریف'' آدمی ایسی کتاب معلومات کے نقطہ نظر سے پڑھتا ہوا پکڑا جاتا ہے تو اس پر سارے قانونی تقاضے پورے کئے جاتے ہیں جس کے بعد وہ کتاب قانون کے محافظوں کے کام آتی ہے۔

مبصر ادیب: یہ لوگ ہر رسالے کے خطوط کے کالم میں دھڑلے سے موجود ہوتے ہیں۔یہ اپنے خط میں رسالے کی تحریروں پر ایسے گول مول انداز میں گھما پھرا کر تنقید کرتے ہیں کہ ایڈیٹر کا دماغ گھوم جاتا ہے لیکن ان کی بڑی تعداد اس ضمن میں وہی نسخہ استعمال کرتی ہے جو ''میبل'' پطرس بخاری صاحب کے ساتھ کیا کرتی تھی۔ یعنی لفافے سے ہی مضمون کا اندازہ کرتے ہوئے فہرست دیکھ کر تبصرہ کر دیتے ہیں اور یوں لہو لگا کر شہیدوں میں مل جاتے ہیں۔

خوشامدی ادیب: یہ عہدے دار اور دولت مند ادیبوں شاعروں کی تعریف میں مضامین لکھتے ہیں۔ صرف اپنے شہر یا ضلع تک محدود شاعروں کو آفاقی شاعر تک کا لقب دینے سے گریز نہیں کرتے، مختلف معروف ادیبوں اور شاعروں کے اعزاز میں تقاریب منعقد کرتے ہیں۔ نئے شاعروں اور ادیبوں کی کتاب رونمائی کرتے ہیں۔ اپنے علاقے کی انتظامیہ کے عہدے داروں کو ان میں مہمان خصوصی بناتے ہیں اور خفیہ مقاصد پورے کرتے ہیں۔ یہ اپنے شہر کے کسی نہ کسی استاد شاعر یا ادیب کے آستانے پر بھی وقتاً فوقتاً حاضری دیتے ہیں اور مختلف اقسام کا فیض حاصل کرتے ہیں چونکہ خوشامد کامیابی کا شارٹ کٹ ہے

اس لئے ادب میں بھی ایسے لوگ جلد کامیاب ہو جاتے ہیں۔ بعض ادیبوں کے بڑے بڑے رسائل میں نمایاں انداز میں چھپنے میں ان کی محنت سے زیادہ ان کے تعلقات اور خوشامدی خطوط بنام ایڈیٹر کا زیادہ دخل ہوتا ہے۔

ٹھیکیدار ادیب: بعض سینئر ادیب اپنے ہم عصر ادیبوں کی مخالفت میں کئی قسم کے چھوٹے بڑے ادیبوں کا ملا کر اپنا ادبی گروہ یا انجمن بنا لیتے ہیں اور جو ان کے گروہ سے متعلق ہو جائیں، وہ مستند شاعر ادیب ہو جاتے ہیں اور جو ان کے ساتھ شامل نہ ہوں، ان کا ادب ان کی نظر میں معتبر نہیں ہوتا۔ یہ اپنے متعلقین کو اپنے تعلقات کے بل بوتے پر میڈیا میں زیادہ سے زیادہ کوریج دلاتے ہیں۔ کچھ اس کے لئے ذاتی اخبار یا رسالہ نکال لیتے ہیں جس میں اپنوں کو نوازا اور مخالفوں کو دھتکارا جاتا ہے۔ ایسے مضامین چھاپے جاتے ہیں کہ ان کے گروہ کا ادنیٰ ترین رکن مخالف گروہ کے سرپرست اعلیٰ سے بھی اچھا شاعر اور ادیب قرار پاتا ہے۔

فرضی ادیب: یہ ٹھیکیدار ادیبوں کا چھوٹو ایڈیشن ہوتے ہیں۔ بعض اوقات گنتی کے چند لوگ مل کر ڈیڑھ اینٹ کی ادبی مسجد الگ بنا لیتے ہیں۔ یہ لوگ اکثر غیر ادیب ہوتے ہیں اور اگر کوئی ادیب ہو تو اس کی تحریریں کہیں چھپنے کے قابل نہیں ہوتیں۔ کبھی یہ دس بارہ تنظیموں کی داغ بیل ڈالتے ہیں جس کے تمام عہدیدار یہی لوگ عہدہ بدل بدل کر ہوتے ہیں۔ زید کسی کا صدر ہوتا ہے تو کسی کا سیکرٹری، بکر کسی کا خزانچی ہوتا ہے تو کسی کا نائب صدر رہتا ہے۔ یہ لوگ ادبی مقابلے منعقد کراتے ہیں اور چند ادیبوں کو انعام اور ایوارڈ بھی دیتے ہیں لیکن اس میں بھی اندھے کی ریوڑیوں کے سنہرے اصول پر عمل کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد مقابلے میں آنے والی تحریریں جن کو یہ ضبط کر چکے ہوتے ہیں، معمولی ردوبدل کے ساتھ اپنے ناموں سے چھپوا کر ہینگ پھٹکری لگائے بغیر چوکھے رنگ سے لطف اندوز ہوتے ہیں--- علاوہ ازیں یہ لوگ اخبارات و رسائل میں تواتر سے اپنی خبریں اور رپورٹس لگواتے ہیں جن میں سے نصف سے زائد ان کے چشم تصور کا کمال ہوتی ہیں اور لوگوں کو اخبار پڑھ کر علم ہوتا ہے کہ اتنی عظیم الشان تقریب ہو بھی گئی اور کان کو خبر بھی نہ ہوئی--- بعض اوقات ان لوگوں نے اپنی ہر تنظیم کو کسی نہ کسی طرح کام کے لئے مخصوص کیا ہوتا ہے کسی تنظیم کے ذمے کسی وی آئی پی کی وفات پر فرضی تعزیتی اجلاس منعقد کرنا اور رنج و غم کی قرار دادیں پاس کرانا، کسی کے ذمے کسی اہم شخصیت کے گھر بچے کی پیدائش اور ختنوں پر مبارکباد دینا، کسی کے ذمے حکومتی اداروں پر بیان داغنا، قوم کے درد سے بھرپور تجاویز پیش کرنا، کسی کے ذمے فرضی ادبی اجلاس منعقد کرنا ہوتے ہیں۔

نقاد ادیب: یہ شعری اور ادبی تخلیقات کا پوسٹ مارٹم کرنے والی ایک ظالم مخلوق ہے۔ ان کا جی چاہے تو اچھی سے اچھی تحریر کو ردی اور ردی سے ردی تحریر کو بلند پایہ ثابت کر دیں--- یہی نہیں بلکہ چاہیں تو تحریر کے مصنف کی تحلیل نفسی کر کے مصنف کے بارے میں وہ تفصیلات بیان کر دیں کہ وہ سب سے منہ چھپاتا پھرے۔ سمجھدار ادیب اور شاعر ان لوگوں سے بنا کر رکھتے ہیں۔

پیشہ ور ادیب: یہ بڑے بڑے ادیب ہوتے ہیں جو معاوضے پر لکھتے ہیں۔ یہ عموماً ''آرڈر پر مال'' تیار کرتے ہیں اور منہ مانگے دام وصول کرتے ہیں۔ یہ ملک کے تمام مشہور رسائل میں موجود ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ایک ہی رسالے میں ایک ہی ادیب دو تین مختلف ناموں سے بھی لکھتا ہے۔ بعض بڑے ادیبوں نے ''مال'' کی بروقت اور زیادہ فراہمی کے لئے کئی چھوٹے موٹے ادیب ملازم بھی رکھے ہوتے ہیں۔

فوائد:

- محبوبہ کے نام پھڑکتا ہوا محبت نامہ لکھوایا جا سکتا ہے۔
- ادیب کے ذریعے آپ کسی شخص کے ''کارناموں'' کو کہانی میں منظر عام پر لا کر سنگسار کرا سکتے ہیں۔
- ادیب کی ردی شاعری کی ردی سے کئی گنا زیادہ ہونے کے باعث ایندھن کا آدھا خرچ بچا سکتی ہے۔

نقصانات:

- ادیب کو رازدار بنانے کی صورت میں آپ کے ذاتی معاملات رسائل میں چھپ کر لوگوں کی دلچسپی کا سامان کر سکتے ہیں۔
- اگر آپ کی محبوبہ کو علم ہو جائے کہ آپ خط کہاں سے لکھواتے ہیں تو آپ محبوبہ سے ہاتھ دھو سکتے ہیں۔
- ادیب سے شادی کا رسک جو بھی لے گی اسے گھر کا خرچ بھی چلانا پڑے گا۔

یہ تو ہے رائٹروں کا کچا چٹھہ۔ اسے پڑھتے ہوئے کبھی آپ کو میری صورت نظر آئی ہو گی تو کبھی اپنی یا اپنے کسی دوست کی۔ بہرحال، ہنستے ہوئے گزر جائیے کہ اگر رائٹروں کے بارے میں باقی تفصیل بھی لکھوں تو ضخیم مقالہ تیار ہو سکتا ہے جس پر ممکن ہے احمقستان یونیورسٹی ہمیں پی ایچ ڈی کی اعزازی ڈگری بھی دے دے مگر ایسی صورت میں ہماری جان کو بھی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے سو اسی پر اکتفا کرتے ہیں کہ ہمیں انہی ادبی مگرمچھوں کے درمیان اسی ادبی دریا میں رہنا ہے۔

☆☆

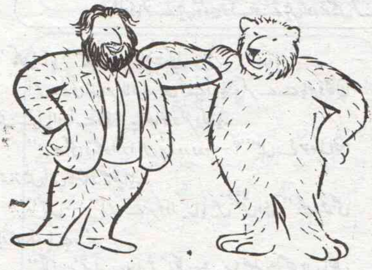

ہم شکل

☆ منظور احمد اعوان

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ دو جڑواں بہنیں یا بھائی ہم شکل ہوتے ہیں اور اُن کی عادات و اطوار میں بھی کافی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ ویسے بھی ہزاروں لاکھوں لوگوں میں بعض شکلیں اتفاقیہ طور پر مل جاتی ہیں۔ میرا کوئی جڑواں بھائی تو نہیں ہے لیکن کوئی ایسا ضرور ہے جو میرا ہم شکل ہے۔

میرا نام ظفر اقبال ہے۔ میرے والد گاؤں واہی جمن شاہ میں سردار رَبّ نواز کے کھیتوں میں کام کرتے ہیں۔ میں بھی اُس کے کام میں اُن کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ ہم نے چند مویشی بھی پالے ہوئے تھے، گزر بسر بہت مشکل سے ہو پاتی تھی۔ میں بہنوں، بھائیوں میں سب سے بڑا تھا اور گھر کی زبوں حالی دیکھ کر کڑھتا رہتا تھا پھر اپنے ایک دوست اللہ یار کے اُکسانے پر میں نے کھیتی باڑی کو خیر باد کہا اور شہر کا رُخ کیا۔ اللہ یار یونی لیور میں کام کرتا تھا۔ اُس نے مجھے بھی مل کے کچے ورکروں میں بھرتی کرا دیا۔ میری رہائش حبیب کالونی میں اللہ یار کے ساتھ تھی۔

شہر میں آئے مجھے دوسرا روز تھا۔ میں آس پاس کے علاقے کا جائزہ لینے کے لیے چہل قدمی کرتا پھر رہا تھا۔ فردوس مارکیٹ کے سامنے میرا ٹکراؤ اپنے ہم عمر ایک نوجوان سے ہو گیا۔ مجھے دیکھ کر پہلے تو وہ ٹھٹکا، پھر اُس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک لہرائی۔

''امجد علی! تم ---؟'' اُس نے کہا اور پھر اگلے ہی لمحے مجھے کھینچ کر گلے سے لگا لیا۔ ''ارے، میرے یار! تو تو عید کا چاند ہی ہو گیا ہے۔''

میں اُسے بتانا چاہتا تھا کہ اُسے غلط فہمی ہوئی ہے لیکن وہ مجھے بولنے کا موقع دیتا، تب نا! --- پھر وہ مجھے مٹھائیوں کی مشہور دُکان جالندھر سویٹ مارٹ لے گیا۔ ہم نے مٹھائی کھائی اور پیپسی نوشِ جان کی۔ وہ بہت باتونی لڑکا تھا۔ ہم جب تک وہاں بیٹھے، اُس کی زبان قینچی کی مانند چلتی رہی۔ وہ مجھے کالج کے زمانے کی باتیں یاد دِلا رہا تھا حالانکہ میں نے کالج کی شکل تک نہیں دیکھی تھی۔ میں نے تو مڈل بھی مر مر کے پاس کیا تھا۔ پھر اُس نے کسی طرح دار لڑکی نوشی کا ذکر چھیڑ دیا جس کے ساتھ کالج میں میرا افیئر چلا تھا۔ میں اُس کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ اگر اُسے ذرا سا بھی شبہ ہو جاتا کہ میں وہ نہیں ہوں، جو وہ سمجھ رہا ہے تو ساری کی ساری مٹھائی وہ خود ہڑپ کر جاتا، مجھے ایک ڈلی بھی نہ دیتا۔

☆☆☆

میرا نام صفدر حسین ہے لیکن لوگ مجھے شاہ جی فوٹو گرافر کے نام سے جانتے ہیں۔ میری دُکان عباسیہ روڈ پر ہے۔ اُس روز میں گاہکوں کے انتظار میں بیٹھا مکھیاں مار رہا تھا۔ سامنے فٹ پاتھ پر ایک بندر والا ڈگڈگی بجا کر بندر کا تماشا دِکھا رہا تھا، اُس کے اِرد گرد بہت سے لوگ جمع تھے اور دِلچسپی سے بندر کے کرتب دیکھ رہے تھے۔ اِنہی میں مجھے وہ نظر آیا تو میں چونک اُٹھا۔ میں دُکان سے باہر نکلا اور اُس کے شانے پر نرمی سے ہاتھ رکھا۔ اُس نے مجھے یوں دیکھا جیسے جانتا ہی نہ ہو۔ میں اُس سے تپاک سے ملا لیکن اُس نے جواب میں کسی قسم کی گرمجوشی نہ دِکھائی۔ میں نے اُسے بازو سے پکڑا، تقریباً کھینچتا ہوا اپنی دُکان میں لے آیا اور سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ جانے کو کہا۔ جب وہ بیٹھ چکا تو میں نے شکوہ کیا۔

''کیوں، میاں! اِتنے دِن کہاں رہے--- اپنا وعدہ بھی بھول گئے؟''

''وعدہ--- کیسا وعدہ؟'' وہ حیرت سے آنکھیں پٹپٹانے لگا۔

''اداکاری خوب کر لیتے ہو---'' میں نے ستائشی انداز میں کہا۔

''بھائی! میں واقعی لاعلم ہوں۔'' اُس نے بے بسی سے کہا۔

میں نے اُسے اُٹھایا اور اندرونی کمرے میں لے گیا۔ وہ کمرے کی دیواروں پہ بنی مختلف پینٹنگز، رنگ برنگے پردوں، لائٹوں اور کیمروں کے سٹینڈز اور فرش پر بچھے قالین کو ٹکر ٹکر دیکھنے لگا۔

''اِدھر اُدھر دیکھنے کی بجائے تم اِسے دیکھو۔'' میں نے کمرے کے وسط میں رکھے چوبی اسٹول کی جانب اشارہ کیا۔ جس پر گاہک کو بٹھا کر میں تصویر کھینچتا تھا۔ وہ اسٹول کو خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگا۔

"کچھ یاد آیا؟" میں نے دریافت کیا۔

اُس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ میں اُسے دوبارہ کمرے سے باہر دُکان میں لے آیا اور اُسے کاؤنٹر پہ رکھا فوٹو کاپیئر دِکھایا۔

"اِسے بھی دیکھو اور ذہن پر زور دو---؟" میں نے حوصلہ افزا انداز میں اُس کا شانہ تھپتھپایا۔

"نہیں---" اُس نے سر کو دائیں بائیں جنبش دی۔ "مجھے کچھ بھی یاد نہیں آ رہا ہے۔"

"لگتا ہے تمہارے دماغ کے کل پرزے ڈھیلے پڑ گئے ہیں بالکل اِس فوٹو کاپیئر کے پیچوں اور اندر رکھے اسٹول کی ہلتی جلتی ٹانگوں کی طرح---" میں نے طنز سے کہا۔

"مجھے بھلا کیسے یاد آ سکتا ہے کیونکہ میں---"

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر میں نے اُسے ہاتھ اُٹھا کر بولنے سے منع کر دیا۔

"تم نے وعدہ کیا تھا،" میں نے کہا۔ "کہ یہ کیٹر اور اسٹول ٹھیک کر دو گے۔"

وہ مضحکہ خیز انداز میں مسکرایا اور بولا۔ "میں کوئی مستری ہوں جو یہ چیزیں ٹھیک کر دوں گا؟"

"تمہیں حال ہی میں سر پہ کوئی چوٹ ووٹ تو نہیں آئی ہے؟" اَب کے میرے لہجے میں ہمدردی تھی۔

"مجھے نہیں پتا---"

اُس نے لاپروائی سے شانے اُچکائے۔ دُکان سے باہر نکلا اور چلتا بنا۔ میں ہونقوں کی مانند منہ کھولے اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

☆☆

اَمارا نام خوشدِل خان اے اِدر چوک پٹھانستان میں اَمارا نسوار کا دُکان اے۔ اَم لوگوں کو پرا پھٹ پر پیسا میسا بی دیتی ہے۔ ایک دِن اَم دُکان پر بھائی جمعہ خان کو بٹھایا اور سائیکل لے کر "وصولی" کرنے نکل پڑی۔ وائرلیس پل پر اَمارا اٹکرا امجد علی سے ہو گئی۔ اُس وقت وہ ایک چنگ چی کو روکتی تھی۔ اَم نے سائیکل کو دیوار سے لگائی، منہ میں نسوار کی چونڈی رکھی اور پٹھا پھٹ اُس کا گریوان میں ہاتھ ڈال دی۔ اَمارا بیا نک بوتھا، گینڈے جیسا جسم، ایئر پورٹ جیسا ٹنڈ اور پوچھل جیسا بڑا بڑا مونچھ دیکھا تو اُس کا سیٹی گم ہو گیا۔ کچھ دیر تو اُس نے اَم کو یوں دیکھا جیسا موت کا پھرشتا دیکھ لیا ہو۔ پھر جیسے اُس کو ہوش آ گئی، وہ زور سے پھڑ پھڑائی اور اپنا گریوان چھڑا کے باگی۔

"اوئے خوشدِل خاناں! داغا دا منڈیکا" اَم نے زور سے نعرہ مارا اور پھر پاگل سنڈے کی طرح دانت کچکچاتی اُس کے پیچھے دوڑی۔ "خانہ خراب کا بچہ! اَمارا پیسا کھا کر باگتی اے۔ آج اَم تم کو نئیں چھوڑے گی۔"

اَم بولی اور پھر قریب پہنچ کر ٹکر مارنے کے لیے سر آگے کو کی کیونکہ اَمارا اٹکر بہت مشہور اے۔ اَم ٹکر مار کے اُس کا چٹنی بنا دیتی مگر پھر یکدم وہ اَمارے سامنے سے ہٹ گئی۔ اَصل میں آگے بجلی کا ایک کھمبا آ گئی تھی۔ اَم جب کھمبا دیکھی، اَم کو دیر ہو گئی تھی۔ اَمارا سر کسی ہندوانا (تربوز) کی طرح کھمبا سے "ٹھاہ" کر کے لگی اور اَم چیخ مار کے اُدر لیٹ گئی---

ہوش آئی تو وہ خانہ خراب اُدر سے نو دو گیارہ ہو گئی تھی---سامنے نائی کا کھوکھا اے۔ اَم شیشے میں اپنا تھوبڑا دیکھ لوں، زیادہ نقصان مقصان تو نہیں ہو گیا، پھر تم کو اپنا سٹوری سناتی اے--- اُوئی اللہ، یہ اَمارا ٹنڈ شریف میں اِتنا بڑا ٹماٹر کدر سے نکل آئی؟--- ہائے اُوئے امجد علی! خدائی دَ ئی مڑکا---ظالم کا بچہ! تو نے اَم کو مار ڈالا رے۔

☆☆

اِن پے درپے واقعات نے میرے اوسان خطا کر دیئے۔ اِس شہر میں کہیں امجد علی نامی کوئی میرا ہم شکل موجود تھا۔ جس کے باعث میرے ساتھ آئے دِن یہ ناخوشگوار حادثات پیش آنے لگے تھے۔ خدشہ تھا کہ کبھی کوئی رُوح فرسا سانحہ بھی پیش آ سکتا ہے۔ میں سنجیدگی سے سوچنے لگا کہ یہاں سے کسی دُوسرے شہر کا رُخ کروں کیونکہ میرے ہم شکل نے میری جان جوکھوں میں ڈال دی تھی۔ شاید میں اپنے اِس اِرادے کو عملی جامہ پہنا ڈالتا، اگر ستارہ میرے دِل کی کال بیل نہ بجاتی۔

ستارہ کا گھر اُسی گلی میں تھا جس میں اللہ یار کے ساتھ میں ایک ڈربہ نما کوٹھڑی میں رہائش پذیر تھا۔ ایک روز میں اپنا عیدوالا سوٹ زیب تن کیے، سر پہ شیشوں والی سندھی ٹوپی دھرے، پاؤں میں پشاوری چپل پہنے اور کانوں میں عطر سے تر پھائے پھنسائے نمازِ جمعہ کی ادائیگی کے لیے لمبے لمبے ڈگ بھرتا مسجد کی سمت رواں دواں تھا۔ میں نے ابھی چند ہی قدموں کا فاصلہ طے کیا تھا کہ دفعتاً ایک گھر کا دروازہ کھلا اور کسی نے گندے پانی سے بھری بالٹی گلی میں اُچھال دی۔ میں اِس اُفتاد کی زد میں آ گیا۔ اَب میں بھیگا بلا بنا کھڑا تھا اور وہ کھلے دروازے میں سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے ملاحظہ کر رہی تھی۔ گورا رنگ، سیاہ گھنیری زُلفیں، بڑی آنکھیں، لمبی پلکیں، بیضوی چہرہ، ستواں ناک، پتلے ہونٹ، موتیوں جیسے سفید دانت، درمیانہ قد اور بھرا بھرا جسم--- وہ حسن و نزاکت کا مجسمہ تھی۔ میں مبہوت ہو کر اُس دِلکش حسینہ کو دیکھ رہا تھا۔ میرا دِل میرے سینے میں یوں گھونسے مار رہا تھا گویا پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ پھر اُس نازنین نے شرما کر دروازہ بند کر لیا۔ مجھے یوں لگا جیسے

مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی اوسط عمر زیادہ ہونے کا بڑا سبب یہ ہے کہ اِن کی بیویاں نہیں ہوتیں ☺ ظفر ندیم وہرہ

چاند بدلیوں کی اوٹ میں چھپ گیا ہو۔

☆☆

مَیں نے اُس خوبصورت اور شریف نوجوان پر گندے پانی کی بالٹی پھینک دی تھی، وہ ہکا بکا ہو کر مجھے دیکھ رہا تھا اور مَیں شرم سے زمین میں گڑی جا رہی تھی۔ میرا ضمیر اندر ہی اندر مجھے لاتیں مار رہا تھا، جی چاہ رہا تھا کہ اُسے ''سوری'' کہہ دوں لیکن مَیں ٹھہری مشرقی لڑکی، شرم و حیاء کی پتلی! سو نوانی حجاب آڑے آ گیا، زبان تالو سے چپک گئی اور پھر مَیں نے گھبرا کر دروازہ بند کر لیا۔ میرے دِل میں مروڑ اُٹھ رہے تھے۔ مَیں کافی دیر تک کسی بے چین کبوتری کی طرح گھر کے آنگن میں اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آتی جاتی رہی۔ یہ سوچ سوچ کر دِماغ ماؤف ہوا جا رہا تھا کہ ضمیر کی دولتیوں سے کیونکر چھٹکارا پاؤں؟--- مَیں گھر میں اکیلی تھی۔ اماں چوہدری صاحب کے بنگلے میں کام کرنے گئی ہوئی تھی، اَبا سبزی کا ٹھیلا لے کر صبح سے نکلا ہوا تھا۔ پھر مَیں نے چارپائی گھسیٹ کر دیوار کے ساتھ لگائی، اُس پر چڑھ کر ساتھ والے گھر میں جھانکا اور باجی ثریا کو آواز دی۔

باجی ثریا کے ساتھ اُن کے ضعیف ساس اور سسر رہتے ہیں۔ اُن کا میاں دُوبئی میں کام کرتا ہے۔ وہ ہر سال دو سال بعد چند ماہ کے لیے چھٹی پر آتا ہے۔ باجی ثریا نہ صرف ہماری پڑوسن ہیں بلکہ وہ میری رازدار سہیلی بھی ہیں۔ ہم اپنے دُکھ سکھ اکثر ایک دُوسرے سے شیئر کرتی رہتی ہیں، پریشانی کی اِس گھڑی میں اِنہی کا خیال آیا۔

☆☆

مَیں برآمدے میں ایک آرام چیئر میں بیٹھی ٹی وی پر اپنی پسند کا ایک میوزیکل پروگرام دیکھ رہی تھی، اِتنے میں دیوار پر سے ستارہ نے پکارا۔

''باجی ثریا---!'' وہ قدرے گھبرائی ہوئی تھی۔

''خیریت تو ہے؟'' مَیں نے پوچھا۔

''خیریت ہی تو نہیں ہے---'' اُس نے آہستگی سے کہا۔ ''تھوڑی دیر کے لیے آ جاؤ نا، تم سے ایک مشورہ کرنا ہے۔''

مَیں تشویش میں پڑ گئی۔

''تم آ جاؤ---'' مَیں نے کہا۔

''مَیں نہیں آ سکتی---'' وہ بولی۔ ''کیونکہ اَبا یا اَماں کبھی بھی نازل ہو سکتے ہیں۔ وہ مجھے گھر میں نہ پا کر میرا کیا حشر کریں گے، تم بخوبی جانتی ہو۔''

اُس روز گھر میں میرے علاوہ کوئی نہیں تھا، انکل اور آنٹی اپنی بیٹی

باذوق قارئین کے لیے بیبے اشعار

عالمِ اِسلام سے

میری بیوی قبر میں لیٹی ہے جس ہنگام سے
وہ بھی ہے آرام سے، مَیں بھی ہوں آرام سے
گھوڑے نکلے، اُونٹ نکلے، موٹریں نکلیں مگر
ایک بھی عالم نہ نکلا عالمِ اِسلام سے
(سیّد ضمیر جعفری)

شکوہ

مردوں کی یہ کارستانی لگتی ہے
گھر والی اِن کو اُستانی لگتی ہے
دو من کی دھوبن کہتے ہیں بیگم کو
ہمسائی کلیوں کی رانی لگتی ہے
(فاخرہ بتول)

تجربہ اپنا اپنا

آج کل کے پیار سے توبہ بھلی
اِس حسین آزار سے توبہ بھلی
ٹیپ ہو جاتی ہے اکثر گفتگو
فون پہ اِظہار سے توبہ بھلی
(نعیم نیازی)

واپڈا کے نام!

واپڈا والو! کچھ تو سوچو، آخر کب تک آنکھ مچولی
کب تک ہم خاموش رہیں گے، آج زباں ہم نے بھی کھولی
بل جو مجھ کو بھیجا تھا تم نے پورے تین ہزار روپے کا
بھیا! اِس پتلی سی گلی میں کیا مَیں نے کوئی مل ہے کھولی
(ضیاالحق قاسمی)

کالے بھوت

کوئی شہتوت چٹے ہیں، کوئی شہتوت کالے ہیں
مگر، اے جانِ من! تیرے تو سب کرتوت کالے ہیں
چڑیلیں اپنی خصلت سے کئی رنگ رُوپ دِکھلائیں
مگر یہ بات روشن ہے کہ سارے بھوت کالے ہیں
(فضل کریم شگفتہ)

ترتیب و اِنتخاب ✿ سیّد بدر سعید

کے گھر گئے ہوئے تھے جو جناح پارک میں رہتی ہے۔ میں نے گھر کو تالا لگایا اور ستارہ کے گھر جا پہنچی۔ اُس نے وہ واقعہ بلاکم و کاست میرے گوش گزار کر دیا جو تھوڑی دیر قبل گلی میں پیش آیا تھا۔ میں نے اُسے سمجھایا۔

''اِس بات کی ٹینشن نہ لو۔ تم بھولی بھالی ہو۔ تمہیں آج کل کے نوجوانوں کی خبر نہیں ہے' انتہائی دِل پھینک ہوتے ہیں۔ اُنگلی پکڑاؤ تو جھٹ سے پانچہ پکڑ لیتے ہیں۔ تم ''سوری'' بھی کہہ دیتیں تو وہ اِس کو غلط معنوں میں لیتا اور پنجے جھاڑ کر تمہارے پیچھے پڑ جاتا' جان چھڑانا مشکل ہو جاتی---بہتر ہے کہ اِس واقعہ کو فراموش کر دو۔''

میری پند و نصائح سن کر اُسے چپ سی لگ گئی۔

''سمجھ گئیں میری بنو---؟'' میں نے پیار سے اُس کے گال پر ہلکی سی چپت ماری۔

''ہاں' سمجھ گئی---'' اُس نے مردہ دِلی سے کہا۔

☆☆

شام کا وقت تھا۔ سورج دِن بھر کی مسافت طے کرنے کے بعد تھکن سے چور ہو کر ہانپ رہا تھا اور مغرب میں غروب ہونے کے لیے پر سمیٹ رہا تھا۔ میں سودا سلف لینے کے بہانے دُکان کی جانب جا رہا تھا۔ میں دِھیرے دِھیرے قدم بڑھا رہا تھا۔ دِل کو دِل سے راہ ہوتی ہے۔ وہ بھی دروازہ نیم وا کیے کھڑی تھی' اُسے بھی غالباً میرا ہی اِنتظار تھا مگر مجھے اُس کے ہاتھ میں کوئی بالٹی دِکھائی نہ دی۔ اُسے دیکھا تو میری داہنی آنکھ زور سے پھڑکی' یہ اِس بات کی علامت تھی کہ کچھ ہونے والا ہے۔ میرے دِل میں ہول اُٹھنے لگے پھر اُس نے اچانک میرے سامنے کاغذ کی ایک گولی پھینکی اور دروازہ بند کر لیا۔ میں بوکھلا گیا۔ میں سمجھا کہ وہ کوئی دَستی بم ہے جو کہ اَب تب میں پھٹ جائے گا اور جب بارودی دُھوئیں کے بادل چھٹیں گے تو یہاں گلی میں میرے جسم کے چیتھڑے بکھرے پڑے ہوں گے۔ پھر اخبار اور ٹی وی والے خبر دیں گے کہ ایک خود کش بمبار تھا جو پھٹ گیا۔

''اگر محبوب چاہتا ہے کہ میں اُسے جان کا نذرانہ پیش کروں تو مجھ میں تابِ اِنکار نہیں ہے۔ ایسی حسین موت کو تو بڑھ کر گلے سے لگا لینا چاہیے۔''

میں نے جذباتی ہو کر سوچا---میں نے دِل کی دھڑکنوں' لرزتی ٹانگوں اور کپکپاتے ہاتھوں کو سنبھالنے کی سعیٔ لاحاصل کی اور کلمہ طیبہ کا وِرد کرتے ہوئے وہ گولی اُٹھا کر اپنی سائیڈ پاکٹ میں ڈال لی۔ میں گھر تک بخیر و عافیت پہنچ گیا۔ پھر وہ گولی کھولی تو نہ دُھواں اُٹھا اور نہ ہی کوئی دھماکا ہوا۔ وہ ایک مختصر سا معذرتی خط تھا۔

''پیارے---!

میں نے تمہارے ساتھ جو سلوک کیا ہے' جان بوجھ کر نہیں کیا ہے۔ تم اتفاق سے سامنے آ گئے تھے۔ میں اپنی حرکت پہ بیحد پشیمان ہوں اور تم سے معافی کی طلبگار ہوں۔ اُمید ہے کہ ضرور معاف کر دو گے۔

تمہاری' ستارہ''

خط پڑھ کر میری باچھیں کھل گئیں۔ میں خود کو کسی مست بگلے کی مانند فضاؤں میں اُڑتا اور قلابازیاں کھاتا محسوس کرنے لگا' شیخ چلی کی طرح سہانے مستقبل کے تانے بانے بننے لگا۔ بیٹھے بٹھائے ستارہ جیسی خوبرو لڑکی کی توجہ حاصل ہو گئی تھی' گویا اندھے کے ہاتھ بٹیر لگ گیا تھا۔

☆☆

''عزیز از جان' ستارہ! سدا آسمانِ محبت پہ جھلملاتی رہو۔

تمہارا پُرخلوص محبت نامہ ملا۔ ہونٹوں سے چوما' آنکھوں سے لگایا۔ پڑھا' بار بار پڑھ کر طوطے کی طرح رَٹا لگایا اور پھر تعویذ بنا کر گلے میں لٹا لیا۔ یقین کرو' مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ یہ تو ایک خوبصورت حادثہ تھا جس نے ہم دونوں کو ملا دیا۔ میرا تو دِل کرتا ہے کہ روزانہ تمہارے گھر کے سامنے سے گزروں اور تم گندے پانی سے بھری بالٹی مجھ پر اُنڈیل دیا کرو۔

تمہارا پریمی' ظفر''

☆☆

میں یہ خط پڑھ کر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئی' ظفر بہت ہی دِلچسپ بندہ تھا۔ خط باجی ثریا کو دِکھایا تو وہ سناٹے میں آ گئیں۔

''تم معاملے کو اِس قدر طول دے دو گی' مجھے اندازہ نہیں تھا۔'' اُس نے قدرے برہم ہو کر کہا۔

''باجی! میں دِل کے ہاتھوں مجبور ہو گئی تھی۔'' میں مسمسی صورت بنا کر منمنائی۔ ''وہ مجھے اچھا لگنے لگا ہے۔''

''---اور تمہارے منگیتر آفتاب کا کیا بنے گا؟''

''باجی! گولی مارو آفتاب کو---'' میں نے بے رحمی سے کہا۔ ''ظفر اُس سے کہیں زیادہ ہینڈسم ہے۔''

''لیکن آفتاب تمہارا کزن بھی تو ہے اور اپنوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ماریں گے تو چھاؤں میں تو ڈالیں گے۔''

''ہاں' مجھے معلوم ہے۔ اپنے مارا بھی کرتے ہیں اور مارنے کے بعد از راہِ ہمدردی گھسیٹ کر چھاؤں میں بھی ڈال دیا کرتے ہیں مگر' باجی! مرنے کے بعد کیا دُھوپ' کیا چھاؤں---؟''

''اِس کا مطلب ہے کہ تم سیریس ہو؟''

''سو فیصدی---''مَیں نے پختہ عزم سے کہا۔

''ماں باپ کو کیسے راضی کروگی؟''

''کوشش کروگی ورنہ---''

''ورنہ کیا---؟''اُنہوں نے استفسار کیا۔

''تم ہو' نا---!''مَیں نے اُس کے گلے میں بانہیں ڈالتے ئے کہا۔''کوئی نہ کوئی راہ ڈھونڈ لوگی---اچھی باجی! بولو' میرا ساتھ گی' نا؟''

''میرے لاڈ پیار نے ہی تمہیں بگاڑ دیا ہے۔''اُنہوں نے ہنس کر ۔''مجھے ڈر ہے کہ تم پھر کوئی بے وقوفی کروگی۔''

مَیں نے بے اختیار ہو کر اُن کے رُخسار چوم لیے۔

☆☆

پھر دونوں جانب سے خطوط کا تانتا بندھ گیا۔ مَیں کام سے ناغے ـنے لگا' گلی میں میری آنیاں جانیاں بڑھ گئیں۔ ستارہ کو بھی اکثر واز ے میں کھڑے ہو کر تانک جھانک کرنے کی عادتِ بد تھی۔ ہم قع پا کر ایک دوسرے سے خطوط اور تحائف وصول کرلیا کرتے تھے۔ ی کبھار ہمیں باجی ثریا کے گھر کی بیٹھک میں مل بیٹھنے' چائے کی سیاں لینے اور گفت و شنید کا موقع بھی مل جاتا تھا۔ یہ ملاقاتیں باجی ثریا ڑی نگرانی میں ہوتی تھیں۔ باجی ثریا اِس بات کا بھی خیال رکھتی تھیں کہیں ہمارے ملنے جلنے کی بھنک کسی بدخواہ کے کانوں میں نہ پڑ ئے---خطوط اور ملاقاتوں کے ذریعے ہم نے ایک دوسرے کو کافی ک پرکھ لیا' جان لیا۔ بہت عرصہ تک یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا۔ پھر ایک یکایک اُس نے کھڑے پانی میں پتھر پھینک دیا۔ اُس نے خط ھا۔

''پیارے ظفر!

آج کل اَبا' اَماں زبردستی مجھے ڈولی میں بٹھا کر گھر سے نکالنے کا وبہ بنا رہے ہیں لیکن مَیں نے بھی دِل میں تہیہ کیا ہوا ہے کہ میری ی بس تمہارے گھر کے آنگن میں اُترے گی۔ مَیں نے دبی زبان سے ں سے زبردستی کی اِس شادی پر احتجاج بھی کیا مگر اَماں نے جھاڑو سے ی خوب مرمت کی ہے اور اَبا سے بھی کٹ کھلائی ہے۔ ماں باپ کی ـھناؤنی سازش کو ناکام بنانے کے لیے مَیں نے گھر سے بھاگنے کا ر پلان تیار کرلیا ہے---بتاؤ' کیا تم میرا ساتھ دوگے۔ مستقبل میں بوجھ اُٹھا پاؤ گے نیز اِس سلسلے میں مجھے کیا کیا کرنا ہوگا؟---جلدی پنے قیمتی مشوروں سے نوازو۔

تمہارے خط کی شدت سے منتظر' تمہاری دیوانی' ستارہ''

یہ خط پڑھ کر میرے تو ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے۔ بہت غور و فکر کے بعد بالآخر مَیں اُس کا ساتھ دینے پہ کمربستہ ہوگیا۔ مَیں نے خط میں لکھا۔

''عزیز از جان' ستارہ!

تمہارا خط ملا۔ پڑھ کر قدرے پریشانی تو ہوئی لیکن پھر تمہارے عزائم جان کر مجھ پر شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہوگئی۔ مَیں ابھی تک بغلیں بجاتا پھر رہا ہوں۔''پوں---پوں---'' کی آوازیں تمہاری سماعت سے بھی ٹکرائی ہوں گی---تم نے نہایت دانشمندانہ فیصلہ کیا ہے' تمہارے ماں باپ نے کوئی اور راستہ بھی تو نہیں چھوڑا ہے۔ میری جانب سے بے فکر رہو' مَیں تمہارا بھرپور ساتھ دوں گا۔ جہاں تک تمہارا بوجھ اُٹھانے کی بات ہے تم کچھ بھاری بھرکم تو ہو لیکن مجھے اُمید ہے کہ مَیں پھر بھی تمہیں اُٹھالوں گا۔ ایک بار گاؤں میں ایک گدھے کو اُٹھانے

ہزل

نہیں تم سے ہوئی محنت ذرا کیا
ہوئے ہو فیل' اَب آہ و بکا کیا
طریقے نقل کے اَب سینکڑوں ہیں
''عبارت کیا' اشارت کیا' ادا کیا''
''نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں''
کن اکھیوں سے تکا اَب تک' ہوا کیا
ہم اِس کو بھی تو پہچانتے ہیں رشوت
''ہم اِس کے ہیں' ہمارا پوچھنا کیا''
کہا بیٹوں سے زچ ہو کر یہ اِس نے
کہ ابا لاؤ گے اَب دوسرا کیا
ہے کوٹھے تک ہماری پارسائی
ہمارا ساتھ دیں گے پارسا کیا
کہا یہ خودکشی سے پہلے اِس نے
''نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا''
یہ مغرب کا ہے ساحل' بے وقوفو!
یہاں نظریں جھکا کر بیٹھنا کیا
پکڑ کر ناک عاصی کی وہ بولی
کہ اِس نلکی میں ہے آخر بھرا کیا

مزا عاصی اختر' میرپورخاص

کا مقابلہ ہوا تھا۔ کوئی بھی نہیں اُٹھا سکا تھا، مَیں نے اُٹھالیا تھا۔ تم ایک مہربانی کرنا کہ اپنا اور اپنی ماں کا قیمتی زیور، نقدی اور زنانہ و مردانہ ملبوسات کی گٹھڑی ضرور ساتھ لے لینا تاکہ ہم کچھ عرصہ تو روزی روٹی کی فکر سے بے نیاز ہو کر زندگی کی رنگینیاں اور سنگینیاں سمیٹ سکیں، بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ اللہ نے ہاتھ پاؤں دیئے ہیں نا، تمہیں بھی اور مجھے بھی اور پھر اللہ کی یہ زمین بھی تو بہت وسیع و عریض ہے۔ جب تک نصیب میں ساتھ نباہنا لکھا ہے، ہم مل جل کر زندگی کا بوجھ گھسیٹتے پھریں گے۔ بے شمار دُعائیں تمہارے لیے---!

تمہارا شیدائی، ظفر"

☆☆

ظفر کے خط نے مجھے ڈھارس دی۔ میرے اِرادوں میں کسی سنگلاخ چٹان کی سی پختگی آ گئی۔ ایک شب کو آئندہ کا لائحہ عمل مرتب کرنے کی خاطر باجی ثریا کے گھر کی بیٹھک میں ایک خفیہ سہ فریقی کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ اِس کانفرنس کے شرکاء تھے۔ ظفر، باجی ثریا اور مَیں--- کسی بیرونی مداخلت سے بچنے کے لیے بیرونی قوتوں (میرے والدین اور باجی ثریا کے ساس، سسر) کو حسبِ معمول چائے میں نشہ آور دوا پلا کر انتاغفیل کر دیا گیا تھا۔ طے یہ پایا کہ ہفتے کی صبح کو باجی ثریا مجھے خود لے کر ریلوے اسٹیشن پہنچیں گی، ظفر ہم سے وہیں آن ملے گا۔ پھر باجی ثریا ہمیں ہماری منزل کی جانب رُخصت کر کے لوٹ آئیں گی۔

ہماری منزل کراچی تھی۔ باجی ثریا نے بتایا کہ وہ شہر نہیں بلکہ اِنسانوں کا جنگل ہے۔ کوئی ساری زندگی بھی ہمیں ڈھونڈتا پھرے، ہماری گرد کو نہ پا سکے گا۔ وہ ایک غریب پرور شہر ہے، وہاں لوگوں کو آسانی سے روزگار مل جاتا ہے اور سر چھپانے کی جگہ بھی--- باجی ثریا نے ظفر کو اپنے ایک چچا کا ایڈریس اور فون نمبر بھی لکھ دیا اور کہا کہ اگر وہاں کوئی پرابلم ہو تو اُن سے رابطہ کر لیں اور پھر اپنے گھر کا نمبر بھی اِس تاکید کے ساتھ دیا کہ گاہے بہ گاہے اپنی خیریت سے مطلع کرتے رہنا۔

☆☆

ٹرین پلیٹ فارم پر پہنچ چکی تھی۔ مَیں اور ستارہ، ظفر کو ڈھونڈتی پھر رہی تھیں، پھر وہ ہمیں دِکھائی دے گیا۔ وہ ایک بوگی کے دروازے کے ہینڈل کو پکڑے کھڑا تھا۔ اُس کے دُوسرے ہاتھ میں بریف کیس تھا۔ وہ سوار ہوا ہی چاہتا تھا کہ ہم نے اُسے جالیا، مَیں نے اُسے دو ٹکٹ تھما دیئے۔

"یہ لو ٹکٹ۔" مَیں نے کہا۔ "ایک تمہارا ہے اور ایک ستارہ کا---"

وہ ٹکٹوں کو اور ہمیں تعجب سے دیکھنے لگا پھر ستارہ نے اپنا بھار بھرکم بیگ بھی اُس کے حوالے کر دیا۔

"یہ سب کیا ہے؟" اُس کے انداز میں ابھی تک حیرت ہچکچاہٹ تھی۔

"میرا سر---" مَیں نے قدرے برہمی سے کہا۔ "دیکھو، مذاق وقت نہیں ہے۔ جلدی سے سوار ہو جاؤ، یہاں ٹرین صرف پانچ منٹ لیے رُکتی ہے۔"

بہرحال تھوڑی سی تگ و دو کے بعد اُنہوں نے آمنے سامنے کی سیٹوں پر قبضہ جما لیا۔ مَیں نے اُن دونوں کو ہمیشہ ایک دوسرے کا خیا رکھنے کی تاکید کی پھر اپنی پیاری سہیلی کی جدائی پر میرا دِل بھر آیا۔ اِ وِسل دے رہا تھا، مَیں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اُسے دیکھا اور "ا حافظ" کہہ کر مڑی پھر بوجھل قدموں سے واپس چل پڑی۔ ابھی چند ق ہی چلی تھی کہ کوئی مجھ سے ٹکرا گیا۔

☆☆

مجھے کون سا لمبی چوڑی تیاری کرنی تھی۔ صبح اُٹھتے ہی غسل لباس تبدیل کیا اور روانہ ہو گیا لیکن بدقسمتی سے مجھے رِکشا ہی پھٹیچر ملا، جس نے تاخیر کرا دی۔ مَیں جب پلیٹ فارم کی سیڑھیاں چڑھ رہا تو اِنجن روانگی کے لیے وِسل دے رہا تھا۔ ٹرین روانہ ہوا ہی چاہتی تھ مَیں تیزی سے ٹرین کی جانب لپکا اور اِسی دوران سامنے سے آتی با ثریا سے ٹکرا گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر ہکا بکا رہ گئیں۔

"ستارہ کہاں ہے؟" مَیں نے اُن سے پوچھا۔

"اُس--- سے--- تو--- مم--- میں--- تمہارے سا سیٹ پر بٹھا کے آ رہی ہوں۔" اُنہوں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"لیکن مَیں تو ابھی ابھی پہنچا ہوں۔" مَیں نے بدحواس ہو کر کہا۔

ٹرین اَب آہستہ آہستہ رینگنے لگی تھی، کچھ اور کہنے یا سننے کے وقت نہیں تھا۔ ہم دونوں بھاگتے ہوئے مطلوبہ بوگی کے برابر پہنچ کھڑکی میں سے مجھے ستارہ اور اُس کے سامنے بیٹھے شخص کی ایک جھ دِکھائی دی۔ وہ دونوں محبت پاش نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ ر تھے، مَیں سن ہو کر رہ گیا۔ پھر ٹرین نے رفتار پکڑ لی اور میری ستارہ لمحہ مجھ سے دُور ہوتی چلی گئی۔ مَیں حسرت بھری نظروں سے اُس جاتی ٹرین کو دیکھتا رہا--- ستارہ کے ساتھ جو شخص بیٹھا تھا، اگرچہ مَیں اُسے پہلی بار دیکھا تھا لیکن مَیں اُسے اچھی طرح جان گیا تھا۔ وہ کوئی نہیں تھا بلکہ میرا ہم شکل امجد علی تھا۔

☆

فضولیات کا انسائیکلو پیڈیا

☆ شیراز علی

•ملبوسات

یف: لباس کی تعریفیں و تشریحات اِتنی ہی زیادہ ہیں جتنے کے س۔ لباس کی تعریف کتنی کی جائے اور کیسی کی جائے' یہ لباس پر منحصر ے۔ اگر ہم تاریخ کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ پتھر کے زمانے سے بھی ے اگر کوئی زمانہ ہے تو تب سے لے کر دَورِ جدید تک لباس کی کوئی خاطر ہ تعریف نہیں تھی۔ قدیم تعریف البتہ یہ تھی کہ ایسی چیز جو بدن کو ھانپ دے جبکہ دَورِ جدید میں اِس کی تعریف ہے کہ ایسی چیز جو جسم ے کس کے لپٹ جائے اور انگ انگ کے لیے شاہی قلعہ کے گیٹ کے ز کی کھڑکیاں بھی اِس میں حد سے زیادہ ہوں تا کہ گرمی ہو یا سردی ں بیرونی آب وہوا سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکے۔

یم لباس و بناؤ سنگھار: مورخین نے اور ماہرینِ آثار قدیمہ اور نہ نے کس کس نے تاریخ کو کئی زمانوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ سب سے لے پتھر کے زمانے کی بات کرتے ہیں۔ اِس دَور میں اِنسان پتھر کا تھا یا یں؟ اِس بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا تاہم وہ پتھروں میں رہتا تھا۔ ر کے زمانے کے اِنسان ہر چیز پتھر کی استعمال کرتے تھے۔ اب سوال ید، ہوتا ہے کہ کیا لباس بھی پتھر کا تھا یا نہیں؟ ویسے پتھر کے زمانے کے سانوں کو جس طرح سے وحشی ثابت کیا جاتا ہے' ہو سکتا ہے اِن طاقتور سانوں کا لباس پتھر ہی کا بنا ہو۔ چلو پتھر کا نہ سہی' چکنی مٹی کا تو ضرور بنا وگا۔

ے فیشن ایبل لباس: اِنسان کے پتے باندھنے کے بارے میں تو ہر وئی جانتا ہے۔ پتوں کو بطورِ لباس استعمال کرنے کا رواج آج بھی ہے ر دِن بدن اِس لباس کی مانگ میں بہت زیادہ اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ یا لباس قدرت سے محبت کرنے والے نہیں بلکہ فیشن سے عشق کرنے لے پہننے کے خواہش مند ہیں۔ ویسے اِس لباس کے بہت سے ے ہیں' خاص طور پر اِس کی وجہ سے اِنسانوں اور پودوں کے میان ایک فیشن ایبل رِشتہ قائم ہو رہا ہے--- قدیم دَور میں جب لوگ پتے باندھتے تھے تو اِس کا اُنہیں یہ بھی فائدہ حاصل ہوتا تھا کہ اُن کے انگ انگ میں قدرتی ٹھنڈک کا احساس ہر وقت رہتا تھا۔ مختلف اعضاء چھاؤں میں رہتے تھے اور گرمی کی شدت کم ہو جاتی تھی۔ پتے باندھتے اور کھولتے وقت زیادہ پریشانی بھی نہیں ہوتی تھی' اور پھر اِس کے ورزی بھی نہیں ہوا کرتے تھے۔ اِنسان خود ہی اپنا لباس سی لیا کرتا تھا۔ سینا کیا ہے' بس دو چار بڑے پتے پکڑے اور کسی جھاڑی کو پٹی یا ناڑے کے طور پر کس کے باندھ لیا۔

فیشن ایسا مرض ہے جو ہر دَور میں اِنسان خصوصاً عورتوں کو اپنا شکار بناتا رہا ہے۔ قدیم دَور میں بھی جب کہ اِنسان خصوصاً عورتیں پتے باندھا کرتی تھیں تو اِس وقت بھی عورتیں پورے اِنہماک کے ساتھ فیشن کیا کرتی تھیں۔ مثال کے طور پر ایک خاتون کہتی تھی۔

''ارے سکھی! مَیں نے تو سوچا ہے کہ اِس بار میلے پر مَیں انگوروں کی بیلیں لپیٹوں گی۔''

دوسری بولی۔ ''اچھا! اِتنا مہنگا لباس--- لیکن سکھی! مَیں تو بہت غریب ہوں' ایسا لباس میرے نصیب میں کہاں۔ لگتا ہے مَیں کبھی اچھا فیشن نہیں کر سکوں گی۔''

''کیوں' یار! میرے ہوتے ہوئے کیوں پریشان ہوتی ہو۔ تم میرا پرانا لباس لے لو' ابھی پچھلے میلے پر ہی مَیں نے پھول گوبھیاں پہنی تھیں۔ وہ تم لے لو اور ہاں جب تم یہ لباس پہن لو تو پھول گوبھیوں کے اوپر آلو لگانا مت بھولنا۔''

''ہائے' کتنا خوبصورت لباس ہے۔ تم کتنی اچھی ہو جو ہر سال میری مدد کر دیتی ہو۔ ابھی پچھلے سال ہی تو تم نے مجھے اپنا قیمتی ترین لباس حلوہ کدہ دیا تھا۔''

خیر' پرانے زمانے میں عورتیں سنگار بھی کرتی تھیں اور میک اَپ کا سامان بھی حاصل کر لیا کرتی تھیں۔ پتھر کے زمانے میں بیوٹی پالر بھی ہوتے تھے جہاں ماہر میک خواتین عورتوں کے رُوپ سنوارتی تھی یا

سنورے ہوئے کو بگاڑتی تھیں--- پاؤڈر کے لیے وہ جانوروں کی ہڈیاں پیس لیا کرتی تھیں۔ سرمے کے لیے وہ جوؤں کو سکھا کر اِن کو پیس کر آنکھوں میں لگاتی تھیں اور کاجل کے لیے ''کوبرا'' سانپ سکھا کر اِس کو پانی میں ملا کر یہ تیار شدہ لیپ استعمال کرتی تھیں۔ گالوں کو سرخ کرنے کے لیے میک اَپ کرنے والی عورت بہت کچھ لگاتی تھی۔ جیسے تھپڑ، گھونسے، گرم پتھر وغیرہ۔

بالوں کو سنوارنے کے لیے کنکھجورے کو استعمال کیا جاتا تھا۔ جب بال سنوارنے والی عورت کنکھجورے کو ہاتھوں میں بطور کنگھی پکڑتی تو اِس کے کانٹے کھڑے ہو جایا کرتے تھے' اِس طرح بال سنوارنے کے لیے اور جوئیں نکالنے کے لیے اضافی طور پر اِس کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔ شادی یا میلوں کے موقع پر عورتیں زیورات بھی سجاتی تھیں۔ مثلاً دُلہن کو تیار کرتے وقت اِس کے گلے میں مختلف رینگنے والے جانور استعمال ہوتے تھے۔ خاص طور پر اِس وقت شیش ناگ کو وہی اہمیت حاصل تھی جو آج سونے کی ہے اور اژدھے تو بس رانیاں مہارانیاں ہی اپنے گلے میں سجاتی تھیں--- خیر' اگر ہم عورتوں کے بناؤ سنگھار کے سامان کی فہرست میں جائیں گے تو تحریر کے لیے اِتنا ہی وقت درکار ہوگا جتنا پتھر کے زمانے سے جدید دُور تک کا وقت گزرا ہے۔ اَب اِن ملبوسات کے بارے میں مختصراً بتایا جاتا ہے جن کے بارے میں عام لوگ بھی جانتے ہیں اور خاص شخصیات بھی۔

دھوتی: دھوتی کو دھوتی اِس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ کبھی دھولی جاتی ہے اور کبھی نہیں دھوئی جاتی۔ یہ نر اور مادہ دونوں ہی پہنتے رہے ہیں' پہنتے ہیں اور پہنتے رہیں گے۔ خصوصاً ہماری پاکستانی فلموں میں زمانہ قدیم سے زمانہ حال تک ہمیشہ دھوتیاں ہی استعمال ہوئی ہیں۔ یہ دھوتی ہیرو یعنی ہیرو پہنے یا نہ پہنے مگر ہیروئن جو ہٹی کٹی ہوتی ہے اِسے تو ضرور باندھنی پڑ ہے۔ ہیروئن کو دھوتی پہنانا ہماری فلموں کا فیشن ہی نہیں بلکہ مجبوری ہے کیونکہ ہیروئن کا ڈیل ڈول جس قدر رہتا ہے' اِس کو مدنظر رکھتے ہو دھوتی بہترین چیز ہے۔ اِس میں ہیروئن کھلی ڈلی سی جاتی ہے اور اِس موٹاپا بھی کافی حد تک چھپ جاتا ہے۔

اگرچہ فلموں میں تو دھوتی کا استعمال عام ہے اور ہیروئنیں بڑے شوق سے یہ باندھتی ہیں مگر عام زندگی میں دھوتی عورتوں کو پسند لباس نہیں ہے۔ گاؤں میں بڑی بوڑھیاں یہ شوق سے باندھتی ہیں مگر جوان یا بڑھاپے سے چند سال پہلے کی خواتین دھوتی کو پسند نہیں کرتیں۔ شہری ماحول میں تو عورتیں قطعی اِس کو باندھنا پسند نہیں کرتیں۔ اِس کی بہت سی وجوہات ہیں' وجوہات نہیں بلکہ کہئے کہ دھوتی باندھنے والے بہت سے خطرات لاحق ہوتے ہیں۔ خاص طور پر موسم برسات کے دِنوں میں' آندھی طوفان کے موقع پر۔

مرد حضرات دھوتی بڑے شوق سے باندھتے ہیں۔ پاکستان میں مردم شماری والوں کو یہ جاننے کے لیے کہ کوئی مرد کنوارہ ہے یا شادی شدہ زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی۔ اگر مرد نے دھوتی باندھی ہوئی ہے تو سمجھ لیجیے کہ وہ شادی شدہ ہے' اگر دھوتی نہیں باندھی تو سمجھ لیجیے کہ کنوارہ ہے--- امیر لوگ سونے سے پہلے ''سونے کا لباس'' پہنتے ہیں جبکہ دھوتی غریب لوگوں کا 'سلیپنگ سوٹ'' ہے۔ گاؤں میں تو تقریباً ہر مرد ہی دھوتی پہنتا ہے مگر شہروں میں صرف شادی شدہ مرد یا گجر برادری دھوتی باندھنا پسند کرتی ہے۔

کسی زمانے میں دھوتی کو بہت اہمیت حاصل تھی یہ بادشاہوں کا شاہی لباس بھی تھا۔ سنا ہے کسی زمانے میں ایک بادشاہ تھا۔ اِس کو دھوتی باندھنے کا اِتنا شوق تھا کہ اِس کی دھوتی کا سائز پیروں سے لے کر گردن تک ہوتا۔ جی ہاں' وہ دھوتی بھی گردن کے گرد ہی باندھتا تھا۔ باقی کسی جگہ کوئی رَسّی یا ناڑا استعمال نہ کرتا تھا اور دھوتی کے نیچے یا اوپر کوئی دوسرا کپڑا استعمال نہ کرتا تھا۔ کہتے ہیں اِس کے ملک میں ہر پانچ سال بعد ایک عظیم الشان میلہ منعقد ہوتا تھا۔ اِس میلے کی دھوم دُنیا کے ہر کونے میں تھی اور لوگوں کی بڑی خواہش ہوتی تھی کہ وہ بھی اِس میں شرکت کریں۔ چنانچہ ایک بار یہ ہوا کہ پوری دُنیا کے بادشاہ' شہزادے' شہزادیاں وغیرہ میلے میں شرکت کرنے آئے۔

میلے کے پہلے روز بڑا سہانا موسم تھا۔ تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ پوری دُنیا کے بادشاہ اور عظیم شخصیات دو قطاروں میں کھڑے ہو گئے تا کہ میزبان بادشاہ کا استعمال کر سکیں۔ بادشاہ نے میلے کے لیے ہیرے

سوال و جواب

✿ بدصورت لڑکیوں کی قدر کون کرتا ہے؟
☆ تقریباً سبھی بیویاں!
✿ دکاندار کی مسکراہٹ مال بیچنے کے لئے ہوتی ہے اور خوبصورت لڑکی کی مسکراہٹ؟
☆ مال ہی لینے کے لئے اور ساتھ ہی جان بھی!
✿ اگر لڑکیوں کو محبت نہیں کرنا ہوتی تو وہ محبت نامہ وصول کیوں کرتی ہیں؟
☆ دعوت نامہ وصول کرنے کے بعد دعوت میں جانا ضروری نہیں ہوتا۔
✿ کیا بیوی صرف محبت کی بھوکی ہوتی ہے؟
☆ جی ہاں اور وہ اس کا اظہار بھی چاہتی ہے ماہانہ تنخواہ کی شکل میں۔
✿ شریف لڑکیوں کی پہچان لفٹ نہ دینا ہے اور شریف لڑکوں کی پہچان؟
☆ لڑکیوں کی طرف سے اِسے بدھو کا خطاب ملنا۔

وحید احمد تبسم' چکوال

یوں سے بھری ہوئی دھوتی پہن رکھی تھی۔ ہر کوئی اِس کی دھوتی دیکھ کر عش عش کر رہا تھا۔ کچھ مہارانیاں تو جھک کر پاؤں سے اوپر یعنی گردن تک دیکھنے کی کوشش کرتیں کہ ہیرے کتنے لگے ہیں اور کہاں کہاں لگے ہیں۔ کچھ مہارانیاں تو اچانک سکتے میں آ جاتی۔ ہیرے واقعی بہت قیمتی تھے--- خیر، بادشاہ سلامت نے یہ سوچ کر کہ میلے میں آئے ہوئے سارے مہمان اِس کی قیمتی دھوتی دیکھ سکیں، اپنے محافظوں کو اپنے سے پرے کر دیا تھا۔ وہ ہر کسی کو دیکھ کر مسکراتا اور شکریہ ادا کرتا۔ مہمان بھی اِس کو پاؤں سے گلے تک دیکھتے اور مسکراتے۔ وہ ہر کسی سے پوچھتا جاتا کہ "یقیناً آپ ہمارا میلا دیکھ کر بہت خوش ہوں گے اور سالوں یاد رکھیں گے"--- جب اِس نے آدھا فاصلہ طے کر لیا تو آسمان پر اچانک کالے بادلوں کی فوج آندھی کے ساتھ آ گئی۔ اِس سے پہلے کہ بارش ہوتی، اچانک مہمانوں نے قہقہوں کی بارش کر دی۔ وجہ یہ بنی ہے ہوا کے ایک تیز جھونکا بادشاہ سلامت کی دھوتی اُڑا کر اپنے ساتھ پہاڑوں سے بھی پرے لے گیا اور تمام مہمان جو میلہ دیکھنے آئے تھے، یہ میلا دیکھ کر ہنس رہے تھے تاہم یہ پہلا موقع تھا جب بادشاہ ہنسی کا جواب گالیوں سے دے رہے تھے اور اندھا دھند محل کی طرف واپس بھاگ رہے تھے۔ سنا ہے اِس المناک حادثہ کے بعد دھوتی کی مانگ کم ہو گئی اور عورتیں تو اِس سے بہت ہی زیادہ بدظن ہو گئیں۔

دھوتی کے چند فوائد اور احتیاطی تدابیر:

☆ سردیوں میں دھوتی کو بطورِ کمبل استعمال کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ کہ آپ گہری نیند نہ سوئیں ورنہ صبح کے وقت شرمندگی کا سامنا بھی کرنا پڑ سکتا ہے۔

☆ دھوتی کے چاروں کونوں کو چارپائی کے ساتھ باندھ کر پنگوڑے کا کام لیا جاسکتا ہے اور بچے کے جھولے کا بندوبست کیا جاسکتا ہے۔

☆ کیڑے مکوڑوں، سیلاب، پانی کی کمی، کھیتوں کی بدحالی کی وجہ سے بدحال ہونے والا کسان جبکہ بھاگی ہوئی بیوی کے غم میں، آشنا کے ساتھ آشنائی رکھنے والی بیوی کے دُکھ میں غموں کا مرا خاوند، اپنی باندھی ہوئی دھوتی کو پنکھے کے ساتھ باندھ کر بطور پھندا استعمال کر سکتا ہے تاہم پھندا لینے سے پہلے ضروری ہے کمرے کے دروازہ پر نوٹس لگا دے کہ لاش کو پھندے سے چھڑانے کے لیے صرف مرد حضرات ہی اندر تشریف لائیں یا پھر روشن خیال خواتین لٹکی ہوئی لاش کو پیار سے چارپائی پر لٹانے کی کوشش کریں۔

☆ پورے گھر کے دھوئے ہوئے کپڑے جبکہ وہ سوکھ جائیں تو انہیں دھوتی میں باندھ کر ایک "پنڈ" بنائی جاسکتی ہے اور سر پر اُٹھا کر چھت سے نیچے لایا جاسکتا ہے۔

☆ پرانی استعمال شدہ دھوتی کو بطورِ کفن بھی استعمال کیا جاسکتا ہے تاہم اِس دوران یہ احتیاط کی جائے کہ پاؤں والا حصہ مردے کے منہ پر باندھا جائے جبکہ ناف والا حصہ پاؤں کی طرف ہو، اِس سے مردے کو تکلیف نہیں ہوگی اور وہ غصہ کا اِظہار نہیں کرے گا۔

ساڑھی: ساڑھی دھوتی کی بہن ہے۔ دھوتی اور ساڑھی میں فرق یہ ہے کہ دھوتی مردوں میں مشہور ہے جبکہ ساڑھی عورتوں کا پسندیدہ لباس ہے، خصوصاً بھارتی ناریاں تو عام دِنوں میں بھی ساڑھی ہی زیب تن کیے رکھتی ہیں۔ ساڑھی اور دھوتی کو سیئے بغیر بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ صرف لمبا سا ایک کپڑا لیا جاتا ہے اور اِسے گھوم گھوم کر جسم کے اِردگرد لپیٹ لیا جاتا ہے۔ دھوتی اور ساڑھی میں یہ بھی فرق ہے کہ دھوتی تو باندھ لی جاتی ہے اور اپنی مرضی یا آندھی طوفان کی مرضی پر ہی کھلتی ہے مگر ساڑھی صرف باندھی نہیں جاتی بلکہ عورت کو اس کا ایک پلو ہر وقت پکڑا کر رکھنا پڑتا

شیطان مرغا

مرے گھر میں رہتا تھا شیطان مرغا
تھا ہر اِک کو کرتا پریشان مرغا
جدھر کو بھی جاتا، دُہائی مچاتا
محلے میں رکھتا تھا پہچان مرغا
تھا اِک تاج سر پر سجایا خدا نے
بہت خوبصورت تھا حیوان مرغا
ٹہلتا تھا سارے محلے میں خود ہی
دِکھاتا تھا یوں اپنی ہی شان مرغا
وہ چلتا تو لگتا تھا شہزادہ ہم کو
بہت خوبصورت تھا ذیشان مرغا
اِسے مرغیاں سب بلاتی تھیں گھر میں
ہر اِک گھر میں بنتا تھا مہمان مرغا
ہوا ایک بلی کا حملہ جو اِس پر
گلی میں پڑا تھا وہ بے جان مرغا
دِکھا بیٹھا وہ جان بلی کو اِک دِن
گنوا بیٹھا اپنی ہی یوں جان مرغا

ریاض احمد قادری، فیصل آباد

ہے۔ ساڑھی پہنی ہوئی عورت کی ذرا سی غفلت اِسے تھڑوں یا گلی کی نکروں پر کھڑے مردوں کی حسرت کا شکار کر سکتی ہے۔

ساڑھی پہننے کا بھی ایک منفرد طریقہ ہے۔ چونکہ ساڑھی بہت لمبی ہوتی ہے اور ساری کو جسم کے گرد لپیٹنا ہوتا ہے تو اِس کا ایک حصہ کسی چیز جیسے دیوار یا کنڈے کے ساتھ باندھ لیا جاتا ہے، پھر اِس کے بعد ساڑھی پہننے کی خواہشمند عورت دوسرا حصہ لے کر پیچھے کی طرف ہٹتی جاتی ہے جب تک کہ ساڑھی مکمل تناؤ میں نہ آ جائے پھر وہ ہاتھ میں پکڑا ہوا حصہ اپنے جسم کے گرد لپیٹ کر پنکھے کی طرح گھومتی ہوئی باندھے ہوئے حصے تک پہنچتی ہے۔ یہیں وہ چکر کھا کر گرتی ہے اور پھر جب ہوش بحال ہوتے ہیں تو اِس باندھے گئے حصے کو کھول کر ہاتھ میں پکڑ کر چلتی پھرتی ہے، یعنی وہ ساڑھی باندھ چکی ہوتی ہے۔

بعض اوقات ساڑھیاں گھر کے کمرے یا صحن سے بھی زیادہ لمبی ہوتی ہیں۔ ایسی صورت میں اکثر یہ حادثہ پیش آتا ہے کہ ساڑھی پہننے کی خواہشمند عورت ساڑھی کا ایک حصہ دیوار یا کنڈے کے ساتھ باندھ کر اور دوسرا حصہ ہاتھ میں لے کر محلے کی نکڑ تک پہنچ جاتی ہے، پھر وہاں سے گھومتے ہوئے اسے بندھے ہوئے حصے تک آنا پڑتا ہے۔ اِس وقت محلے داروں کی شدید خواہش ہوتی ہے کہ وہ بیچاری خاتون کو ساڑھی باندھنے میں مدد فراہم کریں مگر ایسا بمشکل ہی ہوتا ہے، عورتیں اپنی مدد آپ کے تحت یہ کارنامہ سرانجام دیتی ہیں۔۔۔ایک نہ کی گئی تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ زیادہ تر شوہر ایسی بیویوں کو پسند نہیں کرتی جو ساڑھی باندھتی ہیں۔ ناپسندیدگی کی وجہ کیا ہے، یہ شادی شدہ حضرات ہی بتا سکتے ہیں۔۔۔ایک اور تحقیق سے بھی یہ معلوم ہوا ہے کہ اِتنا پریشان کرنے والا یہ لباس جو مردوں کو بھی زیادہ پسند نہیں اور عورتوں کے لیے بھی بڑی مشکلات پیدا کرتا ہے، اسے عورتیں اِس لیے پسند کرتی ہیں کہ ساڑھی سے وہ ''ساڑھنے'' کا کام لیتی ہیں۔ جتنی مہنگی اور خوبصورت ساڑھی ہوگی، اِتنی ہی زیادہ خواتین ''سڑیں'' گی۔

ساڑھی اگرچہ عورتوں کا ایک قدیم اور پسندیدہ لباس رہا ہے مگر حالت حاجت میں جبکہ ایمرجنسی سر چڑھ کے بول رہی ہو تو یہ بہت سی مشکلات پیدا کرتی ہے۔

ساڑھی کے فوائد و احتیاطی تدابیر:

☆ ساڑھی اوباش لوگوں سے جو عزت لوٹنے میں ماہر ہوتے ہیں، اِن سے عورتوں کو بچاتی ہے تاہم ایسے علاقوں میں رہنے والی عورتوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ لمبی ترین ساڑھی کو اپنے جسم کے گرد لپیٹا کریں۔ اِس طرح اُنہیں اپنے بچاؤ کے لیے چیخیں مارنے اور مدد حاصل کرنے کے لیے آدھ سے پون گھنٹہ مل جائے گا۔

☆ ساڑھی اور دُودھ کا ڈبہ ایک جیسی خصوصیات رکھتے ہیں۔ جس طرح دُودھ کے ڈبے کئی تہیں ہونے کی وجہ سے اِس میں جراثیم داخل نہیں ہو سکتے، اِسی طرح ساڑھی کی بھی کئی تہیں ہونے سے گرد و غبار داخل نہیں ہو سکتا۔

شلوار قمیص: شلوار قمیص پاکستانیوں کا خاص طور پر پسندیدہ لباس ہے۔ مرد و خواتین سب بڑے شوق سے اِسے پہنتے ہیں۔ شلوار اور قمیص دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ شلوار ہمیشہ قمیص کے نیچے پہنی جاتی ہے جبکہ قمیص کے لیے ضروری ہے کہ وہ شلوار کے اُوپر پہنی جائے۔ بعض موقعوں پر یہ ترتیب خراب ہو جاتی ہے، خاص طور پر پولیس کے چھاپے کے وقت ہوش نہ رہنے کی وجہ سے شلوار منہ پر جبکہ قمیص ٹانگوں پر بندھی ہوئی ملتی ہے۔

شلوار کی تاریخ اِتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ قمیص کی کیونکہ اِن دونوں کا آپس میں رشتہ میاں بیوی کا ہے۔ شلوار کے لیے ضروری ہے کہ اِس کو دو الگ الگ ٹانگوں میں پہنا جائے۔ اگر ایک ہی خانے میں دونوں ٹانگیں گھسا دی جائیں تو پھر شلوار پہننے والے کا کسی بھی وقت اوندھے مونڈھے منہ گرنے کا خطرہ ہے۔

ٹوپی: لفظ ٹوپی توپ سے نکلا ہے۔ توپ اور ٹوپی میں فرق یہ ہے کہ توپ میں سر کے برابر بم گھسایا جاتا ہے جبکہ ٹوپی میں سر۔۔۔توپ سر کو اُڑانے جبکہ ٹوپی سر کو چھپانے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ ٹوپی ہندوستانیوں میں انگریزوں نے متعارف کرائی۔ انگریزوں کی یہ ٹوپیاں ہم پاکستانیوں نے خاص طور پر پسند کی ہیں، شاید یہی وجہ ہے کہ انگریز خاص طور پر امریکی انگریز سالوں سے ہمیں ٹوپیاں ہی پہنا رہے یا پھر ٹوپیاں کرا رہے ہیں۔

کچھا: کچھا اِنسان کے پسندیدہ ملبوسات کی فہرست میں سب سے اُوپر آ سکتا ہے بشرطیکہ کچھا یا کچھا پہننے والا سنسر نہ ہو جائے۔ کچھے کی پسندیدگی کا اندازہ یہاں سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اِس کی کئی شاخیں یا اِقسام بھی ایجاد کی گئی ہیں۔ کچھا کے بارے میں یہ بھی بتانا ضروری ہے کہ کچھا اگر مرد پہنے تو اِسے کچھا کہتے ہیں اگر عورت اِس سے لطف اندوز ہو تو اِسے کچھ اور کہتے ہیں۔ کچھے کی کئی اقسام اَب تک ایجاد کی جا چکی ہیں جن میں انڈرویئر، نیکر، لونگ نکر زیادہ مشہور ہیں۔۔۔ویسے تو کچھا کسی نہ کسی قسم میں ہر موسم میں اِنسانی ملبوسات کا حصہ بنا رہتا ہے تاہم سرِ عام کچھے پہننے کی نمائش، مطلب کہ کچھا پہن کر سرِ عام پھرنے کا مظاہرہ موسم گرما میں کیا جاتا ہے۔ کچھا نہ صرف وزن میں ہلکا پھلکا ہوتا ہے بلکہ اِسے پہننا بھی بہت آسان ہے، پھر اِس کی وجہ سے جسم کو خاطر خواہ ہوا بھی ملتی رہتی ہے،

دوسرے الفاظ میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ کچھا جسمانی اے سی ہے۔

کچھا کے فوائد واحتیاطی تدابیر:

☆ کچھ کی وجہ سے اِنسانی جسم خصوصاً ٹانگوں کو ہر وقت ہوا ملتی رہتی ہے تاہم اِس کے باوجود بھی اِنسانی جذباتی درجہ حرارت کم نہیں ہوتا بلکہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔

☆ کچھا پہن کر چلنے پھرنے کا مزہ بھی آتا ہے اور سکون بھی ملتا ہے مگر کچھا پہننے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ آلتی پالتی مار کر یا کسی کرسی و میز پر احتیاط سے بیٹھے کیونکہ ہوسکتا ہے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کو لاج آئے اور وہ آپ کی طرف چور نظروں سے دیکھے۔

☆ شہر میں تو کچھا پہننا اچھی بات ہے مگر کچھا پہن کر کسی جنگل یا کھیتوں میں نہ جائیں کیونکہ کسی اوباش قسم کے جانور یا کیڑے مکوڑے کا قابلِ اعتراض مقامات پر پہنچ جانے کا شدید خطرہ ہے۔

☆ عموماً کچھے میں الاسٹک ہوتا ہے تاہم بعض کچھوں میں لاسٹک کے علاوہ ناڑا بھی موجود ہوتا ہے۔ ناڑے کو بھی کس کر ضرور باندھ لیا جائے' لاسٹک کے بھروسے پر مت رہا جائے ورنہ کچھے پر لگی پٹی پر یہ لکھا ہوتا ہے ''ساڈا ذمہ توش پوش''

لہنگا: عام طور پر لہنگا شادی بیاہ یا اِسی طرح کے کسی موقع پر صرف لڑکی ہی پہنتی ہے۔ عام طور پر لہنگا پہننے والی دُلہن کہلاتی ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ ہر لہنگا پہننے والی لڑکی دُلہن ہی ہو۔ دُلہن کا بغور جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ لہنگا کسی نہ کسی طرح دھوتی سے متاثر ہے یا اِس کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ فرق صرف اِتنا ہے لہنگا میں ناڑا یا ہک ہوتے ہیں جبکہ دھوتی میں یہ احتیاطی وحفاظتی کنڈے نہیں ہوتے۔ لہنگا پہننے والی کے لیے ضروری ہے کہ وہ لہنگا کے ساتھ ساتھ کوئی دوسرا حفاظتی کچھا یا شلوار پہنے جبکہ دھوتی کے لیے یہ ضروری نہیں۔ لہنگا پہن کر ناچا گایا جاسکتا ہے اور پنکھے کی طرح تیزی سے گول گول گھوما جاسکتا ہے جبکہ دھوتی پہن کر ایسا نہیں کیا جاسکتا کیونکہ لہنگا تو پھیل کر پھول کی طرح کھل اُٹھتا ہے اور کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آتا مگر دھوتی پہننے والے کے ساتھ کوئی ممکنہ یا غیر ممکنہ حادثہ پیش آسکتا ہے۔

لہنگا ایسا لباس ہے جو پاکستان و بھارت میں بے حد مقبول ہے۔ لہنگا مہنگا ترین لباس ہے اور اِس کو خریدنے کے لیے عمر بھر کی پونجی بھی کم پڑسکتی ہے۔ یہ وزنی لباس ہے اور اِس کی تکلیف واذیت اِسے پہننے والی دُلہن ہی بتاسکتی ہے۔

فوائد واحتیاطی تدابیر:

☆ لہنگا شادی کی رات کے بعد ناقابلِ استعمال' مطلب اِس دِن کے بعد عموماً دُلہن یا عورت دوبارہ نہیں پہنتی اِس لیے آدھی قیمت پر بیچ کر کثیر رقم حاصل کی جاسکتی ہے۔ استعمال شدہ لہنگے کو اچھی قیمت پر فروخت کرنے کے لیے ضروری ہے کسی بھی وجہ سے اِس پہ ہوا کام اور موتی و تارے وغیرہ اُکھڑ نہ جائیں۔

☆ اگرچہ لہنگا ایک ہوادار لباس ہے مگر پھر بھی اِسے عام دِنوں خاص طور پر بارش کے موسم میں ہرگز نہ پہنا جائے کیونکہ یہ بے حد وزنی ہوتا ہے اور بارش سے بھیگ جانے کی صورت میں کوئی غیر متوقع حادثہ پیش آسکتا ہے۔

نمکین غزل

چند روز پہلے دیکھا' اک خواب بد وضع سا
اَب خیریت ہے لیکن تب دِل بہت ڈرا تھا
باچھیں کھلی پڑی تھیں' رالیں ٹپک رہی تھیں
گھوڑوں کے تھان پر جب ممبر ہر اک بندھا تھا
پچھلی حکومتوں نے جو کچھ دیئے دلاسے
موجودہ حکمراں بھی دیں گے وہی دِلاسا
اَب تک تو جو بھی آئے' امریکیوں نے بھیجے
حاکم کوئی ہمارا' کب ہم نے خود چنا تھا
خوابوں میں اس کے حلوہ' باتوں میں ہے سیاست
ملاں کے پیٹ میں ہے دوزخ کا اک گڑھا سا
تیور تھے خودکشی کے انداز بے دلی کے
شادی کے دِن تھا دولہا' لگتا مرا مرا سا
ہم ہیں بدست پتھر' وہ ہیں بدست لانچر
پھر بھی کبھی کو ڈر ہے' کریں گے ہمی دھماکہ
ہر آنے جانے والا مجھے پیٹے جا رہا ہے
پر میرا جرم کیا ہے' کوئی کیوں نہیں بتاتا
کہیں طالبان بھرے' کہیں پر ڈرون چھپیں
یہ مرے وطن میں یا رَبّ' کیا ہے لگا تماشا
یوں ہی بات بات پر نہ مستر تلخ ہوا کر
ان چاند کے صفحوں پر چھپتا ہے صرف باسا

۞ مسٹر ڈبکلاں
موبائل: 0333-6108120

غرارہ: یہ ایک زنانہ لباس ہے اور لڑکیاں بہت شوق سے پہنتی ہیں۔ اگرچہ اَب اِس کا رواج کچھ کم ہو گیا ہے مگر پھر بھی اِس کی اہمیت برقرار ہے۔ غرارہ بھی دھوتی ہی کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے۔ عام طور پر دھوتی کے درمیان میں ایک سلائی لگانے سے غرارہ بن جاتا ہے۔ اِس میں اِنسانی یا زنانی ٹانگیں کھلم کھلا آ جاتی ہیں۔ چونکہ یہ عام شلوار کے خانوں سے زیادہ کھلے خانے رکھتا ہے اِس لیے یہ ہوادار اور آرام دہ ہوتا ہے۔ غرارہ سینے والوں کے لیے یہ بھی ٹوٹکا ہے کہ اگر وہ کسی کچھے کو طاقت سے کھینچیں تو لمبا ہو کر کچھا غرارے میں تبدیل ہو سکتا ہے۔

فوائد و احتیاطی تدابیر:

☆غرارہ اوپر اور نیچے سے ایک جتنے خانے رکھتا ہے تو اِس لیے اِس کو پہنتے وقت اپنی توجہ اِسی پر مرکوز رکھیں کیونکہ غلطی سے پاؤں کا حصہ اُوپر کی جانب بھی پہن سکتے ہیں۔

☆چونکہ غرارے کے خانے بہت کھلے ہوتے ہیں اِس لیے فلمی ہیروئنوں خاص طور پر اسٹیج رقاصوں کو سخت محنت کے بعد پینٹ شرٹ میں گھسانے کی بجائے غرارہ پہنایا جائے۔ اِن کی موٹی موٹی ٹانگیں اِس میں گھسنے کی کافی اُمید ہوتی ہے۔ ہیروئنوں کو دھوتی کی قدیم ثقافت سے بھی چھٹکارا دلایا جا سکتا ہے۔

لنگوٹی یا چڈی: لنگوٹی نومولود یا پہلوان پہنتے ہیں۔ نومولود کو لنگوٹی باندھنے کا رواج ہزاروں سالوں سے چلا آ رہا ہے۔ اگرچہ یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جب بچہ چلنے پھرنے کے قابل ہو جاتا ہے تو غرباء اپنے بچے کو کپڑوں سے آزاد ہی گلی کوچوں میں بھاگنے دوڑنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ بہرکیف' نومولود کو لنگوٹی اِتنی پسند ہوتی ہے کہ وہ بار بار اپنی قابلِ اعتراض شرارتوں سے دِن میں دس سے پندرہ لنگوٹیاں بدل لیتا ہے یا پھر اپنے گھر والوں کو بدلنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

نومولود کے علاوہ پہلوان بھی لنگوٹی پہن کر کشتی لڑتے ہیں۔ جاپانی توی ہیکل سومو پہلوان جو اِتنے موٹے ہوتے ہیں کہ ہاتھی دِلبرداشتہ کر دُنیا سے گھٹتے ہی چلے جا رہے ہیں' اِن کے جسم پر بھی صرف لنگوٹی ہی ہوتی ہے۔ پہلوانوں کی لنگوٹی بہت مضبوط ہوتی ہے شاید یہی وجہ ہے کشتی کے دوران جب کوئی پہلوان اپنے حریف کو لنگوٹی سے اُٹھا کر پھینکتا ہے تو لنگوٹی پھٹتی نہیں یا پرزے پرزے نہیں ہوتی تاہم اِس کے باوجود بھی عورتیں پہلوانوں کی کشتی دیکھنے اکھاڑے میں نہیں جاتیں کیونکہ اِن کے ذہن میں یہ وہم بیٹھا ہوا ہے کہ لنگوٹی کا زیادہ اعتبار نہیں کیا جا سکتا ہے۔

لنگوٹی نے بہت ترقی کی اور آج یہ واٹر پروف شکل میں ایجاد ہو چکی ہے' لوگ اِسے زیادہ تر پیمپر کے نام سے جانتے ہیں۔ اِس کا کمال یہ ہے کہ پیمپر پہنے ہوئے کا خفیہ کمال کسی پر ظاہر نہیں ہوتا اور خشک ہی رہتا ہے۔ اِس ایجاد کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ گھروں کی مینڈیروں اور تاروں پر بدبودار لنگوٹیوں جن کو سوکھنے کے لیے لٹکایا جاتا ہے' کی بو سے فضا پاک ہونے لگی ہے۔ یہ واٹر پروف لنگوٹی بچوں کے ساتھ ساتھ جوان بھی شوق سے پہنتے ہیں اور اِس کی مشہوری کے لیے چینلز پر قابلِ اعتراض کمرشل بھی خفیہ الفاظ و سین کے ساتھ چلائے جا رہے ہیں اور خوب کمائی کی جا رہی ہے۔

فوائد و احتیاطی تدابیر:

☆لنگوٹی کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اِس کی وجہ سے براہِ راست کشتی دیکھنے والوں کو آنکھیں بند نہیں کرنی پڑتیں کیونکہ لنگوٹی ہی کی وجہ سے تو پہلوانوں کے جسم پر کوئی کپڑا ہوتا ہے' اگر لنگوٹی نہ ہوتی تو معاملہ کافی سنگین ہو سکتا تھا۔

☆اگر دیکھا جائے تو لنگوٹی نہ پہنی جاتی ہے اور نہ باندھی جاتی ہے بلکہ لپیٹی جاتی ہے جس میں وقت کم لگتا ہے تاہم خیال رکھا جائے کہ اچھی طرح سے لپیٹی جائے ورنہ راہ چلتے آپ کو لپٹ کر بیٹھنا پڑ سکتا ہے۔

جرابیں: جرابیں پاؤں میں پہنی جاتی ہیں اور ٹانگوں تک کھینچی جاتی ہے۔ جرابیں جوتوں کے ساتھ پہننے کا رواج عام ہے البتہ جو کچھ بھی کہیے جرابیں ایک خطرناک ہتھیار کے طور پر استعمال کی جاتی ہیں۔ آپریشن تھیٹر میں ڈاکٹر اِس سے ایسے مریض کو بے ہوش کرنے کا کام لیتے جو کسی صورت اپنے ہوش نہ کھو رہا ہو۔ اگر جرابیں کئی دِنوں سے گندی ہوں اور اِن کا ہاتھ منہ پانی سے نہ دھوئے گئے ہوں تو اِس کے ذریعے خطرناک سے خطرناک دُشمن کو بھی زیر کیا جا سکتا ہے۔ ایسی جرابیں جس نے پہنی ہوتی ہیں کوئی مکھی' مچھر یا باتونی قسم کا شخص یا عورت بھی اِس کے آس پاس نہیں پھٹکتی۔ تحقیق سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ اِنسان کو اپنی جرابوں سے بو نہیں آتی' شاید یہی وجہ ہے کہ وہ اِنہیں صاف و خوشبودار ہی سمجھتا ہے۔

فوائد و احتیاطی تدابیر:

☆اگر محفل برخواست نہ ہو رہی ہو یا کوئی مہمان رات ٹھہرنے کے بارے میں سوچ رہا ہو تو' ایسی صورت میں اپنی اُتاری ہوئی پرانی جرابیں پہن کر اِن کے پاس بیٹھ جائیں۔

☆بھلکڑ آدمیوں کو جرابیں پہنتے وقت یہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے کہ وہ اپنے پاؤں اور ٹانگوں میں جو پہن رہے ہیں' وہ جرابیں ہیں' پتلون نہیں اِس لیے جرابوں کو پتلون سمجھ کر کہیں آپ کو بھری محفل یا بازار میں شرمندگی کا سامنا نہ کرنا پڑ جائے۔

☆☆

ابراریات

☆ سید ابرار بخاری

بعض لوگ حاضر جوابی میں اتنے طاق ہوتے ہیں کہ کوشش کے باوجود مخالف کو جواب نہیں بن پڑتا۔ ہمارے ایک دوست جو ہمارے ساتھ ایک ہی جگہ کام کرتے ہیں، اُنہیں خدا نے اِس معاملے میں خصوصی طور پر نوازا ہے۔ کوئی بات ہو وہ اپنی مثالوں (جو اکثر فحش لطیفے ہوتی ہیں) سے مخالف کا ناطقہ بند کر دیتے ہیں اور مثال بھی ایسی چسپاں ہوتی ہے کہ مخالف مانے اور ہنسے بنا نہیں رہ سکتا۔ (اِس سے یہ مت سمجھئے گا کہ وہ فحش گو ہیں بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ فنِ فحش گوئی میں کچھ زیادہ ہی طاق ہیں اور جواب دینے کے بعد وہ اِس کا استعمال اپنی دلیل یا بات کو پرزور بنانے کے لئے کرتے ہیں۔) لگتا ہے، بات کچھ زیادہ ہی لمبی ہوگئی ہے۔ از قصہ مختصر، ایک بار ہم تمام فیکٹری ورکر کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ فیکٹری کے مالک جنہیں سب حاجی صاحب کہتے ہیں، وہ بھی ہماری محفل میں آ شامل ہوئے حاجی صاحب باتوں میں مصروف بار بار دیوار کی طرف دیکھتے جہاں ایک چھپکلی مٹرگشت کر رہی تھی۔ آخر حاجی صاحب سے نہ رہا گیا اُنہوں نے سلسلہ کلام درمیان میں ادھورا چھوڑا، وہیں پڑے ایک لکڑی کے سٹول پر جا چڑھے البتہ اِس سے پہلے اُنہوں نے ایک چھت کے پنکھے کا بلیڈ ہاتھ میں ضرور لے لیا اور جاتے ہی دھائیں کر کے چھپکلی کو جما دیا۔ چھپکلی نیچے گری، کچھ دیر تڑپی اور پھر ایک طرف کو بھاگ اُٹھی۔ ہمارے حاضر جواب دوست پکارے۔

''حاجی صاحب! بڑے بوڑھے کہہ گئے ہیں کہ جو چھپکلی مارے، اُس پر نہانا فرض ہو جاتا ہے اِس لئے آپ بھی اشنان کر لیں۔''

ہم سب دوست ہنسنے لگے تو حاجی صاحب ہمیں دیکھتے اور سٹول سے اُترتے ہوئے بولے۔

''چھپکلی مرے تو فرض ہوتا ہو گا جسے مَیں نے پھڑکانے کی کوشش کی تھی، وہ مری نہیں۔ اُس کی تو صرف دُم ہی جھڑی ہے، خود تو وہ زندہ سلامت جان بچی سو لاکھوں پائے کا وِرد کرتی بھاگ گئی ہے۔''

''اچھا---'' ہمارے حاضر جواب دوست نے ہنکارا بھرا اور فوراً ہنستے ہوئے بولے۔ ''چلئے، حاجی صاحب! پھر ٹانگیں ہی دھولیں۔''

اور پھر جو قہقہوں کا شور بلند ہوا، اُس میں سب سے بلند قہقہہ حاجی صاحب کا تھا۔

☆☆

جیسا کہ دوستوں کے علم میں ہے کہ ہم پچھلے دِنوں دُشمنوں کی بددُعاؤں کی بدولت خاصے علیل رہے اور اب ماشاءاللہ چاہنے والوں اور دوست احباب کی دُعاؤں کی بدولت صحت کے معاملے میں خاصے خودکفیل ہیں۔ چند دِن پہلے اپنے پیارے سیّد نجم الحسن صاحب ہماری خیر خیریت دریافت کرنے کے لئے ہمارے غریب خانے پر تشریف لائے، اُسی دِن محترم منظور احمد اعوان صاحب بھی ہمارے گھر تشریف لائے چونکہ مختصر وقت کے لئے دونوں دوست تشریف لائے تھے اِس لئے محفل پر رنگ آنے سے پہلے ہی محفل برخاست ہوگئی۔ کچھ اِس کی وجہ یہ بھی تھی کہ سارا وقت گفتگو ہماری بیماری کے گرد ہی گھومتی رہی لیکن وہ کیا کہتے ہیں کہ ''یار زندہ صحبت باقی''۔ اِن شاءاللہ آئندہ ملاقات پر اگلی پچھلی تمام کسریں نکال لیں گے لیکن ''چاند'' والے آپس میں ملیں اور قہقہے نہ بکھیریں، ایسی تو کوئی بات نہیں--- دورانِ گفتگو (جو ہماری بیماری کے متعلق ہو رہی تھی) ہم نے شاہ صاحب سے مخاطب ہو کر کہا۔

''شاہ جی! سات آٹھ سال پہلے جب بہن عصمت ضیاء ابھی عصمت خالد نہیں ہوئی تھیں، اُنہوں نے چاند کے سندیسے میں لکھا کہ لاہور کے علاقے ''نیو وسن پورہ'' میں چوہدری عبدالحمید صاحب یرقان کا مفت علاج کر رہے ہیں اور اُن کے ایک کزن اُن کے علاج سے صحت یاب ہوئے ہیں۔ اِدھر پاکستانی قوم کے فرد ہونے کے ناطے ہم نے بھی اِس بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کی ٹھانی کہ ہماری قوم کے کسی فرد کو کوئی مفت میں زہر بھی دے تو حلوہ سمجھ کر کھا جاتے ہیں بلکہ اُلٹا کھا پی کر نعرہ مستانہ بلند کرتے ہیں کہ---

ساقیا! پلا، اور پلا، اور پلا

ہم بھی فوراً چوہدری صاحب کے ہاں جا براجے۔ چوہدری صاحب نے گھر کی بیٹھک میں ہی اپنی دوکان سجا رکھی تھی۔ ایک دیوار کے ساتھ ایک پلنگ بچھایا ہوا تھا جہاں مریض کو لٹا کر اُس کے پیٹ میں چیک اپ کے نام پر ''کت کتاریاں'' کرتے تھے۔ چیک اَپ کے بعد فرماتے کہ آپ کے جگر پر ورم ہے' پھر مریض یا اُس کے لواحقین کو چند ڈائریاں پڑھنے کو دیتے جس میں اُن کے سابقہ مریضوں کے تاثرات ہوتے کہ اب مَیں پہلے سے بہتر ہوں۔ ہم نے البتہ دوران مطالعہ کسی ڈائری میں یہ لکھا ہوا نہ پایا کہ مَیں مکمل صحت یاب ہو گیا ہوں--- ''مکمل چیک اَپ'' کے بعد اُنہوں نے ہماری رپورٹس ''بے غور'' دیکھیں اور فرمانے لگے۔

''جی' علاج کروائیں گے؟''

''جی' بالکل اور کس لئے آپ کے خانہ اقدس پر تشریف لائے ہیں؟'' ہم نے جواباً عرض کیا۔

''یہ دوائی فری ہے---'' اُنہوں نے پلاسٹک کے چھوٹے چھوٹے پیکٹوں کی طرف اشارہ کیا۔

''جی' جی---'' ہم نے منہ میں آئے پانی کو بمشکل سڑکتے ہوئے کہا۔

''اور یہ---'' اُنہوں نے پلاسٹک کی ڈیڑھ لیٹر بوتل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''دو سو روپے کی ہے' اِس میں مختلف عرقیات کو یکجان کر کے ایک طاقتور عرق بنایا گیا ہے۔''

''جی' جی---'' ہمارے لالچی منہ میں بننے والا نمکین محلول یکدم بننا بند ہو گیا۔

اِس کے بعد اُنہوں نے میز کے نیچے ہاتھ ڈال کر ایک جام کی بوتل نکالی جس پر ابھی بھی ''مچلز جام'' کا سٹکر لگا ہوا تھا اور میز پر رکھتے ہوئے بولے۔

''خالص شہد میں مختلف جڑی بوٹیوں کو شامل کر کے اِس دوائی کو بنایا ہے' قیمت فقط چار سو روپیہ!''

ہم نے اُونٹ کی طرح گردن بڑھا کر اُس کا جائزہ لیا۔ ہماری چہرے پر شش و پنج کا جوار بھاٹا اُٹھتے دیکھ کر خالص کاروباری لہجے میں بولے۔

''صاحب! بیشک مفت والی دوائی لے جائیں' مجھے کوئی اعتراض نہیں---لیکن اِس عرق اور معجون سے اُس دوائی کا اثر دس گناہ زیادہ ہو جاتا ہے۔''

ہمیں گومگو کی حالت میں دیکھ کر اُنہوں نے پہلے اِرد گرد دیکھا' پھر اپنا منہ ہمارے منہ کے قریب لاتے ہوئے بولے۔

''آپ مجھے ذرا کمزور ہڈی پسلی کے لگتے ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو آپ اُس ضرب المثل پر کاربند لگتے ہیں کہ ''چمڑی جائے پر دمڑی نہ جائے''--- چلئے' آپ کے لئے خصوصی رعایت کر دیتا ہوں۔ نکالئے دونوں چیزوں کے پانچ سو۔''

پندرہ دِن بعد ہم جب دوبارہ اُن کے حضور حاضر ہوئے تو اُنہوں نے ہمیں دوبارہ معائنے کے لئے لیٹنے کا حکم دیا بعد از معائنہ ہشاش بشاش چہرے کے ساتھ بولے۔

''مبارک ہو آپ کا ورم اُتر گیا ہے۔''

اِس بار ہم نے بخوشی اُنہیں چھ سو روپیہ دے کر دونوں دوائیاں لے لیں۔

اگلے پندرہ دِنوں بعد جب دوبارہ حاضری دی تو اُنہوں نے دوبارہ مبارکباد دے کر ہم سے مبلغ چھ سو روپے دھروا لیا البتہ ہم نے یہ بات خصوصی طور پر نوٹ کی کہ وہ ہر ایک (جو پہلے دوائی لے چکا ہوتا) کو کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے ورم اُترنے کی ''مبارکباد'' دے ڈالتے۔ ہمارا ماتھا ٹھنکنے لگا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہم نے اُن سے مسلسل چار مرتبہ ''مبارکباد'' وصول کر کے اُن سے دوائی لینے کا حصول بند کر دیا۔ ہم نے ویسے ہی L.F.T ٹیسٹ کروایا تو پتہ چلا کہ ہمارا حساب اُس شعر کے مصداق ہو گیا ہے کہ---

''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی''

شاہ صاحب نے مسکراتے ہوئے ہمیں دیکھا اور بولے۔

''شاہ جی! اُن حکیم صاحب کا حال اُس اُونٹ والے کی طرح تھا جس نے اُونٹ کے ساتھ بلی کو بٹھا رکھا تھا۔ اُونٹ کی گردن میں ''مفت'' کی تختی لٹکا رکھی تھی اور بلی کی گردن پر ایک لاکھ کی پرچی چسپاں کر رکھی تھی۔ اُونٹ کی مفت فراہمی کو یقینی بنانے کے لئے بلی کی خریداری ضروری تھی---'' جب ہماری' منظور احمد اعوان اور خود شاہ صاحب کی ہنسی تھمی تو بولے۔

''اِسی مبارکباد سے اپنا ایک واقعہ یاد آ گیا' لیجیے سنئے۔''

ہم نے کہا۔ ''ارشاد---!''

فرمانے لگے۔ ''ہم نے مکان کی تعمیر کے لئے ایک اپنے جاننے والے مستری صاحب کو کام پر لگا دیا۔ ایک کمرے کی اُنہوں نے ٹھونک بجا کر پیمائش کی اور آڈر دے دیا کہ شاہ جی! اتنے فٹ کے گاڈر منگوا لیجیے۔ ہم نے دوکان پر جا کر آڈر بک کروا دیا۔ اُن مستری صاحب نے دیواروں کی چنائی شروع کر دی۔ دیواریں مکمل ہو گئیں تو اُس وقت تک

گاڈر بھی پہنچ گئے۔ اب گاڈر دیواروں پر دھرنے کی نوبت آئی تو وہ چھوٹے پڑ گئے۔ مستری صاحب ایک طرف گاڈر کو دھرتے تو دوسرے سرے پر اُسے دیوار پر دھرنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ دوسری طرف کوشش کر کے گاڈر دھرتے تو پہلی طرف سے گاڈر صاحب ناراض ہو کر نیچے سجدے میں جا پڑتے۔ معاملہ اب یوں تھا کہ---

''دِل کو روئیں کہ جگر کو سیں''

شام تک مستری صاحب گاڈروں سے دھینگا مشتی کرتے رہے۔ بہتیرا بندر بانٹ کی لیکن معاملہ زمین و آسمان کے درمیان ہی لٹکا رہا۔ آخر اُنہوں نے ٹھنڈی آہ بھری، آسمان کی طرف منہ کر کے اپنے ''کردہ'' گناہ کی معافی مانگی۔ اِک نگاہ ہمارے خشمگیں چہرے پر ڈالی، چہرے پر مسکراہٹ سجائی، ہمارے کندھے پر تھپکی دی اور بولے۔

''شاہ جی! مبارک ہو۔''

''وہ کاہے کی؟'' ہم نے تلملا کر پوچھا۔

تو ہمیں جپھی ڈالتے ہوئے بولے۔ ''آپ کی جگہ بڑھ گئی ہے۔''

☆☆

ہم بستر پر لیٹے پچھلے پندرہ دِن میں ہوئے سود و زیاں کا حساب کتاب کرنے میں مصروف تھے۔ اچانک ہماری نگاہوں کے سامنے ڈاکٹر صاحب کا چہرہ اُبھرا۔ نقوش واضح ہوئے تو اُن لبوں سے آواز آئی۔

''ابرار صاحب! آپ کی اینڈوسکوپی ہوگی، تین ہزار فیس جمع کروا دیجئے۔''

ہم ایک جھرجھری سی لے کر اُٹھ بیٹھے اور ہمارے منہ سے صدا نکلی۔

''بیگم---او، بیگم!''

بیگم فوراً بھاگی چلیں آئیں۔ ''جی، فرمائیے!''

''آئندہ ہمارے پینے کے لئے پانی اُبال کر رکھنا، بغیر اُبلا پانی ہم ہرگز نہ پئیں گے۔''

''جی، اچھا اور کچھ؟''

''نہیں، بس جاؤ لیکن خیال رکھنا، ہم پانی اُبلا ہوا ہی پئیں گے۔''

بیگم نے سر ہلایا اور چلی گئیں اور ہم دوبارہ سوچوں میں ڈوب گئے۔

''میں یہ ٹیسٹ لکھ رہا ہوں، کروا لیجئے گا۔ ایک P.C.R ہے، دوسرا الٹرا ساؤنڈ، تیسرا خون کا ٹیسٹ ہے کروا لیجئے گا۔ یہی کوئی چار ہزار میں ہو جائیں گے۔''

ڈاکٹر صاحب نے اپنے پرنٹڈ پیڈ پر قلم چلاتے اور اُسے ہمارے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے کہا۔ ہمارا دِل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ہم ایک بار پھر ماضی سے حال میں آ گئے اور بیگم کو پکارنے لگے۔

''بیگم---بیگم---شفق کی ماما---!''

''اجی، کیا ہے، کیوں چلا رہے ہیں؟'' بیگم جو برتن دھو رہی تھیں، ہمارے قریب آ کر دوپٹے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے بولیں۔

''آئندہ ہنڈیا میں سبز مرچ، سرخ مرچ، گرم مصالحہ قطعاً نہیں ڈالنا۔''

''جی، بہتر---'' بیگم بولی۔

''اور ہاں---'' ہم نے کھنکارتے ہوئے سلسلہ کلام جوڑا۔ ''گھی کا استعمال قطعاً بند، ہنڈیا کو گھی کا تڑکا لگانے کو زیادہ ہی جی چاہے تو گھی کے بند ڈبے کے اِرد گرد شیخوں کی طرح ہنڈیا کے دو چار چکر دلا لینا۔''

''اُف، توبہ ہے۔'' بیگم آہستگی سے پکاریں۔

''توبہ تو میں کر رہا ہوں---'' ہم نے پھنکارتے ہوئے کہا۔ ''جاؤ اپنا کام کرو۔''

بیگم بڑبڑاتی ہوئی چلی گئیں تو ہم دوبارہ ماتھے پر ہاتھ رکھ کر ماضی کے تالاب میں اُتر گئے۔

''کچھ پتہ نہیں چل رہا کہ کیا مسئلہ ہے۔ تشخیص صحیح ہوگی تو علاج فائدہ دے گا۔ یہ سی ٹی سکین کا ٹیسٹ ہے، لاہور شوکت خانم سے کروا لیجئے گا۔ ذرا مہنگا ہے لیکن جان سے مہنگا نہیں۔''

''کتنا مہنگا ہے؟'' ہم نے مرے مرے لہجے میں ڈاکٹر صاحب سے پوچھا۔

''یہی کوئی دس ہزار میں ہو جائے گا۔''

ہمیں ہول سا آ گیا۔ ہمارے سارے جسم نے جھرجھری سی لی، یوں لگا جیسے کوئی بھوت یکبارگی پاؤں کے ناخنوں سے داخل ہو کر سر کے بالوں سے نکل گیا ہو۔

''بیگم---!'' ہم زور سے پکارے۔

''اب کیا ہے؟'' بیگم برتن دھوتے ہوئے ہی پکاریں۔

''اب تم نے وہ چاول پکائے نا، جنہیں کھا کر ہمارے منہ سے بھاپ نکلنے لگتی ہے، پیٹ میں آگ لگ جاتی ہے، دماغ پر خواہ مخواہ ہی کسی کو جھانپڑ لگانے اور اِسے کاٹ کھانے کو جی چاہنے لگتا ہے---''

''کون سے چاول؟'' بیگم ہماری بات کاٹتے ہوئے بولی۔

''وہی جس میں تم چمچے بھر بھر کر سرخ مرچوں کے ڈالتی ہو۔''

''یوں کہئے نا، بریانی!'' بیگم ہنستے ہوئے بولی۔

''ہاں، وہی بریانی۔ اب اگر تم نے وہ چاولوں اور مرچوں کا ملغوبہ پکایا تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا اور ہاں، اپنی ہنسی کو لگام دو، اگر نہیں دے سکتی تو مجھے بتا دو تا کہ میں اپنے ہاتھوں کی ہتھکڑی کھول دوں۔''

''آپ جیسوں کو تو بیمار ہونا ہی نہیں چاہئے' جان عذاب میں کر دیتے ہیں آپ جیسے لوگ۔''

ہم دوبارہ بستر پر دراز ہو کر سوچوں کے حصار میں قید ہو گئے۔

''یہ لیجئے۔''

''یہ کیا ہے؟'' ہم نے استفسار کیا۔

''یہ ٹیسٹ سی وائرس کا ہے۔ آپ نے اُس کی کلچر رپورٹ لینی ہے۔''

ہم نے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! آخر اِس کی کلچر رپورٹ لیبارٹری سے کروانے کا فائدہ؟ ہم بتائے دیتے ہیں کہ اِس کا اور امریکیوں کا کلچر ایک ہی ہے۔ جہاں گھستے ہیں' نکلنے کا نام نہیں لیتے۔ ڈھیٹ ابن ڈھیٹ! پچھلی بیس نسلوں سے اِن میں کوئی باحیا اور شرم والا ہوا ہی نہیں۔ کوئی زیادہ ہی اِن کی طنابیں کھینچ دے تو مکر کر کے بیہوش ہو جاتے ہیں اور مناسب موقعہ اور حالات دیکھ کر دوبارہ ڈی ایکٹو سے ایکٹو ہو جاتے ہیں۔''

ڈاکٹر صاحب ہنستے ہوئے بولے۔ ''بجا فرماتے ہیں آپ لیکن یہ بھی بہت ضروری ہے' اِسی کے سہارے علاج شروع ہوگا۔''

''کتنے میں ہو جائے گا؟''

''فقط آٹھ نو ہزار میں!'' ڈاکٹر صاحب ہم سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولے۔

''بیگم --- بیگم! سنتی ہو کہ نہیں۔'' ہم پکارے۔

''جو کہنا ہے' ایک بار ہی کہہ لیں' میں نے ابھی بہت سے کام نپٹانے ہیں۔''

''آج سے چھوٹا' موٹا اور کھوٹا گوشت گھر میں نہیں پکے گا۔''

''فرما تو ایسے رہے ہیں جیسے روز گھر میں قورمہ اور کڑاہی گوشت پکتا ہے ---'' پھر کچھ توقف کے بعد بولیں۔ ''یہ چھوٹے اور موٹے کی تو سمجھ آ گئی' یہ کھوٹا کس بلا کا نام ہے؟''

''یہ کھوٹا اُسی بلا کا نام ہے کہ جس میں اگر بیماری پھیل جائے تو پندرہ بیس ہزار کی اجتماعی قبر کھودی جاتی ہے --- بس گوشت کی ہر قسم بند کیونکہ ڈاکٹر صاحب نے منع فرمایا ہے۔''

بیگم چلی گئی تو ہم دوبارہ بازو کا تکیہ بنا کر لیٹ گئے۔

''جی ابرار صاحب! تمام رپورٹس ملنے کے بعد میں اِس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ اِس بیماری کے ٹیکے لگوا لیں۔ پچاس پچپن ہزار کا کورس ہے۔ دوسری دوائیوں کے پیسے الگ سے ہوں گے اور درمیان میں ٹیسٹ الگ سے ہوں گے۔ چھ ماہ کا کل خرچہ یہی کوئی اَسّی نوّے ہزار ہو جائے گا۔''

جی تو چاہا کہ ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں موجود بیڈ پر لیٹ جائیں اور پھر کبھی نہ اُٹھیں۔ اب تو حال وہ ہو گیا تھا ---

''کہ پلے نئیں دھیلا تے کردی میلہ میلہ''

اب ہم گھر کے بستر پر پڑے یہی سوچ رہے تھے کہ کس کس رشتہ دار کو خوف خدا دلا کر اور کس کو آخرت کی بہتر حوروں کا لالچ دے کر ٹھگیں۔ ہر بار حساب کتاب کرنے کے بعد اَسّی نوّے ہزار میں سے اَسّی نوّے ہزار کم پڑ جاتے --- ہم نے حساب کتاب کے کھاتے کو دُور پھینکا اور پکارتے ہوئے کہا۔

''بیگم --- او بیگم!''

''جی' فرمائیں!'' بیگم طنز سے بولی۔

''آئندہ آٹے میں نمک نہیں ڈالنا۔ غضب خدا کا' تمہیں علم نہیں ہے کہ جگر کے مریضوں کے لئے نمک کتنا مضر ہے۔ جگر خون بنانے کی فیکٹری کی بجائے' پانی کا ٹیوب ویل بن جاتا ہے۔''

''آج آپ کو ہو کیا گیا ہے؟ کبھی کہتے ہیں کہ عام پانی بند' کبھی مرچ مصالحے اور گھی بند' گوشت بند اور اب نمک بند؟''

''بیگم! یہ سب بندشیں میں نے نہیں' ڈاکٹر صاحب نے لگائی ہیں۔''

''جن کی یاد پندرہ دِن بعد آئی ہے؟'' بیگم کاٹ دار لہجے میں بولی۔

''کیونکہ آج ہی مجھے وہ آزمودہ مقولہ یاد آیا ہے۔''

''کیا ---؟'' بیگم پوچھنے لگی۔

ہم نے اپنی کسمپرسی پر ایک نگاہ ڈالی' ٹھنڈی آہ بھری اور کہا۔ ''پرہیز علاج سے بہتر ہے۔''

☆☆

گوجرانوالہ شہر کے وسط میں ایک قدیم عمارت ایسی بھی ہے جسے 1947ء میں زبردستی مشرف بہ اسلام کیا گیا تھا۔ اِس کی ایک تاریخی حیثیت بھی ہے یہاں پر مشہور سکھ مہاراجہ رنجیت سنگھ پیدا ہوا تھا۔ یہ عمارت یا حویلی اُسی مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ننھیال کی تھی۔ سکھوں کی تاریخ جس مہاراجہ پر فخر کرتی ہے اور سکھ مورخ لکھتے ہیں کہ مہاراجہ کے زمانے میں سکھ اِزم کو عروج حاصل ہوا' مہاراجہ کے دَور میں ایسا عادلانہ معاشرہ قائم ہوا جس میں شیر اور بکری ایک ہی گھاٹ پر پانی پیتے تھے' اُس کے بانی نے گوجرانوالہ میں ہی آنکھ کھولی اور اِنہی گلیوں میں بچپن گزارا البتہ سکھ مورخ یہ لکھنا بھول گئے کہ ایک ہی گھاٹ پر پانی پی چکنے کے بعد شیر جی بکری صاحبہ سے کیا سلوک کرتے تھے --- آج کل وہ حویلی ''اَنیاں دی مسیت'' کہلاتی ہے (اندھوں والی مسجد) یہاں دُور دُور سے مادرزاد حافظ تشریف لاتے ہیں۔ اللہ اللہ کرتے ہیں' لوگوں کے ''ختمے'' کے ختم

پڑھتے ہیں اور قطار اندر قطار اودے، نیلے، پیلے پیراہن پہنے ایک دوسرے کے کندھوں پر ہاتھ دھرے بازاروں میں مٹرگشت کرتے رہتے ہیں۔ اُن کا رہنما عموماً ''اندھوں میں کانا راجہ'' ہوتا ہے یا پھر کوئی نیم گل آنکھوں کا مالک جو ہر دس قدم کے بعد کسی راہ گیر سے ارنے بھینسے کی طرح ٹکرا جاتا ہے۔ سارے شہر کا صدقہ اِس مسجد میں پہنچتا ہے۔ پورا پاکستان منگل بدھ کو گوشت کی چھٹی کرتا ہے، یہ اُس دِن بھی گوشت کھانے سے باز نہیں آتے۔ کسی نے ازراہ تفنن ایک حافظ جی سے پوچھا۔

''حافظ جی! آج تو گوشت کی چھٹی کر لیتے؟''

تو حافظ جی بولے۔ ''بھائی! کھانے کو کس کا دِل کرتا ہے؟ مسلمانوں نے اپنے سر کا صدقہ دیا ہوتا ہے۔ ہم تو اُن کی بلا ٹالنے کے لئے کھاتے ہیں اور مجبوری میں اوور ٹائم لگاتے ہیں۔''

یقین کریں ڈیوٹی اور اوور ٹائم کے باوجود اتنا مال اسباب بچ جاتا ہے جسے وہ اونے پونے داموں دوکانوں پر بیچ ڈالتے ہیں۔ ''اندھوں کی مسیت'' سے پچاس قدم کے فاصلے پر مچھلی اور گوشت کی مارکیٹ ہے۔ عموماً یہاں دوکانوں پر مچھلی یا سری پائے، اوجڑی کلیجی ہی فروخت ہوتی ہے۔ کسی دوکان والے سے ''سری'' کا بھاؤ پوچھیں تو وہ اُلٹا سوال کرتا ہے

''باؤ جی! سری عام چاہئے یا حافظوں کی؟''

انجان آدمی تو بوکھلا جاتا ہے کہ مَیں سری کی قیمت پوچھ رہا ہوں اور یہ حافظوں کی ''سریوں'' کی بات کر رہا ہے۔۔۔ دوکاندار کا اصل مطلب اِس بات سے ہوتا ہے کہ مال کوالٹی کا چاہئے یا ناقص؟ کوالٹی کے مال سے اُس کا مطلب مذبح خانے میں ذبح کی جانے والی چیز سے ہوتا ہے۔ یعنی بکرا، چھترا وغیرہ اور ناقص مال سے مراد وہ چھوٹی چھوٹی سریاں ہوتی ہیں جو ٹیڈی بکروں کی ہوتی ہیں کہ جن کے لمبے لمبے پہاڑی بال اُن کے جسموں سے الگ کر دیں تو اندر سے بکرے کا ایکسرے نکل آئے۔ اِن کی قیمت کم ہوتی ہے۔ ایک تو ویسے ہی دُولے شاہ کے چوہے جیسے سر ہوتے ہیں، اوپر سے حافظ صاحبان بھاگتے چور کی لنگوٹی کی طرح اُنہیں اونے پونے بیچ جاتے ہیں۔

اِن حافظ صاحبان کے بہت سے لطیفے زبان زدِ عام ہیں لیکن ایک لطیفہ تو بہت مشہور ہے۔ لیجئے، آپ بھی سنئے۔

عموماً لوگوں کے گھروں میں یہ ختم پڑھنے کے لئے جھتے کی شکل میں جاتے ہیں۔ جہاں جہاں سے آڈر آتا ہے، وہیں وہیں بڑے حافظ صاحب ٹیمیں بنا بنا کر بھیجتے جاتے ہیں۔ ایک بار کرنا خدا کا یہ ہوا کہ ایک حافظ صاحب جو تازہ تازہ آج کل میں گاؤں سے مدرسے میں داخل ہوئے تھے، وہ جائے ضرورت پر ضرورت سے زیادہ ہی بیٹھے رہے اور تب نکلے جب تمام ٹیمیں روانہ ہو چکی تھیں۔ اتفاق سے اُسی وقت ایک صاحب تشریف لائے اور فرمانے لگے کہ فلاں جگہ ختم شریف کی محفل ہے، وہاں حافظوں کا ٹولہ بھیج دیجئے۔ حافظ صاحب نے کہا کہ جناب! سارے حافظ صاحب محافل پڑھنے جا چکے ہیں، میرے سوا مدرسے میں اور کوئی نہیں ہے تو یہ نووارد حافظ صاحب پکارے۔

''مَیں ہوں نا!''

دعوت پہنچانے والے صاحب نے کہا۔ ''چلئے، اِن حافظ صاحب کو ہی بھیج دیجئے۔''

''لیکن یہ نام کے حافظ ہیں، آتا اِن کو کچھ بھی نہیں۔'' بڑے حافظ جی نے کہا۔

''کوئی بات نہیں مَیں کسی مولوی کا بندوبست کر لوں گا۔ آپ اِنہیں ضرور بھیج دیجئے گا، برکت ہو جائے گی۔'' وہ صاحب عرض کرتے ہوئے بولے۔

''اچھا کوئی آتا ہے تو بھجواتا ہوں۔''

وہ صاحب چلے گئے تو تھوڑی دیر بعد ایک دوکاندار تشریف لائے حافظ جی کہنے لگے۔

''بھائی! اچھا کھانا کھانے کو جی چاہتا ہو تو فلاں جگہ ہمارے حافظ صاحب کے ساتھ چلے جاؤ۔ اُن صاحب نے فوراً حامی بھر لی، حافظ صاحب کا ہاتھ پکڑا اور چل دیئے۔

گاؤں سے آئے حافظ صاحب نہایت گھبرائے ہوئے تھے، کہیں جانے کا یہ اُن کا پہلا چانس تھا۔ آخر کار اُنہوں نے اپنی گھبراہٹ کو زبان دے اور اپنے ساتھی کو کہنے لگے۔

''بھائی! مجھے نہیں معلوم کہ کیا ہوتا ہے، بس اتنا معلوم ہے کہ کھانا بھی سب لوگ کھاتے ہیں۔ مَیں اندھا ہوں، مجھے کیسے معلوم ہو گا کہ کھانا شروع ہو گیا ہے۔ پیارے بھائی! تم ایسے کرنا کہ جب کھانا شروع ہونے لگے تو میری پسلیوں میں کہنی مار دینا مَیں سمجھ جاؤں گا کہ کھانا شروع ہو گیا ہے۔ دوکاندار ساتھی نے کہا۔ ''حافظ جی! فکر نہ کریں مَیں ایسے ہی کروں گا۔''

الغرض دونوں محفل میں جا کر بیٹھ گئے۔ سب لوگ ایک دائرے میں بیٹھے ہوئے تھے، درمیان میں مختلف پراتوں میں پھل اور کھانا لگا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد محفل کا آغاز ہو گیا۔ تلاوت کے بعد نعت شریف ہوئی، پھر ایک مولانا نے پانچ دس منٹ وعظ کیا۔ اُن کا وعظ ختم ہوا تو محفل کروانے والے صاحب نے ایک مولانا کو اشارہ کیا کہ وہ آگے آ کر کچھ

دعظ فرمائیں۔ شومئی قسمت' وہ مولانا صاحب اُن حافظ صاحب اور دوکاندار کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ آگے جانے کے لئے اُنہوں نے اِن دونوں کو پھلانگا تو اُن کا پاؤں دوکاندار کے بازو پر لگا اور نتیجے میں دوکاندار کی کہنی حافظ صاحب کی پسلیوں میں جا لگی۔ حافظ صاحب سمجھے کہ شاید کھانا شروع ہو گیا ہے اور دوکاندار نے کہنی اِسی لئے ماری ہے۔ حافظ جی نے ہاتھ آگے بڑھا کر ٹٹولا تو کیلوں کی پرات اُن کے ہاتھ لگ گئی۔ اُنہوں نے اُسے اپنی طرف گھسیٹا اور کیلے کے چھلکے اُتار کر اُن سے انصاف کرنے لگے۔ ساری محفل کا مرکزِ نگاہ اب وہی تھے۔ دوکاندار نے جو یہ دیکھا تو اُنہیں بجائے ہاتھ یا زبان سے منع کرنے کے کہنی چبھو کر منع کرنے کی کوشش کی۔ اُدھر حافظ صاحب سمجھے کہ کہنی دوبارہ چبھونے کا مطلب یہ ہے کہ اور تیزی سے کھاؤ۔ اُنہوں نے اپنی سپیڈ اور تیز کر لی۔ دوست نے دوبارہ ایک کی بجائے دو کہنیاں اکٹھی رسید کیں کہ منع ہو جاؤ۔ حافظ جی سمجھے کہ دوست کا مطلب یہ ہے کہ سامنے کی بجائے اِردگرد سے بھی کھاؤ۔ اُنہوں نے فوراً دائیں بائیں لمبے لمبے ہاتھ کر کے سیب' امرود اور چاول کے برتن اپنے قریب کر کے اُنہیں کھانا شروع کر دیا۔ دوکاندار دوست نے اب کی بار نہایت زور سے دو تین کہنیاں رسید کیں۔ حافظ جی سمجھے کہ اتنی زور سے کہنیاں رسید کرنے کا مطلب یہی ہے کہ لوگ زیادہ ہیں' جتنا زیادہ اور جتنی جلدی کھا سکتے ہو کھالو۔ حافظ جی کا منہ اور ہاتھ مشین بن گئے۔

دوکاندار دوست نے جو یہ حال دیکھا تو اکٹھی چار پانچ کہنیاں حافظ جی کو ٹکا دیں۔ اِسی دوران اُن کی حرکت پر محفل میں کچھ شور سا ہوا۔ حافظ جی سمجھے کہ دوست کا مطلب یہ ہے کہ حافظ جی! اور تیز اور تیز۔ حافظ جی نے مرغ پلاؤ کی پرات کو ایک ہاتھ سے پکڑ کر دوسرے سے پلاؤ کھانا شروع کر دیا کہ مبادا کوئی اُن کے سامنے سے پلاؤ کی پرات ہی اُٹھا کر نہ لے جائے۔ شومئی قسمت' اُسی وقت ''صدرِ محفل'' نے اُسی پرات کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ اب ایک طرف سے صدرِ محفل پرات اپنی طرف کھینچ رہے اور دوسری طرف سے حافظ جی ''ابھی نہیں تو کبھی نہیں' پر عمل پیرا اپنی طرف زور لگا رہے ہیں اور ساتھ مَیں چیخ رہے ہیں۔

''اوئے نئیں ---اوئے نئیں ---''

اصل میں حافظ جی اِس گمان میں پڑ گئے کہ کوئی اُن سے پرات چھین کر خود جان بنانا چاہتا ہے۔ دوکاندار دوست نے پہلے بیچارگی سے صدرِ محفل کو دیکھا' پھر دَم بخود حاضرین محفل کو' پھر حافظ صاحب کی پسلیوں میں زوردار کہنی رسید کرتے ہوئے چیخا۔

''حافظ جی!''

حافظ جی سمجھے کہ دوست اِس لئے چیخا ہے کہ ہر طرف آپا دھاپی مچ گئی ہے' ہر چیز پر قبضہ جما لو۔ حافظ جی فوراً اپنے سامنے موجود برتنوں اور پراتوں پر لیٹ گئے اور بازو پھیلا پھیلا کر تمام چیزوں کو اُس کے حصار میں لینے لگے۔ یہ ماجرا دیکھ کر دو چار اور لوگ حافظ صاحب کی طرف بڑھے۔ اِدھر اُنہوں نے حافظ جی کو اُٹھانے کی کوشش کی' اُدھر حافظ جی سمجھے کہ چیزوں کو لینے کے لئے چھینا جھپٹی شروع ہو گئی ہے تبھی تو لوگ اُنہیں پکڑ کر چیزوں سے دھکیل رہے ہیں۔ وہ فوراً حلق پھاڑ پھاڑ کر چلانے لگے۔

''اوئے' لٹ پہ گئی جے--- اوئے' لٹ پہ گئی جے'' (یعنی چھینا جھپٹی شروع ہو گئی)

جتنا زیادہ لوگ حافظ جی کو پکڑنے کی کوشش کرتے' وہ اتنا ہی شور مچاتے ہوئے سارے فرش پر لڑھکنیاں لگاتے۔ اب حال یہ تھا کہ امرود' مالٹے' کیلے' سیب ایک دوسرے کے ساتھ بلیئرڈ کھیل رہے تھے' چاول اور شوربہ کسی کے ملائے بنا ہی شیر و شکر ہو کر سارے کمرے میں موج مستی کر رہے تھے۔ رہی ''فیرنی'' تو وہ ہر کسی کے حضور فریادی بن کر فریاد کر رہی تھی کہ---

او دیکھنے والے! دیکھ کے چل
ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں

اور ہمارے حافظ جی مسلسل چلائے جا رہے تھے۔

''اوئے لٹ پہ گئی جے---اوئے لٹ پہ گئی جے---''

واپسی پر حافظ جی خود اور اُن کے کپڑے پکاسو آرٹ بنے ہوئے تھے۔ حافظ جی دوکاندار سے پوچھنے لگے۔

''کیوں بھئی' کچھ کھایا پیا بھی کہ نہیں؟''

دوکاندار نے دانت کچکچائے اور بولا۔ ''زہر کھایا تھا۔''

حافظ جی نہایت معصومیت سے بولے۔ ''بھئی' تمہیں کھانے کو کیا ملتا' اُدھر لٹ جو پڑ گئی تھی۔''

☆☆

ہمارا شہر گوجرانوالہ تین چیزوں میں نہایت مشہور ہے۔ گندگی' پہلوانی اور بدمعاشی۔ یہ اِس شہر کا ٹریڈ مارک ہیں۔ کئی سال پہلے عالمی سروے ٹیم نے ایشیا کے پہلے دس بڑے گندے شہروں میں اِسے ''گولڈ میڈل' اور ''سندِ امتیاز'' سے نوازا تھا۔ اہل گوجرانوالہ نے اِس پر بھی بغلیں بجائیں اور گولے چھوڑے تھے کہ---

''بدنام گر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا''

شہر کا کوئی محلّہ' گلی' بازار ایسا نہیں جہاں اہل علاقہ نے اپنے فرمودات دیواروں کی زینت نہ بنائے ہوں۔ مثلاً ''یہاں کوڑا کرکٹ

مت پھینکیں''---''بندے دا پتر بن جا ئیں تے میرے کولوں گھسن کھا ئیں گا'' (یہے کوڑے کی ڈھیری لگتی ہوتی ہے)---''دیکھو گدھا پیشاب کر رہا ہے'' (یہے ایک اِنسان کا بچہ گردن اِدھر اُدھر گھما کر یہ دیکھ رہا ہے کہ گدھا کہاں پیشاب کر رہا ہے)--- براہ مہربانی کوڑا یہاں پھینکیں'' (یہے جگہ صاف ہوتی ہے اور کوڑا دس گز دور پڑا ہوتا ہے)

یہ چند صاف ستھری مثالیں ہیں ورنہ ایسے ایسے فقرے لکھے ہوتے ہیں کہ خود لکھنے والا بھی بعد میں اِنہیں پڑھ کر شرما جاتا ہے۔ شہر کی بلدیہ کا ہر ''چوہدری'' یہ اعلان کرنا اپنے فرائض منصبی خیال کرتا ہے کہ 'مئیں گوجرانوالہ کو پیرس بنا دوں گا''--- ہمارے خیال میں یہ اعلان اس لئے شرمندہ تعبیر نہیں ہوا کہ ہمارا شہر ''بیچ'' (Beach) جیسی نعمت سے محروم ہے اور پورے شہر کو اُٹھا کر ساحل سمندر کے کنارے لے جانا ناممکن۔

وہ دَور لد گیا' جب شہ زور اکھاڑوں میں رقص کیا کرتے تھے' جب ہر ہفتے کسی نہ کسی اکھاڑے میں دنگل ہوتا تھا۔ پہلوان ریشمی لاچے کرتے پہن اوپر سے پگڑی باندھ کر ڈھول کی تھاپ پر لوگوں کو ناچ ناچ کر اور اُچھل اُچھل کر سلامی دیتے اکھاڑے کو جاتے تھے۔ پانچ بندوں کا کھانا کھا کر ڈکار مارتے۔

صبح شام اکھاڑے میں پہلوان آپس میں زور آزمائی کرتے اور ہم جیسے تھوڑ دِلے جوق در جوق اُن کا زور دیکھتے کہ ہمارے لئے یہ ہی ورزش ہوتی تھی۔ اتنا سانس تو پہلوانوں کا ایک دوسرے کو رگیدتے ہوئے نہ پھولتا جتنا ہم جیسوں کا دیکھتے ہوئے پھول جاتا تھا--- یہ سب تو اب گئی رُتوں کی بات ہوگئی ہے۔ سب خواب وخیال لگتا ہے۔ جو اکھاڑے اپنے دَم قدم سے آباد تھے۔ اب اُن میں سے جو چند بچے ہیں' وہ حکومتی امداد کی اپیلیں ہی کرتے رہتے ہیں۔ اِن پہلوانوں کی دیکھا دیکھی عام لوگوں کو بھی کھانے کی ''لت'' پڑ گئی۔ جتنی دو کانیں چڑیوں' بٹیروں کو کوئلوں کی نرم آنچ پر بھون کھانے کی گوجرانوالہ میں ہیں' شاید پورے پاکستان میں نہ ہوں۔ اگر اِن معصوم پرندوں کی آہوں' بددُعاؤں کو خدا نے شرف قبولیت بخش دیا تو یقین واثق ہے کہ جنت میں کوئی گوجرانوالیہ ڈھونڈنے سے بھی نہ ملے گا۔

تیسری مشہور چیز ہمارے شہر کے بدمعاش ہیں۔ جسے چھیڑو وہی نوگزہ نکلتا ہے۔ یار دوست اِسی بات پر ٹھکائی فرما دیتے ہیں کہ اوئے' تو مجھے گھوری ڈال کے کیوں دیکھ رہا تھا؟--- شہر کے بعض علاقے تو بدمعاشی کی نرسریاں ہیں جہاں خاص اِس بات کی تربیت دی جاتی ہے کہ دیکھو کہیں بھولے سے بھی شرافت کا جامہ نہ پہن لینا ورنہ خاندانی عزت کو بٹہ لگ جائے گا۔ اگلا بات کرے تو تم تھپڑ سے جواب دینا' وہ تھپڑ لگائے تو تم گھسن سے کام اور لینا اگر وہ اِسے استعمال کرے تو بے دریغ نیفے سے طمنچہ نکال کر دھائیں سے اُسے جما دینا اور اگر مخالف یہ حرکت پہلے کرنے کا ارادہ کرے تو بیٹا! وہاں سے راکٹ کی رفتار سے بھاگنا کیونکہ چار بندوں کے کندھوں پر سوار ہو کر گھر پہنچنے سے بہتر ہے کہ بندہ اپنی ٹانگوں کو زحمت دے۔

بدقسمتی سے ہمارے شہر کی کشمیری برادری اِس معاملے میں سب سے آگے ہیں۔ بندہ بدمعاش ہوا اور اوپر سے بٹ بھی ہو تو سونے پہ سہاگہ ہوتا ہے۔ بٹ برادری میں شریف ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے' اگر کوئی ملے تو بعد میں پتہ چلتا ہے کہ اِس کا تو نام شریف ہے ورنہ تو یہ بھی اُسی پیر کا مرید ہے جس کے دوسرے بٹ صاحبان مرید ہیں--- لوگ بٹ صاحبان سے کتنے متاثر ہیں' اِس کی مثال عطاء الحق قاسمی صاحب دے چکے ہیں کہ ایک شخص کا کسی سے جھگڑا ہو گیا۔ دوران فساد وہ شخص مخالف کو دھمکی لگاتے ہوئے کہنے لگا۔

''اوئے' کسی بھول میں نہ رہنا'' ہم سات بھائی ہیں۔''

دوسرا شخص بولا۔ ''تو پھر مئیں کیا کروں؟''

تو وہ سینہ تان کر بولا۔ ''اُن میں سے ایک بٹ بھی ہے۔''

ابھی پرسوں ہی ہمارے ایک دوست جو پراپرٹی ڈیلر ہیں' اپنے کاروباری راز افشاء کرتے ہوئے فرمانے لگے کہ جس گھر کے ساتھ پچھواڑے یا سامنے مسجد ہو یا جس گھر کے ساتھ پچھواڑے یا سامنے کسی بٹ صاحب کا گھر ہو' اُس مکان کی قیمت آدھی رہ جاتی ہے۔ لوگ نہ ''شرافت'' کی ہمسائیگی میں رہنا پسند کرتے ہیں' نہ بدمعاشی کی--- اصل میں بدمعاش ایک بار ہی بدمعاشی دِکھاتے ہیں' باقی عمر کی بدمعاشی اُس پہلی بدمعاشی کے طفیل خود بخود ہوتی رہتی ہے۔ یہ لوگ ہی ہوتے ہیں جو بعد میں اُس کے قتل' ڈکیتیوں اور لڑائیوں میں خود ہی نمک مرچ لگا کر اضافہ کرتے رہتے ہیں جیسے ہمارے شہر کے کئی نامی گرامی پہلوان اِنہی گل افشانیوں کی بدولت ''جنوں'' سے کشتی لڑنے اور بعد میں اُس کے منہ سے جن ہونے کا اقرار سن کر آٹھ دِن تک بیہوش رہنے کا اعزاز حاصل کر چکے ہیں یا یوں سمجھ لیجئے کہ جس طرح کسی شاعر سے دو چار غزلیں معرکے کی ہو جائیں تو باقی عمر وہ اُنہیں ہی مشاعروں میں سنا سنا کر گھر کی دال روٹی چلاتا رہتا ہے۔ اِسی طرح بدمعاش لوگ بناتے ہیں ورنہ بدمعاش کے بھی دو ہاتھ اور دو پاؤں ہوتے ہیں' اُس کو کوئی سرخاب کے پر نہیں لگے ہوتے۔ بدمعاش صاحب تو ایک شہر سے دوسرے شہر جائیں تو کوئی ٹی بی کا مارا شخص بھی سینہ ٹھونک کر کہتا ہے۔

''اوئے' توں بدمعاش ہوگا تو اپنے گھر ہوگا مئیں تو آپ بڑا وڈا

بدمعاش آں۔"

چلیئے لگے ہاتھوں ایک دِلچسپ واقعہ یا مثال بھی سن لیجیے۔

ہمارے شہر کے ایک نامور بدمعاش جو آج بھی بدمعاشی میں اتھارٹی سمجھے جاتے ہیں حالانکہ اُن کو مرے ہوئے بھی بیس پچیس سال ہونے کو آئے ہیں اور جن کے نام پر ایک مشہور پنجابی فلم بھی بن چکی ہے، وہ اکیلے اکیلے، یعنی اپنے چمچوں کڑچھوں کے بغیر بازار میں دائیں بائیں پھیلے اکڑ اکڑ کر چل رہے تھے کہ سامنے سے آتے ایک دیہاتی سے کندھا ٹکرا گیا۔ موصوف فوراً پلٹے اُسے گردن سے پکڑا اور غرائے۔

"اوئے، توں مینوں نئیں جاندا؟"

دیہاتی بھی ترکی بہ ترکی جوب دیتے ہوئے بولا۔"اوئے، توں وی مینوں نئیں جاندا۔"

پہلے تو منہ کی توپوں سے گالیوں، دھمکیوں کے گولے چھوٹے پھر بات "زلف کے سر ہونے تک پہنچی" اب کبھی بدمعاش صاحب مٹی چاٹ رہے ہوتے اور کبھی دیہاتی۔ جلد ہی دیہاتی کا پلہ بھاری ہونا شروع ہو گیا کیونکہ وہ تھا تو سوکھا سڑا لیکن کھیتوں میں کام کرتے کرتے، ڈھور ڈنگروں کو چارہ ڈالتے اور سر پر دو دو من وزنی چارے کی گانٹھیں اُٹھاتے اُٹھاتے وہ خاصا پھرتیلا ہو چکا تھا اِدھر اپنے بدمعاش صاحب سارا دِن تخت پر بیٹھے چمچوں پر حکم چلاتے یا شراب، شباب اور کباب سے لطف اندوز ہوتے چربی کی تہیں تو چڑھوا چکے تھے لیکن اندر سے گھن کھائی ہوئی لکڑی کی مانند ہو چکے تھے پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ محترم نیچے پڑے ہیں اور دیہاتی سینے پر چڑھا یہ کہتے ہوئے کہ "تیری تے میں بدمعاشی کڈاں" دھڑا دھڑ اُنہیں مکے رسید کر رہا ہے۔ جب خود سے جگا ٹیکس وصول کرنے والے کی یوں مٹی پلید ہوتی دیکھی تو اِردگرد سے لوگوں نے چھڑوانے کی کوشش کر دی ایک شخص نے اُس دیہاتی کو کہا۔

"اوئے، توں جاندا نئیں اے کون ہے۔"

"مینوں کیہ پتا کون ہے۔ توں مینوں انج پوچھنا ایں جیویں اے فلاں پہلوان اے۔" دیہاتی تڑخ کر بولا۔ (فلاں پر اُس بدمعاش کا نام لیا)

"پہلوان ای اے۔" اُس شخص نے جواب دیا۔

دیہاتی نے غور سے اپنے نیچے لیٹے شخص کو دیکھا، پھر تصدیق کے لئے اِردگرد دیکھتا ہوا بولا۔ "اوئے اے پہلوان اے؟"

لوگوں نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر وہی لوگ بتاتے ہیں کہ وہ دیہاتی اتنی خوفزدگی کی حالت میں گرتا پڑتا جائے وقوعہ سے فرار ہوا کہ جاتی دفعہ اپنی پگڑی، جوتی اور دھوتی بھی وہیں چھوڑ گیا۔

☆☆

ہمارے دوست بٹ صاحب خدا اُنہیں لمبی حیاتی دے۔ نہایت خوش رُو، خوش دِل، خوش فعال اور خوش خوراک بندے ہیں البتہ جب وہ بندے کو اپنی صاف گوئی کی سان پر رگڑتے ہیں تو بندے کو اپنے اِن بیوقوفانہ خیالات پر بڑی شرمندگی ہوتی ہے لیکن جس طرح وہ صاف گو ہیں، اُس سے زیادہ صاف دِل ہیں۔ آدھ گھنٹہ بےعزتی کرنے کے بعد آدھے منٹ میں معافی مانگ کر دوستی کے حضور سرخرو ہو جاتے ہیں۔ ہمارا حساب اُن کے ساتھ ہم پیالہ اور ہم نوالہ جیسا ہے، وہ الگ بات کہ خالی پیالہ ہمارے حصے میں اور نوالہ اُن کی جاگیر میں آتا ہے---عموماً ہمیں وہ "باتوں میں لگا کر کوچہ عاشقاں" میں لے جاتے ہیں جہاں عاشق بریانی، عاشق سیخ کباب، عاشق روسٹ مرغ و فرائی مچھلی کی دوکانیں ہیں، وہاں بٹ صاحب پیٹ بھرتے ہیں اور ہم بل۔

ہم دونوں ایک دوسرے کے حالات سے الف سے لے کر یے تک آگاہ ہیں بلکہ وہ تو ہمارے حالات و کردار کو مدنظر رکھتے ہوئے، ہمارے مستقبل کے متعلق بھی پیشنگوئی کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ مثلاً دس سال پہلے اُنہوں نے پیشنگوئی کی، فرمانے لگے۔

"شاہ جی! دو چار ماہ بعد ہی آپ پر نہایت بُرا وقت آنے والا ہے۔"

"چار ماہ بعد ہماری شادی ہو گئی۔ ایک دِن فرمانے لگے۔

"شاہ جی! رات کو مَیں نے خواب میں دیکھا کہ آپ کے گھر کوئی بلا اُتری ہوئی ہے۔ مَیں تو شاہ جی رات خواب سے ہی اُٹھ گیا۔ بڑی اللہ توبہ کی، دیکھ لیجیے گا اب ہر بلا آپ سے دُور رہے گی۔ ہم گھر آئے تو بیگم بولیں کہ امی نے آج رہنے کے لئے آنا تھا، وہ نہیں آ رہیں---ایک بار فرمانے لگے۔

"شاہ جی! اِن شاءاللہ آپ بڑی ترقی کی منازل طے کریں گے۔"

اگلے مہینے ہم نے جو مکان کرائے پر لیا، اُس کی دو منزلیں مالک مکان کے زیرِتصرف تھیں ہمیں تیسری منزل کرائے پر ملی اور ہم کامل دو سال تک ترقی کی منازل کا سفر طے کرتے رہے---ایک دفعہ ہمارے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے کلکاری مارتے ہوئے بولے۔

"شاہ جی! اِن شاءاللہ وہ دِن دور نہیں جب آپ بینک میں لمبی رقمیں جمع کروائیں گے۔"

اگلے مہینے ہمیں بجلی، سوئی گیس کے بل چار گناہ زیادہ آئے۔ "کہاں تک سنو گے کہاں تک سنائیں"---لیکن اِس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ہمیں ہی نشانے پر رکھتے ہیں۔ اپنی ذات کو بھی معافی دینے کے

روادار نہیں۔ باتوں میں کسی کو چوٹ کر کے جتنا خوش ہوتے ہیں' اتنا ہی خود پر طنز کے تیر برسا کر خوش ہوتے ہیں۔ اُن کی زندہ دِلی کی چند مثالیں عرض ہیں۔

ایک بار پاکستان میں غربت سے بات ہوتی ہوئی خود ہم دونوں کی غربت پر آ ٹھہری' فرمانے لگے۔

''ابرار بھائی! بچپن میں بڑی غربت اور تنگدستی دیکھی ہے۔ سال میں دو چار بار ہی گوشت اور ہنڈیا کا ملاپ ہوتا اور جب کھانے کی باری آتی تو ایک بوٹی میں دو دو حصہ دار ہوتے البتہ بڑی عید کو ہنڈیا کو بھی اُپھارہ ہو جاتا۔ والد صاحب دو چار دِن پہلے ہی پنساری سے چورن لے آتے' فی بچہ چار چار چٹکیاں چورن والد ہر ایک کو اپنے ہاتھوں سے کھلاتے کہ مبادا سالانہ بدپرہیزی اپنا سایہ نہ ڈال دے--- چورن کھانے کے باوجود بیت الخلاء کا دروازہ کامل ایک ہفتہ تک متواتر ''چوں چاں'' ہی کرتا رہتا۔ والدہ نے گھر میں مرغیاں پال رکھیں تھیں جو کھاتی ہمارا تھیں اور کٹکٹاتی دوسروں کے گھروں میں تھیں۔ ہم بھائی سکول سے آتے تو ہم دوسروں کے گھروں اور کوٹھوں سے اپنے انڈے ہی ڈھونڈتے رہتے اور سکول کا کام وہیں رہ جاتا۔ نتیجہ یہ نکلتا کہ صبح والدہ انڈے کھلاتی اور ماسٹر جی ڈنڈے کھلاتے--- اِنہی مرغیوں میں سے اگر کوئی بیمار ہو جاتی تو ہماری عید ہو جاتی۔ خود تو ناتواں ہو کر گر جاتی لیکن جاتے جاتے ہمارے ناتواں جسموں کو توانائی دے جاتی۔ ایک دفعہ کئی ماہ تک مرغی بیمار نہ ہوئی تو چھوٹا بھائی معصومیت سے والدہ سے پوچھنے لگا کہ امی جی! مرغی کیسے بیمار ہوتی ہے؟

☆☆

ایک بار بات ہمارے لکھنے لکھانے سے ہوتی ہوئی شعر و شاعری تک جا پہنچی' فرمانے لگے۔

''شاہ جی! مَیں نے تو بچپن میں ہی اِس سے جان چھڑوالی تھی بلکہ چھڑوا کہاں سے لی' کسی نے چھڑوادی تھی۔''

''وہ کیسے؟'' ہم نے پوچھا۔

فرمانے لگے۔ ''ساتویں یا آٹھویں کلاس میں تھا کہ کہیں سے یہ شعر سن یا پڑھ لیا کہ---

اُٹھو' میری دُنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امراء کے در و دیوار ہلا دو

اب دِن رات یہ شعر دماغ پر سوار ہے۔ اُٹھتے بیٹھتے شعر پڑھا جا رہا ہے بلکہ پورا شعر بھی کہاں' صرف پہلا مصرعہ۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ابھی تک دوسرے شعر کا مطلب نہیں معلوم---'' پھر ایک ثانیے کے لئے رُکتے ہوئے بولے۔ ''ویسے یہ ''کاخ'' کس بلا کا نام ہے؟''

ہم گڑبڑا سے گئے۔ بہتیرا زور مارا لیکن ''کاخ'' کا مطلب سر میں نہ آیا تو ہم نے اُنہیں مخاطب کر کے کہا۔

''بٹ جی! اصل لفظ خاک ہوگا' آپ نے کاخ غلطی سے پڑھ لیا ہوگا۔''

لیکن جب اُنہوں نے ''کاخ'' پر ہی زور دیا کہ یہی لفظ تھا تو ہم نے اپنی علیمت کا بھانڈا پھوٹتے دیکھ کر کہا۔

''بٹ جی! اپنی بات مکمل کریں۔ ''کاخ'' اور ''خاک'' دونوں پر مٹی ڈالیں۔''

''اچھا---'' اُنہوں نے ایسی نظروں سے ہمیں دیکھتے ہوئے کہا جیسے سب سمجھ گئے ہوں۔ بٹ جی سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولے۔ ''ایک رات جب سب سو رہے تھے اور مَیں اِس شعر کو زیرلب دوہرا رہا تھا اور اِس کے مطلب کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش میں تھا کہ میرے ذہن میں جھما کا سا ہوا کہ اُٹھ کر غریبوں کو جگانا تو بہت آسان کام ہے--- اپنی جھلنگا چارپائی سے قدم نیچے رکھے۔ اماں' ابا کی چارپائیوں کے سرہانے کھڑا ہو کر اِن ''گھراڑے'' (خراٹے) مارتے غریبوں کو پہلے غور سے دیکھا اور پھر کبھی اماں کو اور کبھی ابا کو جھنجھوڑ کر اُٹھانے لگا کہ اماں اُٹھ جاؤ' ابا اُٹھ جاؤ' اماں اُٹھ جاؤ' ابا اُٹھ جاؤ۔ اماں ابا کے ساتھ ساتھ سارا محلّہ بھی میرے شور شرابے کی بدولت اُٹھ گیا پھر جو میرے اماں ابا نے میری ''مادر پدر'' آزاد دھلائی کی ہے تو مَیں خود چار دِن تک چارپائی سے نہیں اُٹھ سکا۔''

☆☆

وطن عزیز میں جس طرح دہشت گردی' اِنتہاپسندی اور فرقہ واریت نے اپنے نوکیلے پنجے گاڑے ہیں' الامان۔ ایک دِن ہم دونوں کے درمیان اِسی موضوع پر بات ہو رہی تھی۔ ہم نے ایک تازہ حادثے کی طرف اُن کی توجہ دلاتے ہوئے کہا۔

''بٹ صاحب! ابھی کچھ دِن پہلے سیالکوٹ کی ایک مسجد میں بم دھماکے سے چودہ نمازی ہلاک اور تیس زخمی ہو گئے۔''

موصوف اطمینان سے بولے۔ ''اِسی لئے تو مَیں ایسے خطرناک کام سرانجام ہی نہیں دیتا جس میں جان یا ٹانگ جانے کا خدشہ ہو۔''

☆☆

ایک دِن ہم دونوں جی ٹی روڈ سے گزر رہے تھے کہ ٹریفک پولیس نے روک لیا۔ بٹ صاحب کے پاس موٹرسائیکل کے کاغذات بالکل مکمل تھے لیکن پولیس والے چھوڑنے پر راضی نہ تھے' کوئی نہ کوئی اعتراض لگا

رہے تھے۔ آخر بٹ صاحب نے پچاس کا نوٹ اپنی مٹھی سے پولیس والے کی مٹھی میں منتقل کیا تو سارے اعتراضات چٹکی میں ہوا ہو گئے۔ جب ہم دوبارہ وہاں سے سوار ہو کر چلے تو ہم نے پوچھا۔

"بٹ صاحب! یہ کیا تھا؟"

منہ بنا کر بولے۔ "یہ قانون کی حکمرانی تھی۔"

☆☆

بٹ صاحب بلا کے فقرہ باز اور برجستہ واقعہ ہوئے ہیں اور بعض دفعہ تو خود پر بھی تیکھے وار کرنے سے نہیں چوکتے۔ ایک دِن ہم نے اُن کے تیزی سے کم ہوتے بالوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"بٹ جی! آپ کے سر پر تو بڑی تیزی سے گنج نمودار ہو رہا' آخر اس کی کیا وجہ ہے؟"

"اس کی وجہ رنج ہے۔" اُنہوں نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"رنج ---؟" ہم نے حیرانی سے کہا۔

"جی ہاں' وہی رنج جس کے متعلق بڑے بوڑھے فرما گئے ہیں کہ "گنج بغیر رنج کے نہیں ملتا۔"

☆☆

عید کے دِن تھے۔ ہم نے بٹ صاحب سے پوچھا۔

"بٹ جی! کبھی بکرا' لیلا بھی کر لیا کریں۔ ہر بار کٹا' بچھڑا ہی لیتے ہیں۔"

فرمانے لگے۔ "بھولے بادشاہو! آپ کو تو علم ہے کہ قربانی کی سواری پر بیٹھ کر ہی پل صراط پار کرنا ہوگا۔ دُنیا میں ہی کوئی چھوٹا جانور میرا وزن نہیں سہار سکا۔ جس پر بطور امتحان سواری گانٹھی' اسی کا پیٹ خاک چاٹنے لگا (یاد رہے بٹ صاحب تقریباً سو کلو کے اِرد گرد ہیں) پل صراط پر تو میرے ساتھ میرے گناہوں کا بھی بھاری بھرکم گٹھڑ ہوگا۔ بڑے جانور کی اِس لئے قربانی کرتا ہوں کہ وہ آسانی سے مجھے گناہوں سمیت پل صراط کے دوسرے کنارے پر پہنچا دے گا بلکہ مَیں نے تو اماں ابا کے نام کی قربانی بھی کبھی نہیں کی کہ وہ اُنہیں بھی گناہوں کی پوٹلیوں سمیت کھینچ کھانچ کر لے جائے گا۔"

☆☆

ایک دِن دوران گفتگو بت کنجوسی' تھوڑدِلی اور دریادِلی کی ہونے لگی۔ ہمارے منہ سے شاید کوئی فقرہ ایسا نکل گیا جو اُن کی طبع نازک پر گراں گزرا' فوراً منہ بناتے اور ناک سکوڑتے ہوئے بولے۔

"اجی' آپ جیسے تھوڑدِلے کے تو رات خواب میں پچاس روپے گم ہو جائیں تو صبح اُٹھ کر منہ لٹکائے بیگم سے کہہ رہے ہوتے ہیں کہ بیگم! رات سوتے سوتے ہی پچاس روپے کی "ہٹیک" (بے فائدہ رقم کا ضا ہونا) پڑ گئی۔" بیگم بھی ماشاءاللہ ساتھ رہتے رہتے "الاماشاءاللہ" ہو چکی ہو ہے' غمگین صورت بنا کر کہتی ہے کہ ہاں جی' اتنی بڑی رقم ضائع نہ ہوتی کئی کام سنور جاتے۔

ہم نے پوچھا۔ "اور آپ جیسے دریادِل؟"

فرمانے لگے۔ "ہمارے جیسے دریادِل کا خواب میں پانچ کروڑ انعام نکل آئے تو صبح صبح بیگم کو اُترے منہ سے کہہ رہے ہوتے ہیں کہ بیگم رات پانچ کروڑ کا انعام نکلا۔ لوکر لو گل' اِس سے بھلا خرچ چلتے ہیں' کم ا کم دس کروڑ کا تو نکلتا۔"

بٹ صاحب کے ہاں روپے پیسے کی ریل پیل ہے اور ہمار یہاں پیسے کی دھکم پیل ہے' وہ اِس لئے کہ ایک روپے کے ٹھپے سے لے کر ہزار کے نوٹ تک ہر کسی کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ سب سے پہلے ہمار گھر کے دروازے سے باہر ہو--- اپنی دولت مندی اور کامیابی کو و قسمت کی بجائے اپنی عقلمندی کا مرہونِ منت جانتے ہیں اور ہماری غربت کا سبب وہ ہماری کوڑھ مغزی کو گردانتے ہیں۔ ایک دِن جب و ہماری عقل کے پیچھے لٹھ لے کر پڑ گئے تو ہم نے کہا۔

"بتائیے کہ وہ کون سا ایسا کام ہوگا کہ جہاں ہماری بے عقلی اور آپ کی عقلمندی کا پتہ چلے گا؟"

اُنہوں نے کچھ دیر سوچنے میں لگائی اور بولے۔ "آپ نے اکث دیکھا ہوگا کہ لوکل بس سٹاپ پر کبھی نہیں اُتارتی' آپ عین سٹاپ پ اُترنے کے لئے کیا کریں گے؟"

ہم نے کہا۔ "کرنا کیا ہے' جب سٹاپ آئے گا تو ہم شور مچا کر' بس کی باڈی تھپتھپا کر ڈرائیور کو رُکنے کا کہیں گے۔"

ہمارکوتاہ عقلی پر ماتم کرتے ہوئے بولے۔ "عین وقت پر یہ مظاہ کس کام آئے گا بس رُکتے رُکتے بھی ایک سٹاپ آگے نکل جائے گی؟"

ہم نے جان چھڑوانے اور اُن کی عقل کا امتحان لینے کے ل پوچھا۔ "آپ بتائیں' آپ کون سی عقل لڑائیں گے؟"

طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے بولے۔ "عقل کی باتیں عقل والوں ک "بدھی" میں ہی آتی ہیں' شاہ جی! مَیں اپنے سٹاپ سے ایک سٹاپ پہل ہی اُتر جاؤں گا تاکہ بس میرے سٹاپ سے مجھے ایک سٹاپ آگے نہ اُتا دے--- اب پتہ چلا عقل اور بے عقلی میں کیا فرق ہے؟"

ہم نے ٹھنڈی آہ بھر کر اُن کی عقل کے پردے کو ہٹا کر اُن کی عقل ک یہ کہتے ہوئے سلام داغا۔

"کوئی ہتلاؤ کہ ہم ہتلائیں کیا"

پیلا مہر لال

☆ ریاض الحسن

) پھتو: (فتح محمد) ایک دس بارہ سال کا
یہاتی لڑکا۔
۲) فضلو: (فضل کریم) پھتو کا باپ۔ ایک
ادہ لوح دیہاتی۔
۳) ماں: پھتو کی ماں۔ جس کی سمجھ میں عام
ورتوں کی طرح کوئی بات نہیں آتی۔
۴) دادا: پھتو کا دادا۔ حقہ کا شوقین۔ زمانہ کا
رم سرد دیکھے ہوئے۔ عینک ناک کی نوک پر
کتا ہے اور عموماً شیشوں کے اوپر سے دیکھتا
ہے۔
۵) دادی: پھتو کی دادی۔ جو سمجھتی ہے کہ دنیا
ں اس سے زیادہ عقلمند اور کوئی نہیں۔ ہر بات
و جنوں بھوتوں کی کارستانی سمجھتی ہے۔
ظر: ایک دیہاتی مکان کے صحن کا منظر۔ صحن
ں ایک طرف بھوسہ کا ڈھیر لگا ہے۔ صدر
رواز ے سے ذرا ہٹ کر کونے میں ایک چھپر
کے نیچے چولہا بنا ہے۔ پاس ہی ایک پیڑھی' چند
دھ جلی لکڑیاں' چمٹا پھونکنی' دو چار دیگچیاں اور
وسرے برتن پڑے ہیں ایک تختہ پر جو دیوار
ں لگا ہے چند ڈبے رکھے ہیں۔ باورچی خانہ
کے ساتھ ہی ایک لکڑی کے اسٹینڈ پر دو تین
گھڑے رکھے ہیں۔ قریب ہی ایک گلاس پڑا
ہے دائیں ہاتھ کو برآمدہ ہے جس میں دونوں
ونوں پر دو چار پائیاں پڑی ہیں۔ ساتھ ایک
ق میں چراغ رکھا ہے۔ برآمدے یں دو
دواز ے ہیں جو اندر کمروں میں کھلتے ہیں لیکن
الحال بند ہیں۔ صحن میں بھی ایک چارپائی

کھڑی ہے اور اس پر ایک آدھ کپڑا پڑا ہے۔ ایک آدھ ٹوکرا بھی صحن میں پڑا ہے جو رات کو مرغیاں بند کرنے کے کام آتا ہے۔ شام کا وقت ہے۔ پردہ اٹھنے پر ماں چولہے کے پاس آٹا گوندھتی اور دادا سامنے والی چارپائی پر بیٹھا حقہ پیتا نظر آتا ہے۔ پھتو دروازے کے دوسری طرف بنی ہوئی ناند میں بھوسہ ڈال رہا ہے۔ باپ صدر دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتا ہے۔ چہرے پر پریشانی اور الجھن کے آثار ہویدا ہیں۔

دادا: (حقہ کا کش لے کر ہولے ہولے کھانستے ہوئے) کیا بات ہے فضلو آج چوپال سے جلدی کیسے واپس آ گیا۔ کیا کسی بات پر واک آؤٹ کر آیا ہے۔

فضلو: کچھ نہیں ابا۔ آج تو سمجھو سب ہی واک آؤٹ کر گئے چوپال سونی پڑی ہے۔

پھتو: (ہاتھوں کو قمیض سے رگڑ کر پونچھتے ہوئے) ابا وہ شمو اور ممدو کہہ رہے تھے کہ---

فضلو: (ڈانٹتے ہوئے) ابے تو اپنی ٹرٹر بند رکھ۔ نہ موقع دیکھتا ہے نہ محل خرب اختلاف کی طرح بولے چلا جاتا ہے چاہے کوئی سنے چاہے نہ سنے۔

دادی: (کمرے سے باہر نکلتے ہوئے) کیا بات ہے فضلو جو یوں گرج رہا ہے۔

فضلو ہاتھ ملتے ہوئے اپنے باپ کی چارپائی کے پائتی ٹک جاتا ہے۔ دادا حقہ کے جلدی جلدی کش لگاتے ہوئے عینک کے شیشوں کے اوپر سے سوالیہ نظروں سے دیکھتا ہے۔ ماں بھی آٹے سے لتھڑے ہوئے ہاتھ لئے قریب آ جاتی ہے۔ پھتو بھی ایک پائے کے ساتھ سہا سہا سا کھڑا ہے۔

فضلو: (پیر کے انگوٹھے سے زمین کریدتے ہوئے) بس سمجھ لو ابا اپنے برے دن آ گئے۔

دادا: کیوں' کیا پھر کسی وزیر نے استعفیٰ دے دیا (دادا یہ کہہ کر جلدی جلدی حقہ کے دو چار کش لگاتا ہے۔)

دادی: (ہاتھ سے حقہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کبھی تو اس نامراد گڑگڑی کو پرے ہٹا دیا کرو۔ ہر وقت چسنی کی طرح چوستے رہتے ہو۔

دادا: خوب خوب تو گویا اب ہم بچے ہو گئے اور یہ حقہ چسنی' ایں۔ لیکن تمہیں وہ وقت یاد نہیں رہا جب تم کہا کرتی تھیں کہ حقہ تو مرد کا زیور ہے اور چلمیں بھرنا عورت کا فرض۔ لیکن اب---

دادی: (ہاتھ نچاتے ہوئے) اچھا اچھا بس رہنے دو ہر وقت گڑے مردے اکھیڑنے نہ بیٹھ جایا کرو۔

دادا: ابھی مردے دفن ہی کہاں ہوئے ہیں بھاگوان۔ یہ مردے اکیلے دفن نہیں ہو سکتے۔

دادی: توبہ ہے ختم بھی کرو۔ دیکھتے نہیں فضلو کتنا پریشان ہے۔

ماں: (کسی قدر رازدارانہ لہجے میں) کیا اللہ وسائے کی بیٹی دینو کے ساتھ---(جملہ ادھورا چھوڑ دیتی ہے' ایک لمحہ کے بعد پھر کہتی ہے) میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ زمانہ نازک ہے لڑکیوں کو اتنی آزادی نہیں دینا چاہیے اور وہ نمک حرام دینو وہ تو---

باپ: (غصے سے بات کاٹ کر) تمہیں اس دنیا میں اللہ وسائے کی بیٹی کے علاوہ بھی کچھ سوجھتا ہے یا نہیں۔

ماں: (برا ماننے کے انداز میں) کچھ بتاؤ تو پتہ

بھی چلے تم تو پہیلیاں بجھوا رہے ہو۔

باپ: (ٹھنڈی سانس بھر کر) بتاؤں کیا خاک بس سمجھ لو برے دن آ گئے اپنے بھی۔

دادی: اللہ خیر کرے بیٹا کیوں ایسی باتیں زبان سے نکالتا ہے۔

باپ: اللہ نے تو اب تک خیر ہی رکھی تھی اماں پر اب سرکار خیر نہیں رکھنا چاہتی۔ وہ چاہتی ہے کہ شہر والوں کی طرح اب گاؤں والوں کی زندگی بھی حرام ہو جائے۔ کچھ پتہ ہے تمہیں اس گاؤں میں اب اسکول کھلنے والا ہے اسکول۔

ماں، دادا دادی: (کورس کے انداز میں) اسکول۔

دادی: (اوپر کی طرف دیکھتے ہوئے اور ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے) خدایا یہ دن بھی دیکھنا قسمت میں تھے۔

دادا: سرکار کو گاؤں کے لڑکوں کے چھوٹے بال شدید پسند نہیں آئے۔ چوہدری سے کہو کہ ہم لڑکوں کے بال بڑھانے کو ویسے ہی تیار ہیں اس کے لئے اسکول کھولنے کی کیا ضرورت ہے۔

باپ: کیسی بات کرتے ہو۔ صرف بال بڑھانے سے کام نہیں چل سکتا۔ پھولوں والی قمیض اور اونچی ایڑی والے جوتے بھی تو چاہئیں۔ اور اس کے بعد سرخی پوڈر۔

دادا: ارے بابا ہم ان سب باتوں کے لئے بھی تیار ہیں۔ اگر سرکار چاہے تو میں بھی بال بڑھا کر پھولوں والی قمیض پہننے کو تیار ہوں۔

(دادی گھور کر دادا کو دیکھتی ہے)

باپ: چوہدری کہتا تھا جو کوئی اپنے لڑکے کو اسکول نہیں بھیجے گا اسے جیل جانا پڑے گا۔

ماں: میں پوچھتی ہوں آخر جیل اور اسکول میں فرق بھی کیا ہے؟ کیوں نہ پھتو کو اسکول بھیجنے کی بجائے تم کچھ دنوں کے لئے جیل چلے جاؤ۔ آخر زندگی بھر تو وہاں نہیں رہنا ہوگا۔

دادی: کیسی باتیں کرتی ہو بہو۔ جیل جائیں فضلو کے دشمن۔

ماں: (پھتو کو سینے سے چمٹاتے ہوئے) ہائے میرا لعل۔ سب ہی اس کے دشمن ہو گئے ہیں۔

دادا: پہلے تو یہ بتاؤ کب سے کھل رہا ہے یہ اسکول؟

باپ: چوہدری نے تو آج ہی اپنا اصطبل اسکول کے لئے خالی کر دیا ہے۔ کہتا تھا جب سرکار اسکول کی عمارت بنا لے گی تو میں اپنے ڈھور ڈنگر وہاں باندھ لیا کروں گا۔ کل سے ایک ماسٹر بھی آ جائے گا۔

دادا: (حقہ کا طویل کش لگا کر) ہوں۔

دادی: پھر تم نے کیا فیصلہ کیا۔

باپ: اماں میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ پھتو کو اسکول بھیجتا ہوں تو سمجھو ہماری پوری آنے والی نسلیں غارت ہوئیں۔ جیل جاتا ہوں تو یہ خیال ہے کہ پیچھے تم لوگوں کا کیا بنے گا۔

ماں: (جلدی سے) تم ہم لوگوں کی بالکل فکر مت کرو۔ اللہ آخر بے روزگار انجینئروں کو بھی روزی دیتا ہے۔

(باپ گھور کر ماں کو دیکھتا ہے)

دادا: (فکر بھرے انداز میں) اس کا بس ایک ہی حل ہے۔

باپ: وہ کیا؟

دادا: قرعہ اندازی۔

باپ: (خوش ہو کر) ٹھیک ہے (جیب سے ایک سکہ نکال کر) یہ اسکول (دوسری طرف پلٹ کر) اور یہ جیل (سکہ ہوا میں اچھالتا ہے)

جیسے ہی سکہ نیچے گرتا ہے سب بڑے اشتیاق سے اسے دیکھتے ہیں۔ پھر سب کے منہ سے ایک ساتھ نکلتا ہے۔ اسکول!

(دوسرا منظر)

وہی پہلے والا منظر۔ دادا حسب معمول چارپائی پر اکڑوں بیٹھا حقہ پی رہا ہے۔ ماں صحن میں جھاڑو دے رہی ہے۔ دادی بے چینی سے جا کر دو تین بار دروازے سے جھانک آئی ہے۔ باپ بظاہر تو ناند میں چارہ ڈال رہا ہے لیکن دھیان اس کا بھی دروازے ہی کی طرف ہے۔ آخر دادی صبر نہیں کر سکتی اور فضلو کے پاس جا کر کھڑی ہو جاتی ہے۔

دادی: آخر پھتو کب چھوٹے گا اسکول سے۔ تم نے کہیں ماسٹر جی سے یہ تو نہیں کہہ دیا تھا کہ گوشت گوشت تمہارا ہڈی ہڈی ہماری۔ سنا ہے پہلے لوگ ماسٹروں سے یہی کہا کرتے تھے اور ماسٹر بچی کچی لڑکوں کی کھال کے جوتے بنا کر پہن لیا کرتے تھے۔

باپ: میں نے تو ماسٹر کی صورت تک نہیں دیکھی میں تو اصطبل کے دروازے ہی سے واپس آ گیا تھا جہاں ہمارے پرکھوں نے قدم نہیں رکھا میں وہاں کس طرح قدم رکھ سکتا تھا۔

دادی: (طنزیہ لہجے میں) پرکھوں نے تو قدم نہیں رکھا اب اولاد نے تو رکھ لیا نا۔ اب دیکھو پھتو پورا کا پورا واپس آتا ہے یا صرف اس کی ہڈیاں ہی واپس آتی ہیں۔ بارہوں امام اسے اپنے سائے میں رکھیں۔ ہر بلا ہر آفت سے محفوظ رہے۔

اسی دوران میں دور سے بچوں کے شور وغل کی آواز آتی ہے جو آہستہ آہستہ قریب آتی جاتی ہے۔ پھر اچانک پھتو دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتا ہے۔ دادی بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیتی ہے ماں بھی جھاڑو ایک طرف پھینک کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ دادا بدستور حقہ کے کش لگا رہا ہے۔ باپ ہاتھ جھاڑتے ہوئے قریب آتا ہے۔

دادی: (پھتو کے بازو پر سے امام ضامن کھولتے ہوئے) لو بیٹا فضلو جاؤ دوڑ کر اس کی ریوڑیاں تو بچوں میں بانٹ دو۔ بچہ ساتھ خیر کے واپس آ گیا خدانخواستہ (خود ہی جملہ ادھورا

چھوڑ دیتی ہے) ہیں یہ میں کیا کہہ رہی ہوں میرے منہ میں خاک۔ شیطان کے کان میرے اللہ ہر دم اپنی امان میں رکھے۔

باپ: (پھتو سے مخاطب ہو کر) کیوں بے پڑھنا بھی آ گیا یا نہیں (سب باتیں کرتے ہوئے چلتے چلتے برآمدے میں دادا کی چارپائی کے پاس پہنچ جاتے ہیں جہاں باپ تو بیٹھ جاتا ہے دادی اور ماں کھڑی رہتی ہیں۔ دادا کی کا ہاتھ اب بھی اس کی پشت پر ہے)

پھتو: ابا آج تو ہم نے کچھ پڑھا ہی نہیں بس سارا دن اصطبل کا گوبر صاف کرتے رہے۔ ماسٹر جی کہتے تھے پڑھنے سے پہلے گوبر صاف کرنا بہت ضروری ہے اصطبل کا بھی اور دماغوں کا بھی۔

دادا: پھر تم لوگوں نے دماغوں کا گوبر کس طرح صاف کیا؟

پھتو: دادا، ماسٹر جی کہتے تھے کہ یہ گوبر میں صاف کروں گا۔

ماں: تیرے دماغ سے جو گوبر نکلے وہ گھر لے آنا میں اُپلے ہی تھاپ لوں گی۔

پھتو: (بات جاری رکھتے ہوئے) اور ماسٹر جی کہتے تھے اس کام میں بڑی محنت کرنا پڑتی ہے جسم کا سارا خون پانی ہو جاتا ہے اس لئے ہر لڑکا باری باری ان کے لئے انڈے مرغی اور مکھن لایا کرے گا۔ ماسٹر جی کہتے تھے جو لڑکا زیادہ چیزیں لائے گا اسے جلدی پڑھنا سکھا دیں گے۔

ماں: لیکن ہمارے پاس تو مرغیاں---

پھتو: (سنی ان سنی کرتے ہوئے) اور ماسٹر جی نے کہا تھا کہ میں تم لوگوں کا مہمان ہوں تم لوگ باری باری میرے لئے کھانا لایا کرو ورنہ اگر میں ناراض ہو گیا تو تم لوگوں کے ساتھ وہی سلوک کروں گا جو سکندر نے پورس کے ساتھ کیا تھا۔

دادا: سکندر نے پورس کے ساتھ کیا کیا تھا یہ بھی بتایا انہوں نے۔

پھتو: ہاں دادا، ماسٹر جی کہتے تھے کہ جب پورس نے سکندر کو اپنا مہمان بنانے سے انکار کر دیا تھا تو وہ اس کا ملک چھوڑ کر آگے بڑھ گیا تھا۔ (دادا کچھ کہنے کے لئے منہ کھولتا ہے لیکن پھتو جلدی سے پھر بول پڑتا ہے) اور ہاں ماسٹر جی نے کہا کہ کل سب لڑکے پانچ پانچ روپے کتابوں کے لئے آٹھ آٹھ آنے گھڑوں کے لئے، چار چار آنے چٹائیوں کے لئے، دو دو آنے گلاسوں کے لئے اور ایک ایک آنہ کھانے کے لئے لائیں۔ ماسٹر جی نے یہ بھی کہا تھا کہ بازار سے جولڑکا چیز خرید کر کھائے گا وہ اس کی ہڈی پسلی ایک کر دیں گے۔ ہر لڑکا انہی سے چنے اور مٹھائی کی گولیاں خرید کر کھایا کرے۔

باپ: (حساب کرتا ہے) پانچ روپے کتابوں کے، آٹھ آنے گھڑے کے، پانچ روپے آٹھ آنے، پانچ روپے آٹھ آنے۔ چار آنے چٹائیوں کے۔ پانچ روپے بارہ آنے، پانچ روپے بارہ آنے۔

پھتو: (ماں سے مخاطب ہو کر) ماں مجھے سویرے جلدی اٹھا دینا۔ ماسٹر جی نے کہا تھا کہ کل اسکول جلدی آنا۔ پہلے جا کر ماسٹر جی کو اٹھانا ہے پھر ان کے نہانے کے لئے پانی لانا ہے پھر---

ماں: اچھا اچھا بس کر سن لیا۔ چل تو پہلے چل کر روٹی تو کھا لے۔

(تیسرا منظر)

برآمدے میں برابر برابر چار پلنگ بچھے ہیں جس پر چاروں چادریں اوڑھے سو رہے ہیں کہ اتنے میں مرغ بانگ دیتا ہے۔ دوسری تیسری بانگ پر ماں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی ہے اور کلمہ پڑھتی ہوئی جلدی جلدی پھتو کی چارپائی کی طرف بڑھتی ہے۔ اسے جھنجھوڑتی ہے۔

''اٹھ جا میرے لعل دیکھ تو کتنا دن نکل آیا۔'' چادر سے ابا منہ نکالتا ہے اور آہستہ سے کہتا ہے۔ ''ہیں ہیں کیا کرتی ہو۔ اماں اور ابا کا تو کچھ خیال کرو۔''

ماں: (جلدی سے) ارے میں سمجھی پھتو سو رہا ہے۔

باپ: میں خوب سمجھتا ہوں۔

(ماں مڑ کر جلدی سے پھتو کو جگاتی ہے)

''پھتو بیٹے جلدی سے اٹھ جاؤ۔ صبح ہو گئی۔ اسکول کو دیر ہو جائے گی۔''

(پھتو دو چار مرتبہ ہوں ہوں کر کے کروٹیں بدلتا ہے اور پھر آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھتا ہے۔ پہلے چاروں طرف دیکھتا ہے اور پھر جلدی سے پلنگ پر اتر کر چپلیں پہنتے ہوئے ماں سے کہتا ہے) ''دیر تو نہیں ہو گئی ماں!''

دادا: (کھانستے ہوئے چادر سے منہ نکالتا ہے) نہیں نہیں ابھی دیر کہاں ہوئی ہے۔ وہ سامنے قطب ستارہ چمک رہا ہے۔ جا تو جلدی سے چلا جا۔

پھتو دروازہ کھول کر باہر نکل جاتا ہے آہستہ آہستہ گھر کے سب افراد اٹھ کر مختلف کاموں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ دادی بستر تہہ کرنے لگتی ہے۔ باپ ناند میں چارہ ڈالنے لگتا ہے اور ماں جھاڑو دینا شروع کر دیتی ہے۔ دادا لوٹا لے کر دروازے سے باہر نکلنے والا ہوتا ہے کہ پھتو اندر داخل ہوتا ہے۔ دادا اسے دیکھ کر غصے سے لوٹا زمین پر رکھ دیتا ہے اور بغیر کچھ پوچھے گچھے دو تھپڑ جڑ دیتا ہے۔ پھتو آہستہ آہستہ سسکیاں بھرنے لگتا ہے۔

دادا: (غصہ میں) فضلو۔ او فضلو بس اب جیل جانے کی تیاری کر لے پولیس آتی ہی ہو گی۔

دادی بستر ویسے ہی چھوڑ کر بھاگی آتی ہے۔ ماں بے خیالی میں جھاڑو ہاتھ میں لئے قریب آ جاتی ہے۔

دادی: (دادا سے) کیوں خیر ہے تو کیا ہوا؟

دادا: دیکھو اس ٹانگ برابر چھوکرے کے کرتوت باپ کو جیل بھجوانے پر تلا ہوا ہے۔ پہلے ہی دن اسکول سے بھاگ آیا۔

باپ: (قریب آتے ہوئے) کیوں بے کیا بات ہے۔

پھتو: (آہستہ آہستہ سسکیاں بھرتے ہوئے) ابھی تو ماسٹر جی سو رہے ہیں۔ کہہ رہے تھے دس بجے سے پہلے کسی نے جگایا تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔

ماں: تو نے ماسٹر جی کو بتایا نہیں کہ ہمارے یہاں گھڑی نہیں ہے۔

پھتو: (آستین سے آنکھیں پونچھتے ہوئے) بتایا تھا۔ کہہ رہے تھے جب سورج سر پر آجائے اور سایہ بالکل پیروں کے نیچے آجائے اس سے دو گھنٹے پہلے دس بجتے ہیں۔

دادی: میں تو جانوں اس ماسٹر پر کسی جن کا سایہ ہے تبھی ایسی بہکی بہکی باتیں کرتا ہے۔

دادا: کوئی بات نہیں بیٹے۔ ہم نے دنیا دیکھی ہے کیا ہم یہ نہیں بتا سکتے کہ دس کب بجتے ہیں اسی وقت تو شہر کے سارے بابا لوگ اپنے اپنے دفتر جاتے ہیں۔

(چوتھا منظر)

(سہ پہر کا وقت۔ اس وقت صرف دادا چارپائی پر بیٹھا حقہ پیتا نظر آتا ہے۔ پھتو دروازے سے داخل ہوتے ہی خوشی سے چیخنا شروع کر دیتا ہے) ''ماں ماں (دیکھو ماسٹر جی نے ہمیں کتابیں دی ہیں۔''

دادا: تیری ماں تو شرنلفن کے یہاں گئی ہے جا ذرا دوڑ کر بلا تو لا۔

پھتو کتابیں دوسری چارپائی پر رکھ کر پھر باہر بھاگ جاتا ہے۔ دادا بڑی بے چینی سے اسے جاتا ہوا دیکھتا رہتا ہے۔ جیسے ہی وہ نظروں سے اوجھل ہوتا ہے دادا اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور چاروں طرف دیکھ کر آہستہ آہستہ چوروں کی طرح کتابوں کی طرف بڑھتا ہے بار بار رک کر چاروں طرف دیکھتا بھی جاتا ہے۔ کتابوں کے قریب پہنچ کر ایک مرتبہ پھر مڑ کر ہر طرف دیکھتا ہے۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کتاب اٹھاتا ہے اور بڑے غور سے اس کی تصویریں دیکھنا شروع کر دیتا ہے۔ چند لمحوں بعد وہ اس میں اتنا نہمک ہو جاتا ہے کہ دادی کے آنے کا قطعی احساس نہیں ہو پاتا۔

دادی: یہ کیا کر رہے ہو چپکے چپکے۔

دادا: (گھبرا کر کتاب بند کرتے ہوئے) کچھ بھی تو نہیں۔ یعنی کہ خوامخواہ ہی کی الزام تراشی۔ بس کتاب ذرا نیچے گر گئی تھی وہ اٹھا کر رکھ رہا تھا۔

دادی: بس بس رہنے دو۔ میں سب دیکھ چکی ہوں کیسی مزے مزے کی تصویریں ہیں ذرا مجھے بھی تو دکھاؤ۔

دادا: (اسی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے) پہلے ذرا جھانک کر دیکھ لو کوئی آ تو نہیں رہا۔

دادی دروازے تک جاتی ہے اور باہر کی طرف جھانک کر واپس آجاتی ہے۔ دادا کتاب گود میں رکھ کر بیٹھ جاتا ہے اور دادی قریب ہی بیٹھ کر جھک جھک کر دیکھتی ہے۔

دادی: اے ہے کیسی بے شرم عورت ہے ننگے سر بیٹھی کیا دانت نکال رہی ہے۔ اب میں سمجھی تم چھپ چھپ کر یہی دیکھ رہے تھے۔ قبر میں پیر لٹکائے بیٹھے ہو پر من کے چونچلے نہ گئے۔

دادا: (پیار سے دادی کی طرف دیکھتے ہوئے) تم ہی ایمان سے بتاؤ پھتو کی دادی۔ تمہارے بعد ہم نے کبھی کسی کو نظر اٹھا کر بھی دیکھا ہے۔

دادی: (ہاتھ نچاتے ہوئے) بس بس اب میرا منہ نہ کھلواؤ۔ تم تو آنکھیں بند کر کے بھی اپنا کام کر جاتے ہو۔ ابھی اسی دن--- (بات ادھوری چھوڑ کر بڑے غور سے ایک تصویر کو دیکھتی ہے اور پھر بڑے زور سے ہنس دیتی ہے) اے لو اس اللہ کی ماری کو تو دیکھو کیسے بائیسکوپ والیوں کی طرح دیدے مٹکا رہی ہے۔

دادا: (حیرت سے) ہیں! یعنی کہ تم بائیسکوپ کے متعلق کیا جانو۔

دادی: (برا مانتے ہوئے) لو اور سنو۔ تمہیں پتہ نہیں ہے کہ ابا مرحوم مجھ سے کتنا پیار کرتے تھے وہی ایک دن شہر لے جا کر دکھا لائے تھے۔ تب میں بہت چھوٹی سی تھی (کسی قدر شرماتے ہوئے) جب تم سے رشتہ کی بات چل رہی تھی تو سنتی تھی تمہیں بھی بائیسکوپ کا بڑا لپکا ہے۔

دادا: (ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے) اب کیا پوچھتی ہو پھتو کی دادی۔ تم سے شادی کے بعد تو ہم کہیں کے نہ رہے۔ ہمارے ایک دوست ہوا کرتے تھے چوہدری صاحب۔ بڑے پیسہ والے تھے۔ کسی نے ان سے کہہ دیا کہ بائیسکوپ بناؤ بڑی آمدنی ہوتی ہے۔ انہوں نے بھی ایک کھیل بنایا اور اسی میں بگڑ کر رہ گئے۔

دادی: (اشتیاق بھرے لہجہ میں) اچھا کیا رنگ بھی بھروائے تھے انہوں نے اس میں۔

دادا: ہاں بھروائے تو تھے۔ لیکن کم بختوں نے دھوکہ کر دیا سارے رنگ کچے لگا دیئے۔ فلم بھٹی پر دھلنے لگی اور اپنے چوہدری کا بھٹہ بیٹھ گیا۔

دادی: (اسی لہجہ میں) آخر تھا کیا اس میں؟

دادا: وہی جو ہر کھیل میں ہوتا ہے ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ ایک لڑکا جنگل میں شکار کھیل رہا تھا وہاں سے ایک لڑکی نظر آگئی۔ اس نے لڑکی سے پوچھا۔ ''تو کون''؟ لڑکی بولی۔ ''ہیروئن اور تو کون''؟ لڑکا بولا۔ ''ہیرو۔'' لڑکی بولی۔ ''اے ہیرو اے میرے بھیا کیوں نہ ہم دونوں شادی کر لیں۔'' لڑکے نے کہا۔ ''آ بیٹھ جا میرے گھوڑے پر۔'' بس وہ اسے اپنے گھر

چاند نگر

مختلف موضوعات پر ہنستی مسکراتی، کھلکھلاتی ننھی منی تحریریں

''چاند نگر'' ایسی شوخ تحریروں سے آباد ہوتا ہے جو طوالت کے لحاظ سے ''نابالغ'' لیکن شوخی اور شرارت میں بالغ ہوتی ہیں۔ آپ بھی اِس میں جگہ حاصل کر سکتے ہیں لیکن شرط یہی ہے کہ آپ کی تحریر میں مزاح کوٹ کوٹ کر بلکہ ٹھونس ٹھونس کر بھرا گیا ہو۔ یہ خیال بھی رکھئے کہ یہ مسکراہٹیں آپ کی اپنی تخلیق ہوں، کہیں سے اُڑائی نہ جائیں۔ اپنے مختصر مضامین اِس پتہ پر ارسال فرمائیے۔

انچارج چاند نگر تیس روزہ ''چاند'' F-31، شمع پلازہ، فیروز پور روڈ، لاہور 54600

مُرغ ہزار نعمت ہے

ظفر ندیم دہرہ

مرغ فارسی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی پرندے کے ہیں۔ یہ ایک بین الاقوامی جانور ہے۔ اگرچہ بنیادی طور پر یہ ایک پرندہ ہے مگر آسمانی پرندوں کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتا بلکہ اِس کی اٹھک بیٹھک زمینی پرندوں کے ساتھ ہے۔ ماہرین جنگلی حیات کا خیال ہے کہ زمین پر مسلسل بودوباش کرنے سے اِس کی پرواز میں کوتاہی آ چکی ہے لہٰذا اِس سے پرواز کی توقع رکھنا عبث ہے۔ سحر خیز اور خوش الحان اِتنا ہے کہ جب سارا عالم سو رہا ہوتا ہے۔ یہ اُٹھ جاتا ہے اور پر پھڑ پھڑا کر اذان دینے میں مصروف ہو جاتا ہے، اِس کی دیکھا دیکھی اِس کے بھائی بند بھی حرکت میں آ جاتے ہیں اور اذانوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اِن کی لگاتار ککڑوں کوں سن کر نمازی حضرات آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور مسجد کی طرف دوڑ لگا دیتے ہیں۔ کچھ ناعاقبت اندیش حضرات کا خیال ہے کہ اِسے اذان اور نماز سے کوئی دِلچسپی نہیں ہوتی بلکہ یہ تو پیٹ کی خاطر اذان دیتا ہے۔ جب اِسے بھوک ستاتی ہے تو وہ اذان کے ذریعے اپنے مالک کو پیغام بھیجتا ہے کہ اَب خدارا' اُٹھ جاؤ۔ خود بھی ناشتہ کرو اور مجھے بھی کھلاؤ پلاؤ--- اِس کے برعکس فلسفی اور دانشور حضرات کا خیال ہے کہ مرغ صرف اِس وقت اذانیں نشر کرتے ہیں کہ جب دُنیا میں کہیں جھوٹ بولا جا رہا ہو یا لکھا جا رہا ہو۔ اگر اخبارات کے نظام الاوقات کو مدنظر رکھا جائے تو یہ بات کافی حد تک دُرست دِکھائی دیتی ہے کیونکہ اخبارات بھی عام طور پر اِسی وقت چھپتے ہیں جب مرغ اذانیں دے رہے ہوتے ہیں۔ اِن پر ایک اور الزام بھی عائد کیا جاتا ہے کہ یہ اذانیں دیتے وقت پابندی اوقات کا خیال نہیں رکھتے بلکہ جب جی چاہتا ہے گردن اکڑا اکڑا کر اذان دے ڈالتے ہیں جس کا ثبوت یہ ہے کہ یہ رات بارہ بجے ہی اذانیں براڈکاسٹ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اِن کا اعتراض سر آنکھوں پر لیکن اِنہیں اِس نکتے کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہئے کہ یہ پرانے زمانے کے خالص مرغ نہیں ہیں بلکہ موجودہ بناسپتی دَور کی پیداوار ہیں اِس لیے اِن سے وقت کی پابندی کی توقع رکھنا شعلوں سے خوشبو لینے کے مترادف ہے۔

مرغ ایک کثیر الازواج جانور ہے' عرب شیوخ کی طرح اِس کی کئی کئی بیگمات ہوتی ہیں۔ وہ جس پر اپنے پنجے گاڑ دیتا ہے' وہی سہاگن بن جاتی ہے گویا مرغیوں کے جھنڈ میں اِس کی وہی حیثیت ہوتی ہے جو کہ ستاروں کے جھرمٹ میں چاند کی ہوتی ہے۔ بے حد فنکار پرندہ ہے' درجن دو درجن مرغیوں کو یہ آسانی سے سنبھال لیتا ہے۔ اِسے سب کو بیک وقت خوش وخرم رکھنے کا فن آتا ہے۔ اِس طریقے سے یہ افزائشِ نسل کا عمل جاری رکھتا ہے۔ ویسے شریف اِتنا ہوتا ہے کہ میڈم بلی کو دیکھ کر سانس روک لیتا ہے اور اِس وقت تک دم سادھے ساکت رہتا ہے جب تک اِسے میاؤں کی روانگی کا یقین نہ ہو جائے۔ کچھ لوگ اِسے نادان پرندہ بھی قرار دیتے ہیں۔ اِس ضمن میں وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ جب یہ ترنگ میں آتا ہے تو مٹی سے کھیلنا شروع کر دیتا ہے اور اپنے ہی سر میں خاک ڈالنے لگتا ہے۔ یہ نظریہ کسی طور پر بھی دُرست نہیں ہے' اِس خاکسار کا سر میں خاک ڈالنا یا مٹی میں لوٹ پوٹ ہونا اِس کی نادانی یا بے وقوفی کی علامت نہیں ہے بلکہ یہ اِس کی ہفتہ وار ورزش کا ایک حصہ ہے جس کے ذریعے وہ اپنی بیٹری چارج کرتا ہے۔

ہمارے ملک میں مرغوں کی متعدد اقسام پائی جاتی ہیں۔ اِن میں سے ایک قسم درآمد شدہ ہے کہ جنہیں عرف عام میں فارسی مرغی کہا جاتا ہے۔ یہ مرغی بے حد سُست کاہل اور شرمیلا ہوتا ہے۔ جسمانی وزن کی زیادتی کی وجہ سے زیادہ دیر تک کھڑا نہیں رہ سکتا اِس لیے گردن جھکائے ڈربے ہی میں پڑا اونگھتا رہتا ہے۔ چونکہ اِس کی جائے ولادت غیر مسلم ممالک میں ہوئی ہے اِس لیے یہ اذان وغیرہ سے ناآشنا ہوتا ہے' بس دِن رات گونگا بن کر بیٹھا رہتا ہے البتہ ذبح کے وقت خوب واویلا کرتا ہے اور حلق سے ''بچاؤ' بچاؤ'' کی آوازیں نکالتا ہے مگر اِس کی آہ وبکا کا کسی پر کوئی اثر نہیں ہوتا اور یہ آنکھیں بند کر کے شہید ہو جاتا ہے۔ اِسے اِنسان دوست جانور بھی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ ہر موقع پر اِنسان کے کام

ماں: (کچھ سوچتے ہوئے) نتھو بھی تو یہی کتاب پڑھتا ہے لیکن اس کی ماں تو لنگڑی ہے۔

دادی: اور شمو کی ماں برکت کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔

ماں: اور ممدو کی ماں مر چکی ہے۔

دادا: (اپنی چارپائی پر بیٹھے بیٹھے) اور پھر یہ بھی تو سوچو کہ ایک عورت کس کس کی ماں ہو سکتی ہے۔ اور پھر آج کل تو سرکار ایک سے زیادہ بچے والی ماں کو دھمکاتی ڈراتی رہتی ہے لیکن یہ جو اتنے سارے لڑکوں کی ماں ہے اس سے کچھ نہیں کہتی۔ ضرور اس نے (پھتو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) سننے میں کچھ غلطی کی ہے۔ کل تو نہیں پرسوں میں خود ماسٹر جی کے پاس جا کر پوچھوں گا کہ وہ آخر سب کو مائیں کیوں بانٹتا پھر رہا ہے۔ اگر اتنی ہی زیادہ مائیں ہوگی تو یتیم خانے والوں کو چندے میں کیوں نہیں دے دیتا۔ کم از کم جیل اس لحاظ سے تو اچھی ہے کہ اس میں کسی پر زبردستی دوسرے ماں باپ نہیں ٹھونسے جاتے۔

ماں بڑبڑاتی ہوئی باورچی خانے کی طرف چلی جاتی ہے اور دادی کمرے میں۔ دادا حقہ پینا شروع کر دیتا ہے۔ پھتو کچھ دیر اسی طرح بیٹھا رہتا ہے پھر پیر اوپر کر کے بیٹھ جاتا ہے اور کتاب کھول کر پڑھنا شروع کر دیتا ہے۔ ''چیں چیں چوں چوں چاچا۔ گھڑی پہ چوہا ناچا۔ گھڑی نے ایک بجایا۔ چوہا نیچے آیا۔'' کچھ دیر اسی طرح پڑھتا رہتا ہے پھر اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔ ''پتہ نہیں یہ چوہے کس طرح ناچتے ہوں گے۔'' اٹھ کر دادا کے پاس آتا ہے اور قریب بیٹھتے ہوئے کہتا ہے۔

پھتو: دادا یہ چوہا کس طرح ناچتا ہے۔ میں نے تو کبھی چوہے کو ناچتے ہوئے نہیں دیکھا۔

دادا: کیا کہا چوہا ناچتا ہے۔ ضرور اس چوہے نے بھنگ پی رکھی ہوگی یا پھر جورو کا غلام۔

پھتو: یہ جورو کا غلام کون ہوتا ہے دادا۔

دادا: (ٹھنڈی سانس بھر کر) ہماری طرف دیکھو بیٹے۔ ہاں تو تم کیا پوچھ رہے تھے۔

پھتو: میں پوچھ رہا تھا دادا کہ چوہے کس طرح ناچتے ہیں۔

دادا: (کچھ سوچتے ہوئے) ہاں ہاں دیکھو یاد آیا۔ ایک مرتبہ ہم نے شہر میں ایک سرکس دیکھا تھا جس میں گھوڑا گھنٹی بجاتا تھا اور بندوق چلاتا تھا ہو سکتا ہے یہ چوہا بھی اسی خاندان سے ہو۔

پھتو: لیکن دادا چوہا گھوڑے کے خاندان سے کس طرح ہو سکتا ہے۔

داد: ہو سکتا ہے بیٹے ہو سکتا ہے۔ آج کے دور میں سب کچھ ممکن ہے۔ انجینئر پکوڑے بیچ سکتے ہیں تو چوہا گھوڑے کے خاندان سے کیوں نہیں ہو سکتا۔

پھتو: دادا میں نے کبھی سرکس نہیں دیکھا مجھے بھی کبھی دکھلاؤ نا۔

دادا: ارے بیٹے اب میں چل پھر ہی کہاں سکتا ہوں اور پھر آج کل کے سرکس بچوں کے دیکھنے کے نہیں ہوتے صرف بالغوں کے لئے ہوتے ہیں۔

پھتو: لیکن دادا' ممدو تو شہر میں سرکس دیکھ کر آیا ہے۔ کہتا بڑے مزے کا ہوتا ہے۔ بہت سے آدمی جھولوں پر جھولتے ہیں۔ ایک آدمی ایک پہیہ والی بڑی سی سائیکل چلاتا ہے اور دادا ممدو کہہ رہا تھا کہ ایک لڑکی سفید کپڑے پہن کر ایک سفید گھوڑے کی پیٹھ پر کھڑی ہو کر ناچتی ہے اور---

دادا: (جلدی سے بات کاٹتے ہوئے) ممدو سے کہنا اب سرکس آئے تو بتا دے ہم تمہیں بھی سرکس دکھانے لے چلیں گے۔ ہمیں بھی (ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے) سفید گھوڑا دیکھے بہت دن ہو گئے۔

پھتو: اور دادا کیا سرکس میں شیر بھی ہوتا ہے۔

دادا: کسی وقت تو میں خود شیر تھا بیٹے۔ بلکہ ہر مرد شادی سے پہلے شیر ہی ہوتا ہے شادی کے بعد تو وہ گیدڑ بھی نہیں رہتا۔ بھیگا ہوا چوہا بن جاتا ہے۔

پھتو: دادا تمہیں شیر سے ڈر نہیں لگتا۔

دادا: ارے بیٹا میں نے تو شیر کے پنجوں میں وہ پنجے ڈالے ہیں کہ وہ بھی یاد ہی کرتا ہوگا لیکن بس آخری مرتبہ ذرا سی چوک ہو گئی۔

پھتو: کیوں کیا ہوا تھا دادا۔

دادا: بات یہ تھی بیٹا کہ ایک دفعہ ہم شیر کا شکار کرنے کے لئے مچان پر بیٹھے تھے۔ نیچے ایک بھیڑ باندھ رکھی تھی۔ ہم شام تک شیر کے انتظار میں بیٹھے رہے لیکن معلوم ہوتا تھا شیر کو بھی خطرے کی بو آ گئی تھی۔ اس نے دن میں تو ہماری طرف رخ نہیں کیا البتہ رات کو اس کے دھاڑنے کی آواز سنائی دینے لگیں۔ ایک مرتبہ تو وہ بالکل مچان کے نیچے آ کر دھاڑا جیسے مقابلہ کا چیلنج دے رہا ہو۔ ہماری غیرت کو بھی جوش آ گیا۔ ایک نہتے جانور کو چھپ کر گولی مارنا واقعی بزدلی تھی۔ ہم نے فوراً اوپر سے چھلانگ لگائی اور شیر سے گتھم گتھا ہو گئے۔ کبھی وہ نیچے ہم اوپر اور کبھی ہم نیچے وہ اوپر۔ لیکن آخر شیر نے ایک داؤ ایسا لگایا کہ ہم بے بس ہو گئے۔ بس پھر کیا تھا شیر نے ہمیں چیرا پھاڑا اور کھا گیا۔

پھتو: (حیرت سے) شیر کھا گیا۔ لیکن دادا تم تو---

دادا: (طنزیہ لہجے میں) لیکن تم تو زندہ ہو یہی کہنا چاہتے ہو نا۔

پھتو اثبات میں سر ہلاتا ہے۔

دادا: (اسی طنزیہ لہجے میں) یہ زندگی۔

(ایک لمحہ کو رکتا ہے) ہشت یہ بھی کوئی زندگی ہے۔

☆☆

اداکاراؤں کا مذہب پیسہ' سیاستدانوں کا کرسی اور وطن دونوں کا کوئی نہیں ہوتا مجاہد اُدیب شیخ

ٹکریں

پیراڈی ایک دقیق فن ہے اور اِس فن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ کسی شعر میں الفاظ کا کچھ ایسا ہیر پھیر کیا جائے کہ اِس کا مفہوم یکسر بدل جائے اور شعر کی ''صحت'' پر بھی مضر اثرات نہ پڑیں۔ اسی رہنما اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ فلمی نغموں اور فلمی وغیر فلمی نظموں' غزلوں کی دُرگت بنا سکتے ہیں۔ اگر آپ اِس کوشش میں کامیاب ہو جائیں تو اصل کلام کے ساتھ اپنی کوشش ہمیں بھجوا دیجئے۔ ہم یہاں اِسے شائع کریں گے تاکہ دوسرے بھی اِس سے لُطف اندوز ہو سکیں۔ اپنی ''ٹکریں'' اِس پتہ پر ارسال فرمائیے۔

انچارج ''ٹکریں'' تیس روزہ ''چاند'' F-31 'شمع پلازہ' فیروز پور روڈ' لاہور 54600

فلم ''دوبدن'' کا شاعر

رہا گردشوں میں ہر دَم میرے عشق کا ستارا
کبھی ڈگمگائی کشتی کبھی کھو گیا کنارا
رہا گردشوں میں ہر دَم--- ---
کوئی دِل کے کھیل دیکھے کہ محبتوں کی بازی
وہ قدم قدم پہ جیتے' مَیں قدم قدم پہ ہارا
رہا گردشوں میں ہر دَم--- ---
یہ ہماری بدنصیبی جو نہیں تو اور کیا ہے
کہ اِسی کے ہو گئے ہم جو نہ ہو سکا ہمارا
رہا گردشوں میں ہر دَم--- ---
پڑے جب غموں سے پالے رہے مٹ کے مٹنے والے
جسے موت نے نہ پوچھا اُسے زندگی نے مارا
رہا گردشوں میں ہر دَم میرے عشق کا ستارا

محمد سعید انجم

رہا طیش ہی میں ہر دَم میری اہلیہ کا پارا
کبھی تو گھمائی جوتی' کبھی جھاڑو دے کے مارا
رہا طیش ہی میں ہر دَم --- ---
کوئی گھر میں آ کے دیکھے کہ یہ ازدواجی دنگل
وہ قدم قدم پہ جیتے' مَیں قدم قدم پہ ہارا
رہا طیش ہی میں ہر دَم --- ---
یہ ہماری بدنصیبی جو نہیں تو اور کیا ہے
کہ ہمیں ملی ہے نیکر' اُسے مل گیا شرارا
رہا طیش ہی میں ہر دَم --- ---
پڑے جاہلوں سے پالے رہے پٹ کے پٹنے والے
جسے ساس نے نہ کوٹا' اُسے سالیوں نے مارا
رہا طیش ہی میں ہر دَم میری اہلیہ کا پارا

نذیر قیصر

عالم ہے عجیب حسن کا بھی
وہ چاند ہے اور چاند سا بھی
دِن بھر کی تھکن تھی' سو گیا مَیں
یاد آتا کوئی تو جاگتا بھی
روتے تھے کہ درد ہجر کم ہو
اَب ختم ہوا یہ سلسلہ بھی
اِک شخص ملا تھا رات مجھ سے
کیا تجھ سا ہے کوئی دوسرا بھی
چوما تھا کبھی تیرے لبوں کو
اَب یاد نہیں وہ ذائقہ بھی
لے جاؤں کہاں بچا کے آنکھیں
آئینہ بدست ہے صدا بھی

نوید ظفر کیانی

عالم ہے عجیب حسن کا بھی
وہ چاند ہے اور چاند سا بھی
دفتر کا ہے معمول' سو گیا مَیں
گھر ہوتا اگر تو جاگتا بھی
روتے تھے کمیشنوں کے غم میں
اَب ختم ہوا اور کمک مکا بھی
اِک شخص اُڑا گیا ہے بٹوہ
کیا تجھ سا ہے کوئی دوسرا بھی
مارا تھا کبھی تری مما نے
اَب یاد نہیں وہ بیلنا بھی
مَیں جاؤں کہاں بجٹ سے بچ کے
رستے میں کھڑی ہے یہ بلا بھی

لڑکوں کو قطرینہ کی تاریخِ پیدائش یاد ہے مگر کلمہ طیبہ نہیں ☾ حمیرہ عیسیٰ بلوچ

اِس طرح راتوں رات لاکھوں افراد بیروزگار ہو جاتے ہیں۔ اِس بیماری کا عرصہ چند دِنوں پر محیط ہوتا ہے۔ اِس دوران صارفین اور مرغ فروشوں کے درمیان فاصلے برقرار رہتے ہیں۔ اِس تاثر کو زائل کرنے اور اِنہیں دوبارہ اپنا ہمنوا بنانے کے لیے کسی نہ کسی سرکاری وزیر یا عوامی شخصیت کو زبردستی پکڑ کر ٹی وی پر لایا جاتا ہے جو کہ نفسِ بہ نفیس مرغ کھا کر عوام الناس کو یہ یقین دہانی کراتا ہے کہ مرغیوں میں برڈ فلو نام کی کوئی بیماری نہیں ہے۔ لٰہذا عوام اِنہیں بے دھڑک کھا سکتے ہیں اور دوسروں کو بھی کھلا سکتے ہیں۔ اِس طرح مرغ ٹرین دوبارہ چل پڑتی ہے اور گوشت خور آہستہ آہستہ اِس پر سوار ہونا شروع کر دیتے ہیں کہ اِس کے بغیر اِن کا گزارہ ممکن نہیں ہوتا۔

مرغ دُنیا کا واحد جانور ہے کہ جس کی ہر چیز کارآمد ہوتی ہے۔ فیڈ بنانے والے اِس کی آنتیں' اوجھڑی اور پر تک اُٹھا کر لے جاتے ہیں جنہیں عمل کیمیائی سے گزار کر مرغیوں کی خوراک تیار کی جاتی ہے گویا یہ مر کر بھی اپنے زندہ ساتھیوں کے کام آتے ہیں اور اِن کا پیٹ بھرنے کا سبب بنتے ہیں جبکہ اِس کی کلیجی' پوٹا اور ٹانگیں غریب عوام کے حصے میں آتی ہیں جنہیں پکا کر وہ وقتی طور پر خوش ہو جاتے ہیں کہ اُنہوں نے بھی مرغ کا گوشت کھایا ہے۔ دوسری طرف مرغ سوپ بنانے والے ہفتوں تک اِسے سوپ بنانے والی کڑاہی کے اوپر آویزاں رکھتے ہیں تا کہ لوگوں کو یہ یقین دلایا جا سکے کہ یہ مرغ ہی کا سوپ ہے۔ حالانکہ یہ سوپ مرغ کے گوشت کا نہیں ہوتا بلکہ اِن کی کلیجی اور پوٹوں سے تیار شدہ ہوتا ہے جس میں گائے کے پایوں کی بھی آمیزش شامل ہوتی ہے۔ اِس طرح ہوٹلوں پر مرغ کے کباب کے نام سے جو مال فروخت کیا جاتا ہے' وہ بھی کلیجی اور پوٹوں کے قیمے سے تیار شدہ ہوتا ہے۔ یہی نہیں آج کل گوشت مہنگا ہونے کی وجہ سے اِن کی ٹانگیں پالتو کتوں کو کھلائی جاتی ہیں تا کہ مہنگائی کا توڑ کیا جا سکے اِسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ ☆☆

چو---ہا

✡ سیّد شعبان گیلانی

عام طور پر ہماری آنکھیں وقتِ فجر ہی بند ہوا کرتی ہیں مگر آج خلافِ معمول فجر کے وقت کھل گئیں۔ جسبِ روایت لگے کروٹیں بدلنے۔ موبائل اُٹھایا' بہت سے میسجز ہماری نظرِ کرم پڑنے کے لیے قطار در قطار موجود تھے۔ ادھ کھلی آنکھوں سے کچھ پڑھے کچھ بن پڑھے ڈیلیٹ کر دیئے۔ کوئی کام نہ بچا تو سوچا کہ نماز پڑھ لی جائے۔ اُٹھا اور سیدھے واش روم کی راہ لی۔ گرتے سنبھلتے بچتے بچاتے واش روم میں جا پہنچا۔ لوڈشیڈنگ تو خیر تھی ہی' پانی کے نلکے میں سے بھی بجائے پانی کے ہوا نکل رہی تھی۔ پانچ سات سنائی اِن کو جنہیں سنائی جانا چاہئے تھیں (اَب وہ سنتے نہیں تو اِس میں ہمارا کیا قصور؟) بالٹی میں موجود پانی سے وضو بنانے کا پروگرام مرتب کیا۔ شومئی قسمت' بالٹی خالی ملی۔ آنکھوں کی پتلیوں کو کھینچا تو بالٹی کے ساتھ رکھا ڈرم بھی نظر آ گیا اور اِس میں موجود پانی بھی۔ لوٹے میں پانی لیا (سیاسی لوٹا نہیں) وضو لیا اور پھر اپنے کمرے میں جائے نماز پر کھڑے ہو گئے۔ یہاں پر یہ بات بتانا ضروری سمجھوں گا کہ ڈرم سے مگ بھر کر لوٹے میں اُنڈیلنے کے عمل کے دوران' یکبارگی ہمیں کسی کالی سی شے کا عکس محسوس ہوا تھا مگر نیند اور اندھیرے کی ملاوٹ سے ہم اِس جانب توجہ نہ دے سکے جس کا نتیجہ ''لمحوں نے خطا کی تھی برسوں نے سزا پائی ہے'' کے مصداق کچھ وقت گزرنے کے بعد ہمیں ملا۔

نماز سے کوئی آدھ پون گھنٹہ بعد ہمارا یوں ہی بلا مقصد واش روم کا چکر لگانے کو جی چاہا۔ پاؤں میں ہلکی ہلکی جلن بھی محسوس ہو رہی تھی' سوچا ایک مگ پانی سے بھر کر پاؤں پر اُنڈیلتے ہیں مگ اُٹھایا' ڈرم میں گھمایا۔ دیکھا تو پانی کے ساتھ ساتھ مگ میں ایک چوہا بھی آیا۔ اَب سمجھ آیا کہ وہ کالا کالا کیا تھا۔ ایک طرف زور سے جو پٹخا تو یقیناً اگر رمق بھر جان باقی بھی ہو گی تو وہ بھی نکل گئی ہو گی۔ کچھ لمحے غور کیا کہ جہاں اِسے پٹخا تھا' وہاں سے بالشت برابر بھی نہ ہلا تھا لٰہذا تصدیق ہو گی کہ وہ دارِ فانی سے دارِ بقا کی جانب کوچ کر گیا ہے مگر اَب ہمیں ''یادِ ماضی'' تڑپانے لگی۔ ہم نے وضو بنایا تھا اِس پانی سے' منہ دھویا تھا۔ ناک میں پانی ڈالا تھا۔ اُف' کلی بھی تو کی تھی---اِس وت پتہ نہیں پانی کیوں آ رہا تھا' سوچا کہ تازہ اور صاف پانی ڈرم میں بھر لیا جائے۔

تھوڑی سی مشقت سے ڈرم اُلٹا کر دیا۔ دفعتہً چھوٹے سے واش روم میں پورے ڈرم کا پانی گرانے سے سیلاب کا ساسماں پیدا ہو گیا اور ہم تھوڑی دیر کے لیے لگے اِس میں تیرنے۔

ڈرم تو خیر بھر گیا مگر ہمارا سکون و چین غارت ہو گیا۔ کبھی یہاں بیٹھتے تو کبھی وہاں مگر رہ رہ کے وہ وقت یاد آتا جب ہم اِس ''متاثرہ پانی'' سے کلی کر رہے تھے۔ یہ اوٹ پٹانگ سوچ' سوچ کر جی متلانے لگا۔ کبھی محسوس ہوتا کہ پیٹ میں گڑبڑ ہے' کبھی سوچتے ممکن ہے اِس فعل کی بدولت ہم مر جائیں اور خبریں یوں پھیلے کہ دراصل وہ چوہا نہیں' چوہیا تھی اور صاحبِ اولاد بھی اور اِس کے ننھے منے بچے کو گیلانی صاحب نے کلی

لے آیا۔

دادی: (تعجب سے) ارے بائیسکوپ تو بڑا لمبا ہوتا ہے اور یہ اتنی جلدی ختم ہو گیا۔

دادا: (ٹھنڈی سانس بھر کر) ان دونوں کم بختوں نے جنگل سے گھر تک کا راستہ پورے تین گھنٹے میں طے کیا تھا تین گھنٹہ میں۔

اتنے میں دروازے پر کچھ آہٹ ہوتی ہے دادا لپک کر دوسری چارپائی پر بیٹھ کر حقہ پینے لگتا ہے اور دادی اندر کمرے میں آ جاتی ہے۔ دروازے سے پھتو اندر داخل ہوتا ہے اور اپنی کتابوں کی طرف جاتے ہوئے دادا کی طرف بغیر دیکھے ہوئے کہتا ہے۔ ''ماں نے کہا میں ابھی تھوڑی دیر میں آتی ہوں جب تک میں اپنا سبق ہی یاد کرلوں۔''

وہ چارپائی پر اس طرح بیٹھتا ہے کہ اس کی پیٹھ صدر دروازے کی طرف ہوتی ہے۔ وہ کتاب کھول کر ایک صفحہ پر انگلی رکھ کر ہل ہل کر یاد کرنا شروع کر دیتا ہے۔ ''یہ میری ماں ہے۔ یہ میری ماں ہے۔ یہ میری ماں ہے---''

دادا حقہ کے کش لگاتا جاتا ہے اور عینک کے اوپر سے پھتو کو پڑھتے ہوئے بھی دیکھتا جاتا ہے اور تشویش بھرے انداز میں سر بھی ہلاتا جاتا ہے کچھ دیر بعد ماں بھی صدر دروازے سے داخل ہوتی ہے۔ پہلے باورچی خانے کی طرف مڑنے لگتی ہے لیکن پھتو کی آواز کان میں پڑتے ہی پلٹ آتی ہے اور آ کر پھتو کے پیچھے کھڑی ہو جاتی ہے۔ پھتو اسی طرح کتاب پر انگلی رکھ کر ہل ہل کر پڑھ رہا ہے۔ ''یہ میری ماں ہے۔ یہ میری ماں ہے۔ یہ میری ماں ہے۔''

ماں کچھ دیر اسی طرح کھڑی رہتی ہے پھر غصہ سے کتاب جھپٹ کر اٹھاتی ہے۔ ''دیکھوں تو سہی تیرا باوا تیرے لئے کونسی نئی ماں لایا ہے۔''

(لڑکا سہمے ہوئے انداز میں کتاب کی طرف اشارہ کر کے پڑھنے کے انداز میں) ''یہ میری ماں ہے---''

ماں کتاب چارپائی پر پھینک دیتی ہے اور رونا شروع کر دیتی ہے۔ دادی جلدی سے کمرے سے باہر آتی ہے دادا بھی حقہ چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

دادی: (قریب آتے ہوئے) کیوں خیر تو ہے بہو۔ کیا شریفن کی بیٹی---

داد: لاحول ولا۔ یعنی تم عورتیں بھی حد کرتی ہو۔ جہاں کوئی بات ہوئی اور فوراً کسی کی بیٹی کا ذکر آ گیا ہو۔

دادی: تو کیا کسی جن کا سایہ ہو گیا ہے۔ کھڑے کھڑے میرا منہ کیا تک رہے ہو جاؤ جلدی سے مولوی صاحب کو بلا لاؤ۔

(اسی دوران باپ بھی صدر دروازے سے داخل ہو کر سیدھا برآمدے میں آتا ہے)

باپ: یہ کون سی اسمبلی کا اجلاس ہو رہا ہے۔

ماں: (سسکیاں بھرتے ہوئے) بتاؤ اسے۔ (پھتو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ ڈائن جیسی ماں کہاں سے ملی۔

دادی اور باپ ایک ساتھ: ماں!

باپ: (غصہ سے پھتو سے مخاطب ہو کر) کیوں بے کون سی ہے تیری ماں۔

پھتو: (سہمے ہوئے انداز میں کتاب پر انگلی رکھ کر پہلے والے انداز میں) یہ میری ماں ہے۔

دادی: (ماں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اور یہ کون ہے۔

پھتو: یہ میری ماں ہے۔

باپ: (کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) پھر یہ تیری کونسی ماں ہے۔

پھتو: (اسی لہجہ میں) ماسٹر جی نے کہا تھا یہ میری ماں ہے۔

باپ: (اطمینان کی سانس لیتے ہوئے) اوہ تو یہ بات ہے (بیوی سے مخاطب ہو کر) نیک بخت تو نے خواہ مخواہ ہی اتنا ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ یہ تو ماسٹر جی کی ماں ہے (پھتو سے مخاطب ہو کر) کیوں بے ٹھیک ہے نا۔

پھتو: (مزید ڈرتے ہوئے) نہیں۔ ماسٹر جی نے کہا تھا یہ میری (میری پر زور) ماں ہے۔

دادی: اے ہے مجھے لگتا ہے پھتو پر بھی کسی کا سایہ ہو گیا ہے جبھی یوں واہی تباہی بک رہا ہے۔

باپ: ٹھہرو ٹھہرو۔ پہلے ہمیں یہ اچھی طرح تحقیق کر لینی چاہیے کہ یہ آخر کس کی ماں ہے (پھتو سے مخاطب ہو کر) ابے کل ماسٹر جی سے اچھی طرح پوچھ کر آئیو یہ کس کی ماں ہے۔

پھتو اقرار میں گردن ہلاتا ہے۔

(پانچواں منظر)

پھتو کتابیں لئے اندر داخل ہوتا ہے۔ ماں جو باورچی خانہ میں کچھ کام کر رہی ہوتی ہے لپک کر اس کے قریب آتی ہے۔ دادا برآمدے میں چارپائی پر بیٹھے بیٹھے حقہ پیتے ہوئے پھتو کو دیکھتا ہے۔

ماں: (بیتابی سے) کیوں بیٹے ماسٹر جی سے پوچھا تھا یہ کس کی ماں ہے۔

پھتو: (گردن اوپر نیچے ہلاتے ہوئے) ہاں پوچھا تھا۔

ماں: (اسی لہجے میں) پھر انہوں نے کیا کہا۔

پھتو: انہوں نے کہا ہے کہ جو کوئی کتاب پڑھتا ہے یہ اسی کی ماں ہے۔

ماں بیٹا باتیں کرتے کرتے برآمدے میں آ جاتے ہیں۔ دادی کمرے سے باہر نکلتے ہوئے پھتو کی بات سن لیتی ہے اور تعجب سے دہراتی ہے۔ جو کوئی کتاب پڑھتا ہے یہ اسی کی ماں ہے۔ پھتو کتابیں چارپائی پر رکھ کر کھڑا ہو جاتا ہے چارپائی کے ایک سرے پر دادی اور دوسرے پر ماں بیٹھ جاتی ہے۔

آتا ہے۔ شادی بیاہ، سالگرہ، منگنی، ولیمہ اور سیاسی اجتماع میں اِن کی شرکت لازمی سمجھی جاتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اِس کے بغیر کوئی بھی محفل، محفل کہلانے کی مستحق نہیں۔ محبوب ہو نہ ہو مگر مرغ کا ہونا لازمی ہے گویا---

تو جو نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے
مانا کہ محفل جواں ہے حسیں ہے

کبھی خوشی، کبھی غم اِنسان کی زندگی کے اہم عناصر ہیں۔ جہاں خوشی کی تقریبات میں اِنہیں یاد رکھا جاتا ہے، وہاں مجلس عزاداری میں بھی اِنہیں بھلایا نہیں جاتا حتیٰ کہ موت پر بھی اِن کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔

مرغ کی دوسری قسم دیسی کہلاتی ہے۔ فارسی مرغی کے برعکس یہ بے حد تیز وطرار ہوشیار اور چالاک ہوتے ہیں۔ اِنہیں لوگ گھروں میں ذوق وشوق سے پالتے ہیں۔ اِن سے جہاں افزائش نسل کا کام لیا جاتا ہے، وہاں یہ بہبودِ آبادی کے کام بھی آتے ہیں۔ اگر گھر پر وقت بے وقت مہمان نازل ہو جائیں تو اِن کی خاطر مدارت کے لیے اِنہیں ذبح کیا جاتا ہے جس سے مہمان نہال ہو جاتے ہیں اور میزبان کی تعریف و توصیف کئے بغیر نہیں رہتے۔ مولوی حضرات اِنہیں خاص طور پر شوق سے کھاتے ہیں اِس لیے وہ وعظ کے دوران لوگوں کو تلقین کرتے ہیں کہ اگر اُنہیں جنت میں جانا ہے تو اِنہیں بھی مرغ کھلاتے رہیں--- غریب لوگ اِنہیں اِس وقت کھاتے ہیں جب وہ بیمار ہوں یا پھر مرغ بیمار ہو۔ دیسی مرغ کا گوشت اگرچہ سخت ہوتا ہے اور دیر سے گلتا ہے مگر اِس کی لذت اور افادیت اپنی جگہ پر مسلم ہے جب کہ فارسی مرغی کا گوشت بے حد نرم و نازک ہوتا ہے جسے شمسی توانائی کے ذریعے بھی پکایا جاسکتا ہے۔ دیسی مرغی کی اضافی قابلیت یہ بھی ہے کہ اِنہیں صدقے کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اِس سلسلے میں کالے مرغ کو ترجیح دی جاتی ہے کیونکہ لوگوں کی اکثریت کا یہ عقیدہ ہے کہ کالی چیز کا صدقہ دینے سے بلا فٹافٹ ٹل جاتی ہے جس کا ثبوت اِس بات سے بھی ملتا ہے کہ سنیاسی اور عامل حضرات جب جھاڑ پھونک کا عمل شروع کرنے پر کمربستہ ہوتے ہیں تو وہ سب سے پہلے تندرست وتوانا مرغ کی فرمائش کرتے ہیں۔

دیسی مرغی کی ایک اور ذیلی شاخ بھی موجود ہے کہ جنہیں اصیل یا جنگ باز مرغ کہا جاتا ہے۔ یہ مرغی ایف سولہ کی طرح بے خد لڑاکا ہوتے ہیں۔ بعض لوگوں کو مرغ لڑانے کا شوق ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ شوق جاگیرداروں اور ڈیرہ داروں کے لیے مخصوص ہے لیکن عام لوگ بھی اِس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ اِن کے باقاعدہ دنگل کرائے جاتے ہیں جسے دیکھنے کے لیے مشتاقان دید کا جم غفیر جمع ہو جاتا ہے۔ اِن کو لڑانے سے پہلے باقاعدہ تیاری کرائی جاتی ہے جس کے دوران اِنہیں پستہ، بادام، مکھن، قیمہ اور دوسری مقوی غذائیں کھلائی جاتی ہیں۔ اِن کی لڑائی بڑی خوفناک اور دلچسپ ہوتی ہے۔ دونوں مرغ لڑنے سے پہلے ہاکی کے کھلاڑیوں کی طرح بُلی کرتے ہیں اور ریفری کا اِشارہ پاتے ہی ایک دوسرے پر پل پڑتے ہیں۔ گھمسان کا رن پڑتا ہے جس سے میدانِ جنگ لرز اُٹھتا ہے۔ مرغ ایک دوسرے کی دِل کھول کر پٹائی کرتے ہیں۔ اِس جنگ میں دونوں فریق لڑ لڑ کر نہ صرف لہولہان ہو جاتے ہیں بلکہ اِن کے بال و پر بھی جھڑ جاتے ہیں۔ کسی کی آنکھ بند ہو جاتی ہے تو کسی کی کلغی کٹ کی زمین پر گر جاتی ہے۔ اگر لڑائی مزید شدت اختیار کر جائے تو مرغ اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ اِس لڑائی کی خاص بات یہ ہے کہ اِس میں پہلے مرغ لڑتے ہیں، بعد میں مرغ لڑانے والے لڑتے ہیں جس سے اندیشہ نقصِ اَمن پیدا ہو جاتا ہے۔ اِس لڑائی پر لاکھوں روپے کا جوا بھی کھیلا جاتا ہے جس کے نتیجے میں بادشاہ گدا اور کنگال مالامال ہو جاتے ہیں۔ دوسری طرف جو مرغ بازی ہار جاتا ہے اِسے یا تو مالک کاٹ کر کھا جاتا ہے یا اِسے بے رحم ہوٹل والوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ چونکہ اِس کا جسم کسرتی ہوتی ہے اِس لیے ہوٹل والے اِسے گلانے کے لیے میٹھے سوڈے کا استعمال کرتے ہیں۔ اِس عمل کیمیائی سے اِس کی ہڈیاں تک گل جاتی ہیں گویا خس کم از جہاں پاک۔

عوام الناس کے علاوہ مرغ ادبیات پر بھی اثرانداز ہوا ہے۔ ابھی چند دِن پہلے کی بات ہے کہ ایک مشاعرے میں اِس شعر پر ہال بھر کر داد دی گئی جس میں شاعر نے اپنے محبوب کی رنگت کو فارسی مرغ سے، زلفوں کو امرتی سے اور گردن کو یادگارِ پاکستان کے مینار سے تشبیہ دی تھی۔ یہی نہیں اگر آپ اُردو اَدب میں موجود ضرب الشال پر نظر دوڑائیں تو آپ کو مرغ سرفہرست کھڑے ہوئے نظر آئیں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ اِس کی ذات میں بے شمار اور بے بہا خزانے پوشیدہ ہیں۔ ذرا ہمت رسا کو تازیانہ تو لگایئے، پھر دیکھئے کہ اِس پرندے نے اُردو اَدب میں کیسے کیسے رنگ بھر دیئے ہیں۔

آپ نے مرغ پھنسانے کا ذکر تو اکثر سنا ہوگا۔ اِس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ مرغ کو کسی آہنی شکنجے میں پھنسا لیا جائے یا کسی پنجرے میں قید کر لیا جائے بلکہ اِس کا عمومی مطلب یہ ہوتا ہے کہ جہاں پر چار یار اکٹھے ہو جائیں تو اِن میں سے کسی ایک کو کسی بات پر پھنسا کر اِس سے

چائے پی لی جاتی ہے' کھانا کھالیا جاتا ہے یا فلم وغیرہ دیکھ لی جاتی ہے۔ اِس عمل کو عام طور پر مرغ پھنسانا کہا جاتا ہے۔ اِس مہم میں جو شخص پروڈیوسر بنتا ہے' اِسے مرغا ہی کہا جاتا ہے۔ یہ اصطلاح عام طور پر اسکول کالج کے طالب علموں اور سرکاری و غیر سرکاری دفاتر میں کام کرنے والے کارکنوں میں استعمال ہوتی ہے۔ جو گا ہے بگا ہے اپنے کسی نہ کسی دوست یا ساتھی کو پھنسا کر چائے پی لیتے ہیں یا پکوڑے سموسے اُڑا لیتے ہیں۔ اِس طرح جو کسی رفیق یا رقیب کو پھنساتے ہیں تو وہ بڑے فخر سے دوسروں سے یہ کہتے ہیں کہ آج ہم نے ایک موٹا مرغ پھانس لیا ہے' بس حلال کرنا باقی ہے--- اِس طرح اِس بے چارے کی بیٹھے بٹھائی شامت آ جاتی ہے جو کہ اِس کی جیب ہلکی کرنے کا موجب بن جاتی ہے لیکن ہر بار ایسا نہیں ہوتا۔ آج کے شکاری کل خود شکار بن جاتے ہیں کیونکہ محفل یاراں میں ون وے ٹریفک نہیں چلتا بلکہ آج ہماری تو کل تمہاری باری کا اصول چلتا ہے۔

مرغا صرف ہانڈی اور کڑاہی میں ہی نہیں بنایا جاتا ہے بلکہ اسکولوں کی چار دیواری میں بھی بنایا جاتا ہے۔ جو طالب علم اپنا سبق یاد کر کے نہیں آتے ہیں' انہیں ماسٹر جی ''مرغا'' بنا دیتے ہیں۔ مرغے کی یہ حالت بے عزتی اور رُسوائی کا موجب ہوتی ہے جس سے سزا یافتہ طالب علموں کی اچھی خاصی سبکی ہو جاتی ہے اور وہ کلاس میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتے۔ اِس سزا سے بچنے کے لیے وہ نہ صرف سبق یاد کر کے آتے ہیں بلکہ ہوم ورک بھی مکمل کر کے آتے ہیں۔

بات چل نکلی ہے تو کافی دُور تک جاتی ہے۔ یہ رسم صرف اسکولوں کی حد تک محدود نہیں ہے بلکہ سڑکوں اور تھانوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ آپ زیادہ حیران نہ ہوں۔ اکثر ڈرائیوروں کو ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی پر ٹریفک پولیس کے ہاتھوں ''مرغا'' بننا پڑتا ہے۔ یہ تماشا سرِ عام ہوتا ہے جو کہ لوگوں کے لیے تفریح کا باعث بنتا ہے۔ اِس کارروائی کا طلاق صرف اِن ڈرائیوروں پر ہوتا ہے جو کہ چھوٹی موٹی غلطیوں کے مرتکب ہوتے ہیں یا جن کا چالان کرنا مقصود نہیں ہوتا بلکہ انہیں عوام کے سامنے شرمندہ کرنا ہوتا ہے تا کہ وہ آئندہ ون وے وغیرہ کی خلاف ورزی نہ کریں۔ اِسی طرح بعض اوقات کھلنڈرے موٹر سائیکل سواروں کو بھی ڈبل سواری کی پابندی نہ کرنے پر بیچ چوراہے میں مرغا بننا پڑتا ہے۔ دوسری طرف تھانوں میں چوری چکاری کرنے والے ملزموں کو بھی مرغا بنایا جاتا ہے۔ اِس سزا کے تحت انہیں اپنے دونوں ہاتھ ٹانگوں کے نیچے سے گزار کر کانوں تک لے جانے پڑتے ہیں۔ اِس عمل کو کان پکڑنا بھی کہتے ہیں۔ اِس سزا میں مزید رنگ بھرنے کے لیے ملزم کی پیٹھ پر وزنی پتھر رکھ دیا جاتا ہے جس کی تاب نہ لا کر وہ لڑکھڑانے لگتا ہے۔ چنانچہ اِسے اعترافِ جرم کرنے میں ہی اپنی خیریت نظر آتی ہے۔

مرغ کی بدولت غذائی شعبے میں حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے۔ کم از کم دس امراض تو ہمیں بھی معلوم ہیں جن سے شفا کا راز مرغ میں پوشیدہ ہے۔ روزمرہ کے تجربات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ مرغ سے بڑھ کر کوئی غذا مفرح اور مسکن نہیں۔ اِس کا گوشت بیدار کن بھی ہے اور خواب آور بھی' ہاضم بھی ہے اور قابض بھی اور خدا جھوٹ نہ بلوائے تو مقوی بھی ہے۔ سردیوں میں رات کو اِس کی یخنی کا ایک پیالہ پی لیں' مجال ہے جو سردی نزدیک بھی پھٹک جائے۔ طب کی کتابوں میں پڑھا تھا کہ پستہ' بادام اور کاجو کھانے سے کمزوری اور نقاہت کا احساس نہیں ہوتا لیکن صاحب اِن کتابوں کو دیمک چاٹ گئی۔ امرِ واقع یہ ہے کہ آج کا دَور مرغ کا دَور ہے۔ ایک پیالہ سوپ کا نوش جان کیجئے اور رات بھر سرور کی بانسری اور مسرت کے شادیانے بجائیں۔ بھلا ہو سفید فام مرغ کا کہ جس کی آمد کے طفیل گائے کے گوشت سے نجات ملی جو بڑوں بڑوں سے سر توڑ کوشش کے باوجود ترک نہ ہو سکی وگرنہ صورتِ حال کچھ ایسی تھی۔ کسی بھی شادی والے گھر چلے جائیں۔ دروازے پر گائے ڈکراتی ہوئی نظر آتی تھی۔ جس کی بوٹیاں کھا کر نہ صرف آنتوں اور دانتوں کا کباڑہ ہو جاتا تھا بلکہ بلڈ پریشر کا تحفہ بھی مل جاتا تھا۔

مرغ کی ذات کے ساتھ جہاں اَن گنت خوبیاں وابستہ ہیں' وہاں کچھ خامیاں اور خرابیاں بھی جڑی ہوئی ہیں۔ اِس کے بارے میں آئے دِن یہ خبریں پھیلتی رہتی ہیں کہ مرغیوں میں برڈ فلو کی بیماری پھیل گئی ہے جس سے انہیں کھانے والا موت کا نوالہ بن سکتا ہے۔ اِن افواہوں میں کتنے فیصد حقیقت ہوتی ہے' یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اِس بیماری سے خوفزدہ ہو کر لاکھوں کروڑوں اِنسان مرغ کھانا چھوڑ دیتے ہیں اور دال سبزی سے ناطہ جوڑ لیتے ہیں کیونکہ جان سب کو پیاری ہوتی ہے۔ اِس بائیکاٹ سے مرغ برادری کو سکھ کا سانس لینے کا موقع مل جاتا ہے۔ اِس طرح مرغ آبادی کا اچھا خاصا حصہ چھری کے نیچے آنے سے بچ جاتا ہے۔

دوسری طرف پولٹری فارم والوں کے چہرے کا جغرافیہ خراب ہو جاتا ہے۔ اِن کے منہ کا دہانہ دونوں کانوں کے ساتھ مل جاتا ہے۔ جن لوگوں نے زیادہ مال ڈال رکھا ہوتا ہے' اِن کے گھروں میں تو صفِ ماتم بچھ جاتی ہے کیونکہ کوئی بھی مرغی فروش اِن کا مال اُٹھانے پر تیار نہیں ہوتا۔

سفیر

سوزِ اُلفت چھپائے بیٹھا ہوں
آگ گھر میں لگائے بیٹھا ہوں
دردِ اُلفت چھپائے بیٹھا ہوں
لاکھ طوفاں دبائے بیٹھا ہوں
کھو دیا یاد آنے والے نے
آج سب کچھ بھلائے بیٹھا ہوں
اُٹھ کے اے درد تو دوا بن جا
مَیں بہت تنگ آئے بیٹھا ہوں
اَب ہوئی آہٹ اَب کوئی آیا
دَر پہ آنکھیں لگائے بیٹھا ہوں
رات مر مر کے رات کاٹی ہے
ہر دَم اُٹھ اُٹھ کے ہائے بیٹھا ہوں
اُن کی تصویر روبرو ہے سفیر
دِل کی دُنیا بسائے بیٹھا ہوں

فلم "قربانی" کا شاعر

آپ جیسا کوئی میری زندگی میں آئے
تو بات بن جائے ہاں ہاں بات بن جائے
گل کو بہار' بہار کو چمن
دِل کو دِل' بدن کو بدن
ہر کسی کو چاہیے تن کا ملن
کاش مجھ پہ ایسا دِل آپ کا بھی آئے
تو بات بن جائے --- ---
مَیں اِنسان ہوں فرشتہ نہیں
ڈر ہے بہک نہ جاؤں کہیں
تنہا دِل نہ سنبھلے گا پیار بنا یہ ترسے گا
آپ سا کہاں ہے دِل آپ کو ہی پائے
تو بات بن جائے --- ---

سعید خاں

مار بیوی سے کھائے بیٹھا ہوں
سر پہ پٹی سجائے بیٹھا ہوں
وار پھکنی کا کھائے بیٹھا ہوں
کھانا اَب تک چھپائے بیٹھا ہوں
مانگا کھانا تھا نہ دیا اُس نے
بس فقط جھاڑ کھائے بیٹھا ہوں
اُٹھ کے دو قدم چل نہیں سکتا
ایسی ٹانگیں تڑائے بیٹھا ہوں
اَب ہوئی آہٹ اَب کوئی آیا
ڈر سے خود کو چھپائے بیٹھا ہوں
اِک سہارا سا ہو گیا ہے بس
سوکھے ٹکڑے چبائے بیٹھا ہوں
اپنی تقدیر روبرو ہے سعیدؔ
دِل کی دُنیا لٹائے بیٹھا ہوں

محمد اسلم قریشی

ہم جیسا کوئی تیری برسی منائے
تو بات بن جائے ہاں ہاں بات بن جائے
تم کو بخار' بخار میں جلن
موت کو تم' تم کو کفن
ہر کسی کو چاہیے ایسا ہی ملن
کاش' تجھ پہ ایسا وقت جلدی جلدی آئے
تو بات بن جائے --- ---
تم شیطان ہو فرشتہ نہیں
جلدی سے اَب بھاگ جاؤ کہیں
تنہا دِل نہ سنبھلے گا پیار بنا نہ تڑپے گا
تم نے ڈسا ہے رَبّ تم کو اُٹھائے
تو بات بن جائے --- ---

جب ہم نے ہوٹل کا نام سنا تو بوکھلائے جو وہ سمجھ رہے ہیں' لڑکا وہ نہیں کرتا۔ ہم نے اُنہیں بتایا کہ KFC کا مطلب ہے ''کاکا فروٹ چاٹ والا'' --- جب اُنہوں نے یہ سنا تو ہمیں عزت و احترام (دھکے دے کر) سے رُخصت کیا۔

ہم یہ رشتوں کا کام ایک ہی دِن میں مکمل کرنا چاہ رہے تھے کہ جب ایک عورت کو کوئی بات پتہ چل جائے تو دوسرے دِن تک پورے محلے میں بات پہنچ جاتی ہے۔ بس یہی وجہ تھی کہ ایک ہی دِن میں تمام رشتے دیکھنے تھے --- اِس کے بعد اگلے گھر جاتے جاتے خود کو ڈانٹا کہ اَب کام بتائیں گے' مطلب نہیں اور رشتہ پکا کر کے ہی جائیں گے۔ پھر جب ہم نے ایک گھر میں ڈیرہ جمایا تو لڑکے کے بارے میں بولے کہ ہمارا لڑکا بڑا شریف ہے۔

''آج کل کے زمانے میں شریف لڑکا --- کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ۔'' وہ فوراً بولے۔

''مم --- میرا مطلب اُس کا نام شریف ہے۔''

''کام کیا کرتا ہے؟''

''Standing boy ہے۔''

''جی' کس کمپنی میں؟''

''کمپنی میں نہیں' ہمارے محلے میں ہر وقت چوک میں کھڑا رہتا ہے اور ہر آنے جانے والی لڑکی پر نظر رکھتا ہے۔''

اِس بار وہ عورت جو اُٹھی تو لپک کر ہماری طرف بڑھی اور ہم نے اپنا بچاؤ کرتے ہوئے باہر بھاگنا چاہا (جو ہم صبح سے کر رہے تھے) پر پکڑے گئے۔ اِس عورت کے ہاتھ میں ہمارا برقع آ گیا اُس نے گھما کر دیوار سے مارا پر ہم بچتے ہوئے برقعے سے باہر نکل چکے تھے۔ پھر ہم نے منہ گھر کی طرف کیا اور 180 کی سپیڈ سے گھر پہنچے اور توبہ کی کہ آئندہ رشتہ دیکھنے نہیں جائیں گے۔ اَب تو اُن گلیوں سے گزرتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے کہ کہیں کوئی پہچان ہی نہ لے۔ پھر ہم نے تو یہی نتیجہ نکالا ہے کہ ''جس کا کام اُسی کو ساجھے!''

☆☆

یہ عالم ہے شوق کا

ڈاکٹر فیاض محمد مغل' اسلام پور نزد کینٹ مانسہرہ

صاحب! ہر شخص کو کسی کام کا شوق ہوتا ہے۔ کسی کو بھینس پالنے کا شوق ہے تو کسی کو دُودھ پینے کا۔ کچھ لوگوں کو گھوڑے پالنے کا شوق ہوتا ہے تو کچھ کو سواری کا۔ اکثر لوگوں کو سگریٹ نوشی کا شوق ہوتا ہے۔ ایک صاحب نے دھوئیں کے مرغولے دُکاندار کے چہرے پر چھوڑے تو دُکاندار نے ناگواری کا اظہار کیا تو صاحب بولے۔

''ابھی ابھی یہاں ہی سے تو خریدا ہے۔''

دُکاندار سے نہ رہا گیا' بولا۔ ''یوں تو ہم قبض کشاء گولیاں بھی بیچتے ہیں۔''

ایک انگریز عورت کو کُتے پالنے کا شوق تھا۔ اُس کی شادی ہو گئی۔ ایک دِن شوہر نے کہا۔

''ایک گھر میں پچاس کُتے زیادہ ہیں۔''

موصوفہ کو غصہ آ گیا اور کہنے لگی۔ ''جو کتا نہیں ہے' وہ بے شک گھر سے نکل جائے۔''

مجبوراً شوہر کو گھر سے نکلنا پڑا۔

ایک صاحب کو موبائل پر باتیں کرنے اور ایس ایم ایس کرنے کا شوق ہے۔ اکثر اُن کے ہاتھوں میں دو موبائل نظر آتے ہیں اور وہ دونوں ہاتھوں سے ایس ایم ایس کر رہے ہوتے ہیں۔ اپنا نام اور عہدہ بدلنے کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی اپنی جنس بھی تبدیل کر لیتے ہیں۔ لڑکیوں کی گالیاں بھی بڑے شوق سے سنتے ہیں جب اُنہیں شاعری کا دورہ پڑ جائے تو نان سٹاپ شاعری شروع ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری کو روکنے کے لیے روغنی نان منگوائے جاتے ہیں۔

ایک عورت کو بلی پالنے کا شوق تھا۔ وہ اپنی بلی کی گمشدگی پر نڈھال تھی۔ شوہر نے مقامی اخبار میں بلی کی گمشدگی کا اِشتہار دیا اور بلی لانے والے کے لیے دس لاکھ روپے کا انعام مقرر کیا۔ اخبار کے ایڈیٹر نے پوچھا۔

''ایک بلی کے لیے یہ رقم زیادہ نہیں ہے؟''

''کوئی زیادہ نہیں کیونکہ مَیں نے خود بلی کو ہلاک کر کے دریائے جہلم میں پھینکا ہے۔'' شوہر نے جواب دیا۔

کچھ لوگوں کو موبائل تبدیل کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ جب ایک ایسے ہی شخص سے وجہ پوچھی گئی تو اُس نے جواب دیا۔

''شادی کرنے اور موبائل خریدنے کے بعد اکثر افسوس ہوتا ہے کہ اگر کچھ دیر اور ٹھہر جاتے تو اچھا ماڈل مل جاتا۔''

ایک عورت کو اپنے شوہر کے کُتے پر بڑا رشک آتا تھا جسے اُس کے شوہر نے بڑے شوق سے پالا تھا۔ ایک دِن اُس نے اپنے شوہر سے کہا۔

''مَیں نے دیکھا ہے آپ مجھ سے زیادہ اپنے کُتے سے پیار کرتے ہیں۔''

البتہ خوش قسمتی سے آخری منٹ میں' مَیں نے پھرتی دِکھاتے ہوئے تھوڑی سی بات کرہی لی۔"

"کیا کہا تم نے؟"

"خدا حافظ---!" مَیں نے جواب دیا۔

نازیہ ناز نازی نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ "خادم حسین مجاہد ایسے شیخ ہیں جو کاغذ پر پنسل سے بکرے کی تصویر بنا کر قربانی کرتے ہیں"--- مَیں نے جب اُن کے پاس "اصلی" بکرا دیکھا تو حیران ہوا۔ مَیں نے سوچا نازیہ ناز نازی ایسے ہی شیخوں کے خلاف لکھتی ہیں۔

"یہ بکرا کتنے کا خریدا؟" مَیں نے پوچھا۔

"خریدا نہیں' بیچنے کے لیے جا رہا ہوں۔" جواب ملا۔

خادم حسین مجاہد جتنے بڑے مزاح نگار ہیں' اِتنے ہی مخلص اور ملنسار۔ وہ تو باتیں بھی ایسے پیار محبت سے کرتے ہیں کہ بندہ شک میں پڑ جاتا ہے کہ کہیں قرض ہی نہ مانگ لیں۔ پسندیدہ لباس شلوار قمیص ہے البتہ کبھی کبھی دھوتی بھی باندھ لیتے ہیں مگر اِس دن نہیں باندھتے جب محکمہ موسمیات والوں نے بتایا ہو کہ آندھی آنے کا امکان ہے---سر پر بال نہ ہونے کی وجہ سے اکثر منہ دھوتے وقت پریشان ہو جاتے ہیں کہ منہ کی حدود کہاں ختم ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ مرغی انڈہ آسانی کے ساتھ دے لیتی ہے مگر مزاح تولد کرنا نہایت مشکل کام ہے مگر موصوف ہر ماہ چاند' حکایت' اخبارِ جہاں' ندائے ملت' جو بھی میگزین اُٹھائیں اس میں اُن کی تحریر ضرور ہوتی ہے۔ اِس بات سے اندازہ لگائیے کہ موصوف ہر ماہ کتنے انڈے---سوری' مضامین لکھتے ہیں۔ اِن کی دو کتابیں مارکیٹ میں آچکی "دست وگریباں" اور "قلم آرائیاں" کہتے ہیں کہ میری کتابیں چھپنے کا قصہ بھی عبرتناک ہے جب مَیں نے تحریریں اکٹھی کر کے کمپوزر کو دیں تو اُس کے باپ کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ کمپوزنگ مکمل ہونے کے بعد وائرس پڑا اور اِس کا کمپیوٹر اُڑ گیا۔ دوبارہ مکمل کر کے پبلشر کو دیا تو اِسی دن اُس کا اِنتقال ہو گیا۔ دوسرے پبلشر کو دیا تو اُسے نقصان ہو گیا' اُس کے ملازم بھاگ گئے۔ جس بائنڈر نے کتاب تیار کی' اُس پر کیس بن گیا اور اُس کا دفتری کھاتہ سیل ہو گیا--- ہماری سنیئے ہم نے اُن کے بارے میں لکھنے کا سوچا تو دو ماہ پہلے ہی ہمارا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔

"چاند میں اِن کا کالم "مجاہدے" کے عنوان سے ہر ماہ شائع ہوتا ہے۔ ادارہ چاند نے اِن کے کالم پر تلوار کا نشان بنایا ہوتا ہے' بس اِسی سے اندازہ کیجئے کہ اِن کا کالم کتنا کاٹ دار ہوتا ہے۔ اِس کالم میں موصوف سیاست دانوں سے وہی سلوک کرتے ہیں جن کے وہ مستحق ہیں۔ اگر قلم کے بجائے اِن کے ہاتھ میں تلوار ہوتی تو وہ معاشرے سے کتنی ہی "بُرائیوں" کا خاتمہ کر چکے ہوتے۔ جس موضوع پر بھی ہاتھ---سوری' قلم اُٹھاتے ہیں' اِس کے ساتھ پورا پورا انصاف کرتے ہیں۔ جب لکھتے ہیں تو اندھادھند لکھتے ہی جاتے ہیں۔

اسکول میں بطور اُستاد فرائض انجام دے رہے ہیں' پارٹ ٹائم میڈیکل اسٹور کھولا ہوا ہے جس میں "ایزی لوڈ" کا کام بھی ساتھ شامل ہے۔ جب ایزی لوڈ کروانے والے اور میڈیسن لینے والے گاہک اکٹھے ہوں تو عجیب صورتحال بن جاتی ہے۔

گاہک: جناب! پیناڈول کی دس گولیاں دے دیجئے۔

"جی' پیناڈول کا ایزی لوڈ ختم ہو چکا ہے۔" جواب ملے گا۔

گاہک: "جناب! زونگ کا ایزی لوڈ کر دیں۔"

"آپ کو زونگ سیرپ اگلی دوکان سے ملے گا۔"

دِن بھر اسکول میں ڈیوٹی' میڈیکل اسٹور پر کام البتہ رات کو لکھتے ہیں۔ اِن کی اکثر تحریریں پڑھ کر بھی لگتا ہے کہ یہ رات کو ہی لکھی گئی ہیں۔ میڈیکل اسٹور رکھنے کی وجہ سے آدھے ڈاکٹر ہیں۔ اگر کوئی شخص ملنے بھی چلا آئے تو اِس میں بیماریاں تلاش کرتے رہتے ہیں۔ اکثر کو کہتے ہیں کہ آپ کے معدے کا نیٹ ورک خراب ہونے والا ہے' آپ بوتل' چائے' روٹی سے پرہیز کریں ورنہ آپ ڈلیٹ Delet ہو جائیں گے۔ بندہ کہے گا کہ جناب! اِن چیزوں سے پرہیز سے مجھے فائدہ ہو گا؟

"آپ کا تو پتہ نہیں' مجھے ضرور فائدہ ہو گا۔" آہستہ سے جواب ملے گا۔

پچھلے دِنوں بس اسٹاپ کے قریب سے گزر رہے تھے۔ ایک نوجوان لڑکے کو کھانستے دیکھا تو اِن میں جذبہ ہمدردی اُبھرا۔ نوجوان کے پاس گئے اور اِس کے لیے کھانسی کا شربت تجویز کیا۔ نوجوان بولا۔

"جناب! وہ جو سامنے لڑکی کھڑی ہے' اِس کے لیے بھی کوئی نسخہ تجویز کر دیں۔ ایک گھنٹے سے کھانس رہا ہوں' متوجہ ہی نہیں ہو رہی۔"

"کہتے ہیں کہ مَیں زندگی میں اللہ کے سوا کسی کے آگے جھکا نہیں ہوں۔ مَیں نے کہا کہ ذرا جھکے بغیر اپنے بوٹوں کے تسمے تو بند کر دیجئے---سگریٹ نہیں پیتے کہتے ہیں۔ ایک سگریٹ پینے سے ایک منٹ زندگی کم ہوتی ہے۔ مَیں نے کہا کہ ایک قہقہہ لگانے سے پانچ منٹ زندگی بڑھتی ہے۔ آپ قہقہے لگاتے ہوئے سگریٹ پیا کریں۔ اگر کوئی اِن کی تحریر سے ایک لفظ بھی چوری کر لے تو فوراً "رولا" ڈالتے ہوئے کہیں گے کہ "شرم تم کو مگر آتی نہیں۔"

چھپکلی سے ڈرنے والی عورت ملک کو کیا سنبھالے گی؟ ☺ توصیف احمد توصی

خادم حسین مجاہد مزاح کی دُنیا میں ایک روشن ستارے کی مانند ہیں۔ کسی بھی موضوع پر لکھیں، لفظوں کو موتیوں کی طرح پرو دیتے ہیں۔ اِن کی ہر تحریر میں مزاح کے ساتھ ساتھ اصلاح کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ مزاح لکھنا مشکل ترین کام ہے۔ مَیں خادم حسین مجاہد کے بلند حوصلہ کی داد دیتا ہوں کہ اُنہوں نے اپنے لیے مشکل میدان منتخب کیا۔ اُن کی تحریریں اُن کی محنت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اللہ سے ہماری دُعا ہے اللہ اُنہیں ہر میدان میں کامیاب سے ہمکنار کرے، آمین!

☆☆

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے

۞ سیّد محمود گیلانی

وہ ایک باریش، خوبصورت، میانہ قد آدمی تھا۔ عمر میں 25/26 سے زیادہ نہیں تھا۔ شادی شدہ ہونے کی ساتھ ساتھ دو بچوں کا باپ بھی تھا۔ بیوی بچوں اور اپنا پیٹ پالنے کے لیے راولپنڈی میں ایک ہوٹل میں ویٹر کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ اُس کا نام رحمت تھا۔ آج جب وہ کام سے فارغ ہو کر تھکا ہارا اپنے کمرے میں پہنچا۔ ابھی آرام کرنے بستر میں گھسا ہی تھا کہ اِس کے موبائل کی بیل بجی۔ نمبر کوئی نیا ہی تھا، کوئی لڑکی بول رہی تھی۔

''مَیں آپ سے دوستی کرنا چاہتی ہوں۔ آپ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں، بڑی مشکل سے آپ کا نمبر ملا۔ میرا نام نادیہ ہے۔۔۔''

دو چار دِن رحمت اُس سے جان چھڑانے کی کوشش کرتا رہا لیکن ایک دِن وہ اُس کے جال میں پھنس گیا۔ یاد رہے کہ نادیہ سچ مچ لڑکی نہیں تھی، وہ ہوٹل کا نوجوان مالک حسن تھا جس میں رحمت کام کرتا تھا۔ وہ وائس چینجر لگا کر اِسے بے وقوف بنا رہا تھا۔ یوں اِن کی باتیں ہوتی رہی اور اِن کی دوستی پختہ ہوتی جا رہی تھی۔ وہ روزانہ ہوٹل سے دو سو روپے مزدوری لیتا اور ایک سو کا نادیہ کو ایزی لوڈ کروا دیتا۔ نادیہ کے پیار میں وہ کانا اور پھر اندھا ہوتا چلا گیا۔ آج کل وہ ہوٹل میں کام کرتے ہوئے بھی کچھ اُداس اُداس سا ہوتا۔ ہر وقت نادیہ کے خیالات میں کھویا ہوتا۔ اُسے نہ اپنی بیوی کی پرواہ تھی اور نہ بچوں کی۔ حالات اِتنے ناگزیر ہو چکے تھے کہ اُس کے بچے اکثر اوقات فاقہ کشی پر مجبور ہو جاتے۔ دو مہینے سے اُس نے گھر کے اخراجات کے لیے کچھ نہیں بھیجا تھا۔ ہوٹل کا مالک حسن اِس کی وجہ پوچھتا تو رحمت ماں کی بیماری کا بہانہ بنا دیتا۔

وقت گزرتا گیا، آج نادیہ دِھیمے دِھیمے لفظوں میں کہہ رہی تھی۔

''رحمت! مَیں نے کالج چھوڑ دیا ہے۔''

رحمت کہنے لگا۔ ''کیوں نادیہ کیوں؟ تم ایسا ہرگز نہ کرو، آخر مسئلہ کیا ہے۔ پلیز، تم مجھے پرابلم بتاؤ؟''

نادیہ کہنے لگی۔ ''اُسے اپنے زخم کیا دِکھاؤں جس کے پاس اِس کا مرہم نہ ہو۔''

رحمت نے اُسے یقین دلایا کہ وہ اِس کی مدد کرے گا تو نادیہ کہنے لگی۔

''جانو! پاپا کی نوکری ختم ہو گئی ہے۔ گھر کا نظام دھرم بھرم ہے، پیسے اِتنے نہیں کہ گھر کا نظام چلایا جا سکے تو میرے کالج کے اخراجات کیسے پورے ہوں گے؟''

رحمت نے اُسے سات بجے شام ایوب پارک میں بلایا اور خود حسن کے پاس گیا اور کہنے لگا۔

''میری ماں بیمار ہے، مجھے ابھی پانچ ہزار روپے چاہئے۔''

حسن نے کہا۔ ''صبح لے جانا۔''

وہ کہنے لگا۔ ''نہیں، مجھے ابھی اور اِسی وقت چاہئیں، ماں کی طبیعت بہت خراب ہے۔''

روپے لے کر وہ ایوب پارک روانہ ہوا۔ بیس منٹ بعد حسن نے موٹر سائیکل سٹارٹ کیا اور ایوب پارک روانہ ہو گیا۔ رحمت نے وہاں جا کر نادیہ کو کال کی۔

''کدھر ہو جان؟''

حسن نے ایک لڑکی جو اکیلے بیٹھی تھی، اُس کا بتایا کہ فلاں بینچ پر ہوں اور خبردار بھی کیا کہ لوگ دیکھ رہے ہیں۔''

رحمت اِس اُداس اور اکیلی لڑکی کے پاس گیا اور جا کر کہنے لگا۔

''جان! تم نے مجھے بہت تڑپایا، یہ لو پانچ ہزار روپے اور یہاں سے کہیں اور چلتے ہیں۔''

لڑکی نے اُتارا جوتا اور رحمت کے سر پر دے مارا اور شور مچانا شروع کر دیا۔

اور لوگ بھی آ گئے اور اِس کی خوب ٹھکائی کی۔ اِتنے میں حسن بھی آ گیا، اُس نے رحمت کو چھڑایا اور ہوٹل کی راہ لی۔

کچھ دِن بعد نادیہ کی پھر کال آ گئی، کہنے لگی۔

''رحمت! مَیں بہت شرمندہ ہوں۔ اِس دِن وہاں میرے بھائی بھی تھے، اگر مَیں ایسا نہ کرتی تو تمہیں پتا ہے کہ میرے ساتھ کیا ہوتا۔''

رحمت ایک دفعہ پھر اُس کی باتوں میں آ گیا اور کہنے لگا۔

مَیں نے گھبرا کر اویس کی طرف دیکھا اور اویس نے جواباً مجھے گھورا۔

''بالے خان! حوصلہ رکھو' ضرورت پڑی تو مَیں تم سے 302 بھی کراؤں گا۔'' یہ کہتے ہوئے اویس نے میری طرف دیکھا اور مَیں گھبرا گیا۔

''شاہ جی! حوصلہ ---'' شاہد نے مجھے حوصلہ دیا۔

''بالے خان! اویس کی خاطر یہ کام کر دو۔'' شاہد نے بالے خان کی منت سماجت کی۔

کافی منت سماجت کے بعد بالے خان اِس کام پر آمادہ ہو گیا اور اگلے دِن' یعنی اتوار کی صبح کو پلازے جانے کا پروگرام بنا۔

''مَیں صرف اور صرف یہ کام اویس کی خاطر کر رہا ہوں کیونکہ یہ میرا جگر ہے۔''

یہ کہتے ہی بالے خان نے اویس کو جپھی ڈال لی اور اویس کسمسا کر رہ گیا۔

اتوار کی صبح مَیں تیار ہو کر پلازہ پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر بعد شاہد صاحب بھی آ دھمکے۔ اتوار کا دِن تھا' پلازے میں رونق بھی بہت تھی۔

''ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟'' شاہد میاں رونق سے لطف اندوز ہوتے ہوئے گویا ہوئے۔

''تیرا رشتہ ڈھونڈنے آئیں ہیں۔'' مَیں نے جل کر جواب دیا۔

''یہ اویس کیوں نہیں آیا؟'' شاہد نے پوچھا اور مَیں نے اویس کو فون لگا دیا۔

''ہیلو' یار اویس! کہاں ہو؟''

''بستر میں ---'' اویس کی نیند بھری آواز آئی۔

''بستر میں' کس کے ساتھ؟'' میرے ذہن میں بابلے خان گھوم گیا۔

''چپ کر' اوئے!'' اویس دھاڑا۔ ''ہر وقت ''دوستانہ'' نہ بنایا کر۔''

''اوہ' سوری یار ---!''

''سوری کے باپ' آتا ہوں ابھی مجھے پتہ ہے تم پہنچ چکے ہو۔''

فون بند ہو گیا۔

تھوڑی دیر میں اویس اور بابے خان بھی آ گئے۔ ہم نے بالے خان کو وہ دُکان دِکھائی جس میں وہی تین جوان کھڑے تھے جو میرے خواب میں آئے تھے۔ بالے خان نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' سیدھا گھس گیا دُکان کے اندر اور دھاڑا۔

''اوئے' کون ہے جو ساڈے یار کی دُکان پر قبضہ کر کے بیٹھا ہے؟''

اُس کی دھاڑ سے ہم پریشان ہو گئے۔

''ابے یار! یہ تو ہماری عزت کا فالودہ نکال دے گا۔'' شاہد بولا۔

''تو اَب مَیں کیا کروں؟ تو صی نے ہی کہا تھا' اَب بھگتو۔'' اویس بولا۔

اِتنے میں بالے خان کی دھاڑ دوبارہ سنائی دی' اَب کی بار اُس نے ایک جوان کو اُٹھا کر دُکان سے باہر پھینک دیا۔ اِس بار میرے اوسان خطا ہو گئے۔ معاملہ کچھ زیادہ بگڑ گیا تھا' باقی دونوں دُکاندار ایکشن میں آ گئے اور بابلے خان پر پل پڑے۔ مَیں نے باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ مجھے دیکھ کر شاہد بھی دوڑا اور ہم دونوں کو پکڑنے کے لیے اویس دوڑا مگر اویس کو بالے خان نے پکڑ لیا۔

''اوئے' بھاگتا کہاں ہے؟ مجھے بچا' یار!'' بالے خان گھگھیایا۔

''دوڑتے دوڑتے میرے کانوں میں اویس کی آواز سنائی دی۔

''تو صی! تیرا ستیاناس' تجھے تو نہیں چھوڑوں گا۔''

ذرا دُور آ کر مَیں نے فیصل کو فون ملایا۔

''یار! کہاں ہو؟''

''مَیں تو شہر سے باہر ہوں' خیر تو ہے؟'' فیصل کی آواز سنائی دی۔

''رولا ہو گیا' ہم تمہاری دُکان خالی کرانے آئے تھے بالے خان کو لے کر مگر یہاں تو اُلٹا چکر چل گیا۔''

''ابے گدھو! یہ کیا کیا؟ ایک بار مجھ سے تو بات کر لی ہوتی۔ کل شام ہماری اُن سے ڈیل ہو گئی تھی۔ وہ آج شام تک دُکان خالی کر دیں گے اور تم ---'' فیصل بیچارہ روہانسا ہو گیا۔

''اَب ہم کیا کریں؟''

''بھاگو وہاں سے' کم بختو!''

اور فون بند ہو گیا۔ اِتنے میں وہاں پولیس بھی آ گئی۔ تھوڑی دیر میں اویس بھاگتا ہوا نظر آیا۔ مَیں نے بائیک اُس کی طرف دوڑائی اور اُسے بٹھا کر وہاں سے نکل آیا۔ جب اویس اور شاہد کو فیصل والی بات بتائی تو دونوں نے وہیں بائیک رکوائی اور چڑھ دوڑے مجھ پر۔ بالے خان کو پولیس پکڑ کر لے گئی۔

اگلے دِن فیصل صاحب مجھ سے ملے۔ اُدھر پولیس والوں نے بالے خان کی دُھلائی کی' اِدھر فیصل نے میری اور اویس اور شاہد نے مفت میں تالیاں بجائیں۔

☆☆

کرتے وقت نگل لیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اُس چوہیا کے بچے نے ہماری کسی آنت سے چھیڑ چھاڑ کردی ہو وغیرہ وغیرہ---!

ناشتے کے وقت چائے پراٹھا حاضر تھے۔ پراٹھا منہ میں رکھ کر چبانا تو درکنار چائے کا گھونٹ بھرنا بھی جان جوکھوں کا کام معلوم ہوتا تھا۔ پانی پینے کی غرض سے اُٹھے۔ گلاس لیا کولر سے بھرنا چاہا کہ یکدم کچھ خیال آیا۔ فوراً کولر کا ڈھکن اُٹھایا، غور سے اندر دیکھا کہ اندر کہیں کوئی چوہا تو نہیں۔ جب تسلی ہوئی کہ نہیں ہے تو گلاس بھرا، پھر گلاس میں موجود پانی کا بھی بغور مشاہدہ کیا اور پورا گلاس ایک ہی سانس میں پی لیا۔

تھوڑی دیر بعد لائٹ آ گئی۔ ٹی وی آن کرلیا کہ کہیں ''جیو'' والوں تک تو یہ ''خبر'' نہیں پہنچی مگر جیو والے تو ''سب کہہ دو'' اور ''تم ہی تو ہو'' کے چکر سے ہی باہر نہیں آرہے تھے۔ مختلف چینلز کی آوارگی کے دوران اچانک ہماری اُنگلیاں رُک گئیں۔ کوئی اِنگلش چینل تھا۔ کچھ انگریز چھوٹے موٹے حشرات پکڑ کے کھا رہے تھے۔ رفتہ رفتہ اِن انگریزوں نے کیڑے مکوڑوں سے لے کر مینڈک، کینچوے حتیٰ کہ چوہے اور لاتعداد انواع واقسام کی اشیا کھا ڈالیں۔ ہم نے سوچا کہ یہ گورے بھی آخر ہم جیسے اِنسان ہی ہیں بلکہ ''گورے'' بھی ہیں اور وہ بھی اِتنا ''گندبلا'' کھانے کے باوجود۔ ہم نے کبھی نہیں سنا کہ کوئی مینڈک کھانے سے مرگیا یا چوہا کھانے سے۔ پھر ہم نے تو نادانستگی میں ایک چوہے سے متاثرہ پانی سے وضو ہی کیا تھا۔ اِسی طرح کی سوچیں ہمارے دماغ میں آنے لگیں اور آہستہ آہستہ ہماری طبیعت سیٹ ہونے لگی پھر ہم نے جلد ہی بازار کی راہ لی، چوہے مار گولیاں لینے کے لیے!

☆☆

آپ کا خادم

محمد صابر مغل عبدوپوری

خادم حسین مجاہد مزاح کی دُنیا میں ایک بہت بڑا نام ہے۔ اگر یقین نہ آئے تو ایک ہی سانس میں اِن کا نام پڑھ کر دیکھ لیں، آپ کو یقین ہو جائے گا۔ شیخ برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ مَیں اِن سے ملنے گیا تو چائے کے ساتھ سموسے اُنہوں نے منگوا لیے تو مَیں نے دِل میں سوچا کہ ''شیخ'' ایسے ہی کنجوس مشہور ہیں جبکہ خادم حسین مجاہد تو خاصے مہمان نواز ہیں۔ چائے پینے کے دس منٹ بعد جب کھانا آیا تو مَیں صرف تین چار نوالے ہی کھا سکا تب سموسے کھلانے کا عقدہ کھلا کہ سموسے کس وجہ سے کھلائے گئے تھے کہ بھوک ختم ہو جائے۔ موصوف دُنیا کے واحد خاوند (معاورتاً لکھا ہے) ہیں جن کا دعویٰ ہے کہ اِن کی بیگم اِن کے آگے ایک لفظ بھی نہیں بول سکتی۔ سچ کہتے ہیں۔ بولیں بھی کیسے بے چاری، یہ اِتنے باتونی ہیں کہ اگر بات کرنے کے دوران اِنہیں پیاس لگ جائے تو گلاس منہ کے ساتھ لگا کر ہاتھ کھڑا کر دیتے ہیں کہ کوئی اور نہ بولے، ابھی میری بات مکمل نہیں ہوئی۔ غالباً یہ واحد کام ہے جس میں کوئی بھی عورت اِن کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ بعض لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ موصوف کو کسی عورت کی زبان لگی ہوئی ہے، کوئی بھی موضوع ہو فرفر بولے چلے جاتے ہیں اور کسی جگہ بھی ''سپیڈ بریکر'' نام کی چیز نہیں آتی---''خاموشی اچھی چیز ہے'' اِسی موضوع پر جناب نے دو گھنٹے تقریر کر ڈالی۔ ایک ایسے ہی باتونی سیاستدان ایک جلسے میں تقریر کر رہے تھے۔ جب تقریر بہت لمبی ہوگئی تو اُنہیں احساس ہوا کہ لوگ اِن کی طویل تقریر سے تنگ آ چکے ہیں، وہ بولے۔

''دوستو! مَیں جو یہ باتیں آپ کو بتا رہا ہوں، آپ کی آنے والی نسلوں کی بہتری کے لیے ہیں۔''

مجمع سے آواز آئی۔ ''آپ تقریر جاری رکھیں، ہماری آئندہ آنے والی نسلیں بھی جلسہ گاہ میں پہنچنے والی ہیں۔''

موصوف ایک جگہ ملازمت کے لیے تشریف لے گئے۔ اِنٹرویو لینے والے صاحب نے کہا۔

''ہمیں ایسے اُمیدوار کی ضرورت ہے جو سو لفظ فی منٹ ٹائپ کر سکے۔''

''دو سو لفظ فی منٹ!'' خادم حسین مجاہد نے جواب دیا۔

اِنٹرویو لینے والا حیرت سے بولا۔ ''واقعی---؟''

''دو سو لفظ فی منٹ بول سکتا ہوں۔'' جواب ملا۔

کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے کہ مَیں نے لیڈیز فسٹ پیکیج پر اِن سے بات کرنے کے لیے کال ملائی۔ مَیں نے اِنہیں ''السلام علیکم'' کہا، باقی جو کچھ کہا اُنہوں نے کہا۔ جب دو گھنٹے اِن کا لیکچر سنا تو ایسے لگا کہ مَیں نے کسی اسکول میں داخلہ لے لیا ہو۔ پھر مَیں نے اِنہیں یاد دلایا کہ دو گھنٹے پورے ہونے والے ہیں تو حیرت سے بولے۔

''پتہ ہی نہیں چلا، پانچ منٹ میں ہی دو گھنٹے گزر گئے۔''

عادل گلزار نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کی خادم حسین مجاہد سے بات ہوئی؟ مَیں نے کہا۔

''یار! دو گھنٹے کی کال کی تھی مگر بات نہیں ہوئی۔''

''وہ کیسے؟'' عادل گلزار نے پوچھا۔

''اُنہوں نے موقع ہی نہیں دیا بات کرنے کا، اپنی ہی سناتے رہے

شوہر نے تیز نظروں سے محترمہ کی طرف دیکھا اور کہنے لگا۔ ''خدا کی قسم' یہ مجھ پر کبھی نہیں بھونکتا۔''

کچھ عورتوں کو پڑوسنوں سے لڑنے کا شوق ہوتا ہے اور آئے دن لڑنے کے بہانے تلاش کرتی رہتی ہیں۔ کچھ لوگوں کو افواہیں پھیلانے اور جھوٹ بولنے کا شوق ہوتا ہے مگر بعض دفعہ اُن کو اپنے شوق کے سلسلے میں ناقابل تلافی نقصان سے گزرنا پڑتا ہے' بالکل اِس طرح جیسے کوئی چرواہا روزانہ شور کیا کرتا تھا کہ شیر آ گیا شیر آ گا۔

ایک دن ہمیں یہ شوق پیدا ہوا کہ ہم لوگوں کے شوق معلوم کریں۔ ہم نے مختلف لوگوں سے اُن کے شوق دریافت کیے۔

ایک خاتون کو نت نئے کھانے بنانے کا شوق تھا۔ ایک دن شوہر سے بولیں کہ آپ کو میرا حلوہ پسند نہیں آیا' بچے تو تین پلیٹیں کھا گئے ہیں۔ اِسی دوران اندر سے آواز آئی۔

''امی! ایک اور پلیٹ دینا' ایک کتاب کی جلد رہ گئی ہے۔''

چند لڑکوں نے بتایا کہ اُنہیں سڑکوں اور گلیوں پر کرکٹ کھیلنے کا شوق ہے' اگر حکومت اُن کو موٹروے پر کرکٹ کھیلنے کی اجازت دے تو مزہ ہی آ جائے گا۔

ایک خاتون نے بتایا کہ اُسے جوئیں مارنے کا شوق ہے۔

''میری خواہش ہے کہ میرے پاس ایسی عورتیں آئیں جن کے سروں میں بے شمار جوئیں ہوں۔ جنہیں پکڑ پکڑ کر مارتی رہوں' مجھے جوئیں مارتے ہوئے اِتنا مزہ آتا ہے جس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔''

بہت سے لوگوں نے اپنے شوق بتائے جن میں اہم نسوار خوری' بسیار خوری' سود خوری' چاپلوسی اور چغل خوری ہیں۔ اگر آپ نے اِن میں سے کوئی شوق اپنایا ہوا ہے تو اضافہ کریں ورنہ آج سے اپنانا شروع کر دیں' یقین کریں کہ آپ کو آپ کے مداح مل جائیں گے' مزہ نہ آئے تو شغل واپس۔

☆☆

مشن امپوسیبل

توصیف احمد' میانوالی

ہم ایسے چار درویش تھے جن کے کان ایک دوسرے کے قصے سن سن کر پک گئے تھے مگر پھر بھی جب بھی ملتے' کوئی نہ کوئی نیا قصہ بن جاتا۔ کہتے ہیں کہ خالی دماغ شیطان کا گھر ہوتا ہے مگر ہم نے تو جیسے خود شیطان کو گھر کرائے پر دیا ہوا تھا' جب بھی ملتے کوئی نہ کوئی شیطانی چکر چلا دیتے۔ میرے علاوہ میرے تین دوستوں میں اویس' شاہد اور فیصل شامل ہیں۔ یہ تینوں تاجر برادری سے تعلق رکھتے ہیں اور مَیں ٹھہرا نو سے پانچ کی جاب کرنے والا۔ ایک مزے کی بات اور کہ یہ تینوں آدھے شادی شدہ ہیں' مطلب دو کی منگنی ہو چکی ہے اور شاہد صاحب کا تو نکاح بھی پڑھا جا چکا ہے اور مَیں ٹھہرا ازلی کنوارہ۔ تقریباً ہر ویک اینڈ پر ہماری محفل ٹائم پاس جمتی ہے اور اگلا پورا ہفتہ اِسی محفل کے زیر اثر گزرتا ہے۔ اِس بار جب ہم ملے تو فیصل صاحب کا موڈ خراب تھا' وجہ یہ تھی کہ شہر کے مشہور پلازے میں اُس کی ایک دکان ہے جسے فیصل صاحب نے کرائے پر دیا ہوا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ اَب وہ کرائے دار دُکان پر قبضہ جما کر بیٹھ گئے تھے اور خالی کرنے کو تیار نہیں تھے۔

''چھوڑ یار فیصل! ہمت مرداں دُکانیں بہت۔''

مَیں بولا اور تینوں مجھے گھورنے لگے۔ پتہ نہیں غصہ مجھ پر آیا تھا اُنہیں یا میری ضرب المثل پہ۔''

''اچھا یار! پریشانی چھوڑ' نا! تو پریشان ہوتا ہے تو ہماری ہنسی نکل جاتی ہے۔'' یہ کہتے ہی مَیں زور سے ہنسنے لگا۔

''پتر! قصور تیرا نہیں ہے۔'' فیصل بولا مگر اویس نے بات کاٹ لی۔

''قصور امریکہ کا ہے جو یہ سب کرا رہا ہے۔''

''چپ کرو اوئے' بے شرم! ہمارا دوست پریشان ہے اور تمہیں مذاق سوجھا ہے؟'' شاہد میاں بول اُٹھے۔

''تیا کیا بلیک واٹر کو ہائر کریں؟'' مَیں نے جواب دیا۔

''چھوڑ یار' توصی! تو خود ہی یہ کام کر سکتا ہے۔'' اویس نے میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''اچھا' مجھے پتہ نہیں ہے مَیں کیا چیز ہوں؟'' مَیں نے طنزاً کہا۔

''تو اور کیا۔۔۔'' شاہد بھی بولا۔

''یار توصی! تو میرا یہ کام کر دے تو اگلے ویک اینڈ پر کھانا میری طرف سے۔'' فیصل نے آفر دی۔

کھانا میری کمزوری تھا اور ساتھ مَیں شاہد اور اویس نے بھی مجھے اُکسایا اور مَیں خود کو ابنِ صفی کا علی عمران سمجھتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''اوئے' تو فکر نہ کر فیصل! اَب دیکھ مَیں کیا کرتا ہوں۔''

''شاباش' یہی جذبہ چاہئے۔'' اویس بولا۔

''اتوار کے دِن تیری دُکان تیرے قبضے میں ہوگی۔ یہ مَیں نے کہا ہے۔''

اِس کے بعد محفل برخواست ہوگئی۔

بات تو مَیں نے کر دی لیکن گھر جا کر پریشان ہوگیا۔ یہ سب اِتنا آسان نہیں تھا۔ وہ لوگ اثر و رسوخ والے بندے تھے جن کا مَیں بال بھی بیکا نہیں کر سکتا تھا۔ پھر مجھے اویس اور شاہد پر غصہ آیا جن کی باتوں کی وجہ سے مَیں یہ فیصلہ کر گیا۔ اِسی کشمکش میں سو گیا۔

اگلے دِن مَیں پلازے میں پہنچ گیا۔ میرے سامنے فیصل کی دُکان تھی ''طیفا کریانہ سٹور'' نام سے ہی بدمعاشی جھلک رہی تھی۔ دُکان کے اندر تین ہٹے کٹے جوان بیٹھے تھے۔ اِن کو دیکھتے ہی میری سانس حلق میں اٹک گئی۔ کہاں وہ تین اور کہاں مَیں ننھی سی جان مگر دوسرے ہی لمحے رات والی باتیں ذہن میں گونجی اور میرا سینہ تن گیا اور مَیں دُکان کے اندر پہنچ گیا۔

''ہاں جی' کیا چاہئے؟'' دُکاندار نے کڑک لہجے میں پوچھا۔

''یہ دُکان مجھے دے دے طیفے!'' مَیں یہ کہنا چاہتا تھا مگر نہیں کہہ سکا بس اِتنا کہا۔ ''جی' پتی چاہئے۔''

''کون سی پتی کڑک یا نرم؟''

''نہیں' نہیں کوئی پتی نہیں چاہئے مجھے---'' اچانک میرا لہجہ بدل گیا۔ ''تم لوگ میرے دوست کی دُکان خالی کر دو ورنہ---''

''اوئے جابر' اوئے طیفے! اِدھر آؤ اوئے' ایک چوہا پھر آیا ہے دُکان خالی کرانے۔'' دُکاندار دھاڑا اور باقی دونوں جوان بھی آ دھمکے۔ انہیں دیکھ کر مَیں تیزی سے پلٹا مگر اچانک میرا پاؤں کسی چیز سے ٹکرایا اور مَیں دھم سے زمین پر جا گرا۔ اِتنے میں وہ تینوں بھی آ دھمکے اور مل کر مجھے اِتنا مارا کہ میرا منہ بند تھا مگر چیخوں کی آواز مجھے آ رہی تھی۔ اچانک میرے سر میں ایک ڈنڈا آ کر لگا اور مَیں چیخا۔

''ہائے اماں جی---!''

''جی' میرے پتر! کی گل ہے؟''

اماں کی آواز سنائی دی اور مَیں اُچھل کر کھڑا ہوگیا اماں کہیں پتی لینے تو نہیں پہنچ گئی مگر نہیں مَیں تو اپنے گھر میں تھا اور وہ ایک خواب تھا۔

''شکر ہے خواب تھا۔'' مَیں نے دِل میں کہا۔

''اُٹھ پتر! جلدی اُٹھ' تو نے دفتر بھی جانا ہے۔ مَیں نے چائے بھی بنانی ہے' جلدی سے مجھے پتی لا دے چائے کی۔''

اماں نے اِتنا ہی کہا تھا اور مَیں پھر دھم سے بستر پر گر پڑا۔

اِس دِن مَیں نے دفتر میں بس یہی سوچ سوچ کر دِن گزارا کہ یہ سب کیسے ہوگا لیکن کچھ نہ سمجھ میں آیا۔ آخر شام کو اویس سے رابطہ کرنے کا سوچا اور اویس کو فون ملا دیا۔

''ہیلو' اویس! یار کہاں ہو؟''

''دُکان پہ ہوں' کیوں خیر تو ہے؟''

''یار! وہ دکان کیسے خالی کرائیں فیصل والی؟''

''مَیں نے کرانی ہے؟---خود کرواؤ۔''

''یار! نہیں کر سکتا--- کچھ کر یار' میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کیا کروں۔''

''اُدھر اویس کی ہنسنے کی آواز آئی' اِدھر میرا دِل جل گیا۔

''اچھا' بول مَیں کیا کروں؟'' اویس نے پوچھا۔

''یار! وہ تیرا دوست ہے نا' بالے خان---!''

''وہ معاش' ٹھرکی؟'' اویس شدت سے چیخا۔

''ہاں' ہاں وہی یار! پلیز اُس کی مدد لیتے ہیں' نا!''

''اوئے' نہیں ایک تو وہ مغرور ہے' دوسرا وہ کوئی بدمعاش وغیرہ نہیں ہے' ایویں بس بدمعاش نظر آنا چاہتا ہے۔''

''یار! لگتا تو بدمعاشوں کی طرح ہے۔ پلیز' مان جا؟''

کافی محنت اور منت کرنے کے بعد اویس مان گیا اور بولا۔

''چل ٹھیک ہے' آ جاؤ دُکان پہ' شاہد کو بھی بلاؤ چلتے ہیں اُس کے گھر۔''

''یا---ہو---'' مَیں زور سے چلایا۔ ''مَیں ابھی آیا۔''

ٹھیک ایک گھنٹے بعد ہم بالے خان کے گھر بیٹھے تھے۔ ہٹا کٹا بالے خان میرے سامنے تھا۔ عمر 30 یا 32 سال تھی۔ لمبے لمبے بال' بڑی بڑی مونچھیں اور کاندھے پر ریشمی رومال' ہاتھ میں سگریٹ۔ پہلی ہی نظر میں وہ مجھے بہت بڑا بدمعاش لگا۔

''بول جگر' کیا کام ہے؟'' بالے خان اویس سے مخاطب ہوا۔

''بالے خان! میرے دوست کی دُکان پر اُس کے کرائے داروں نے قبضہ کر لیا ہے' بس آپ کی مدد چاہئے۔ وہ دکان خالی کرا دیں' پلیز!'' اویس نے تفصیلاً بات کی۔

''بس---؟'' بالے خان دھاڑ مار کر اُٹھ کھڑا ہوا اور میرا سانس رُک گیا۔

''بندہ کھسک گیا ہے' چل نکل لو یہاں سے۔'' شاہد صاحب نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

''اوئے' مَیں سمجھا بالے خان سے تم نے بندہ اُٹھوانا ہے' کوئی 302 کرانا ہے۔ اَب بالے خان لوگوں سے دُکانیں خالی کراتا پھرے گا؟'' بالے خان اکڑ گیا۔

''کوئی بات نہیں جان! میرے لیے تو کوئی مشکل نہیں' اگر جان بھی دینی پڑے تو حاضر ہوں۔''

نادیہ بولی۔ ''تم کتنے اچھے ہو رحمت! ویسے جس آدمی نے تمہیں چھڑایا' وہ کون تھا؟''

''وہ کمینہ ہوٹل کا مالک تھا۔ اُلو کا پٹھا! ہمیشہ میرا پیچھا کرتا رہتا ہے۔ بہت ذلیل اور گھٹیا آدمی ہے۔''

حسن نے وائس چینجر اُتارا اور بولا۔

''رحمت! آج ہوٹل پر آنے سے پہلے اپنا سامان پیک کر کے آنا۔''

رحمت کے ذہن میں ایک ہی بات آ رہی تھی---

نہ صنم ہی ملا نہ وصالِ صنم
نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

☆☆

رشتہ ہم نے ڈھونڈا

ناہید صدیقی

یوں تو لوگ شادی سے گھبراتے ہیں لیکن پھر بھی شادی کرنے سے اِنکار نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں نا' کہ یہ وہ ہے لڈو جو کھائے وہ بھی پچھتائے' جو نہ کھائے وہ بھی پچھتائے۔ اَب ہمارے بھائی ہی کو لیجیے۔ جوتے کھانے کو تیار ہونے کے لیے پریکٹس کے طور پر اَبا جانی سے جوتے کھائے جا رہے ہیں' برتن دھوئے جا رہے ہیں اور اماں پریشان کھڑی دیکھ رہی ہیں کہ میرا نازک پارلر جانے والا بیٹا' لمبے بال' خوبصورت ناخن' میک اَپ سے اٹا ہوا' کان میں بالی' بازو میں کنگن پہننے والا بیٹا برتن کیسے مانجھ رہا ہے۔ ہم نے سوچا بھائی زن مرید بننے کے لیے بے چین ہوا جا رہا ہے تو کیوں نہ ہم کوئی رشتہ ہی ڈھونڈ دیں کہ بعد میں چاند کے چکوروں کے لیے بھی ڈھونڈنا پڑ جائے تو مشکل نہ ہو۔

ہم نے صبح صبح تیاری کی' بیٹھ کر کچھ کاروبار بنائے جو بتانے تھے کہ لڑکا یہ کاروبار کرتا ہے۔ ایک پٹھانیوں والا برقع لیا اور نکل پڑے اپنی مہم پر دوسرے محلے۔

سب سے پہلے جس گھر گئے وہاں اُنہوں نے ہماری خوب آؤ بھگت کی۔ میز پر مختلف قسم کی چیزیں دیکھ کر ہم لڑکی بھول' کھانے کے چکر میں پڑ گئے۔ وہ سمجھے شاید ہم کئی دِن کے بھوکے ہیں۔ اُنہوں نے ہمیں حوصلہ دیا کہ یہ آپ ہی کے لیے ہے پر پہلے لڑکے کے بارے میں کچھ بتائیے گا۔ ہم فوراً بولے۔

''اِس کا ذاتی کاروبار ہے۔''

وہ بولے۔ ''کس چیز کا؟''

''جی' لکڑی کا کاروبار ہے۔''

''کیا لڑکا فرنیچر بناتا ہے؟''

''جی نہیں' وہ تو مسجد کے باہر مسواک بیچتا ہے۔''

اُنہوں نے جھپٹ کر میز سے سب چیزیں فوراً غائب کر دیں اور ہمیں باہر کا راستہ دِکھایا۔ ارے' کیا زمانہ آ گیا ہے۔ ایک پیپسی ہی پینے دیتے تو کیا جاتا اُن کا--- ہم نے سوچ لیا کہ اگلے گھر جاتے ہی پہلے کھائیں گے' پھر لڑکے کے کاروبار کا بتائیں گے۔

پھر جب ہم دوسرے گھر پہنچے تو پہلے پیپسی پی' پھر بتایا کہ لڑکا ہمارا ٹیبل مین ہے۔

''جی' اُسے اِس عہدے پر کام کیا کرنا پڑتا ہے؟''

ہم نے فوراً جواب دیا۔ ''اجی' ہوٹل میں میز صاف کرتا ہے۔''

اُنہوں نے ہمیں جو سنائیں' خدا کی پناہ۔ ہم نے جوتے ہاتھ میں پکڑے اور باہر کی راہ بھاگتے ہوئے عبور کی۔ وہ تو شکر تھا کہ گھر سے سلیپر پہن آئے تھے ورنہ بھاگنا کتنا مشکل ہوتا--- خیر' اللہ کا نام لے کر آگے گھر چل دیئے اور ہم نے لڑکی دیکھی' اچھی خاصی موٹی اور چھوٹی تھی (قد میں' عمر میں نہیں) پھر ہم نے لڑکے کے بارے میں بتایا کہ لڑکا ہمارا کولیکٹ مین ہے۔ وہ لوگ خوش ہوئے کہ لڑکا اچھا کام کرتا ہے اور ہمیں مکھن ڈال کر لسی پلائی۔ ہم نے سوچا کہ بات بن رہی ہے۔ لڑکی کے ابا بولے۔

''بھلا اِس کام کو آسان لفظوں میں کیا کہیں گے؟''

ہم نے کہا۔ ''جی' ایک منٹ ہم بتاتے ہیں---'' ہم نے کھڑے ہو کر جوتا پہنا اور بولے۔ ''جی' مسجدوں کے لیے بسوں میں چندہ جمع کرتا ہے۔''

پھر اُن کا جوب سنے بغیر باہر کی طرف دوڑ لگا دی کیونکہ اِس گھر میں کتا بھی بندھا تھا جس سے ہماری جان پہچان نہ تھی۔

اَب سوچا کہ لڑکے کا کاروبار اعلیٰ قسم کا ہونا چاہئے۔ اگر بھائی خود کچھ کرتا ہوتا تو ہمیں اِتنے کام کیوں ڈھونڈنے پڑتے۔ خیر' پھر ایک اور گھر میں گئے اور وہاں لڑکے کے بارے میں بتایا کہ ہمارا لڑکا KFC کا مالک ہے۔ وہ خوش ہو کر بولے۔

''واہ' ہوٹل کا مالک ہے--- رشتہ تو تم بہت اچھا لائی ہو۔ ہماری لڑکی کو گھر میں کھانا نہیں بنانا پڑے گا' روزانہ ہوٹل سے لڑکا لے آیا کرے گا' آخر اِتنے بڑے ہوٹل کا مالک ہے۔''

ابتدا سے انتہا تک قہقہے

"گھبراؤ نہیں، یہ میرے میاں ہیں۔ آج کل واپڈا میں "شکایات" کے کاؤنٹر پر ڈیوٹی ہے۔"

جلد 64 ☆ شمارہ: 11 ☆ اپریل 2012ء ☆ رجسٹرڈ نمبر CPL 192 ☆ موبائل نمبر: 0312/0333-4284875